
CONFIDENTIAL
MEDICAL
MAFIA



DNA
ڈی این اے

نور راجپوت





باب سوم

CHAPTER #III

طَفْرَه

(Mutation)

وجود کی کتاب میں لکھی ہر سطر اور ہر حرف اپنی طے شدہ ترتیب کا پابند ہوتا ہے۔ڈی این اے کی ان باریک دھاریوں پر صدیوں سے ایک ہی تقدیر لکھی جا رہی ہوتی ہے...جب تک کہ اس لوح پر پہلا 'حرفِ غلط' نہ ثبت ہو جائے۔کبھی کبھی انسان کے اندر تبدیلی اتنی خاموشی سے جنم لیتی ہے کہ اسے خود بھی اس کا احساس نہیں ہوتا۔وہ ویسا ہی رہتا ہے۔وہی چہرہ، وہی آواز اور وہی عادتیں رہتی ہیں مگر اس کے اندر کہیں ایک ایسی چیز اپنی جگہ بدل چکی ہوتی ہے جس کا واپس اپنی اصل حالت میں آنا ممکن نہیں ہوتا۔

جینیات میں اسے طَفْرَہ کہتے ہیں۔یعنی میوٹیشن یعنی غلطی!

کوڈ میں آنے والی ایک معمولی سی تبدیلی۔اتنی معمولی کہ شاید آنکھ اسے دیکھ بھی نہ سکے،مگر اس کے اثرات پورے وجود کو بدل دیتے ہیں۔انسان بھی ایسا ہی ہے۔اس کے اندر بھی کچھ کوڈ لکھے ہوتے ہیں۔خون میں، یادوں میں،خوف میں،خواہشوں میں...اور کبھی کوئی ایک چیز اپنی مقررہ جگہ سے ہٹ جائے تو انسان وہ نہیں رہتا جو کل تھا۔
خطرناک بات یہ نہیں کہ تبدیلی آتی ہے۔خطرناک بات یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ معلوم نہیں ہوتا کہ تبدیلی کب آئی تھی۔شاید کسی ایسے راز کے جاگنے سے جو مرنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔طفرہ کبھی اعلان نہیں کرتا کہ وہ آ چکا ہے۔وہ بس اپنا اثر دکھاتا ہے۔اور جب اثر دکھائی دینے لگے..تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔کہتے ہیں جب تک ندی اپنے پرانے راستے پر بہتی رہے،سب کچھ پرسکون رہتا ہے۔مگر کبھی...کسی ایک ناگہانی پل میں ایک غیر محسوس موڑ ندی کا رخ ہی بدل دیتا ہے۔یہ وقت کا وہ موڑ ہے جہاں سے پرانے راستے دھندلا جاتے ہیں اور تقدیر ایک بالکل نئی سمت میں قدم رکھ دیتی ہے۔کیونکہ جب کسی قاعدے میں ایک بار 'طفرہ' واقع ہو جائے...تو پھر نہ پرانے نقشے کام آتے ہیں اور نہ ہی مسافر اپنی پہلی والی منزل پر لوٹ سکتا ہے۔

"نجف اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتی ہے؟"
نشاط کے ہونٹوں سے نکلنے والا جملہ چند لمحوں تک بزدار پیلس کے کشادہ لان میں معلق رہا۔شام کی ہلکی دھوپ لان میں پھیلی

ہوئی تھی۔ درختوں کے پتوں سے چھن کر آتی سنہری روشنی گھاس پر بکھرے پانی کے قطروں کو چمکا رہی تھی مگر اس خوبصورت منظر میں بیٹھی دونوں عورتوں کے درمیان عجیب سی گھٹن تھی۔ نشاط کے ہاتھ میں فون تھا۔

اسکرین پر ایک تصویر کھلی ہوئی تھی۔ نجف اور سقراط دونوں ایک ساتھ کھڑے تھے، درمیان میں زہرہ بیگم تھیں، اور تصویر میں زہرہ بیگم کے چہرے پر وہ مسکراہٹ تھی جو اب ہمیشہ کے لیے ایک تصویر کا حصہ بن چکی تھی۔ نشاط جانے کتنی دیر سے اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی انگلیاں فون کے کناروں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھیں۔ نیلوفر بیگم اس کے سامنے بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر تھکن تھی۔ پچھلے کچھ دنوں میں جیسے ان کے گرد کی دنیا بدل گئی تھی۔ نجف کا فیصلہ اور لوگوں کی باتیں سب کچھ ایک دوسرے میں الجھ کر ان کے لیے ایک ایسا بوجھ بن چکا تھا جسے وہ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھیں۔ نشاط نے آخر کار فون میز پر رکھ دیا۔

"میں اب تک یہ بات سمجھ نہیں پا رہی مام!"

نیلوفر بیگم نے خاموشی سے اسے دیکھا۔ "کون سی بات؟"

"یہ نکاح۔" نشاط نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ "نجف ایسا نہیں کر سکتی۔"

نیلوفر بیگم کے چہرے پر فوراً کرب ابھر آیا۔ نجف نے ان کا مان توڑ دیا تھا۔ ماؤں کو اپنی بیٹیوں سے بہت امیدیں ہوتی ہیں اور جب بیٹی انہیں توڑتی ہے تو ماں کا مان بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

"کیوں نہیں کر سکتی؟" انہوں نے تلخی سے پوچھا۔

"کیونکہ وہ نجف ہے، مام! وہ جذبات میں بہہ کر اپنی پوری زندگی کا فیصلہ کرنے والی لڑکی نہیں ہے۔"

"اس نے زہرہ کی آخری خواہش پوری کر دی۔" نیلوفر بیگم نے افسردہ سانس لی۔ آنکھوں کے کناروں پہ ہلکی سی جھریاں واضح ہونے لگی تھیں۔

"آپ کو واقعی ایسا لگتا ہے؟" نشاط یہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اس کی جس بہن کا دل سقراط شبگیر کی طرف سے اچاٹ ہو چکا تھا، وہ اسے اپنی زندگی میں جگہ کیسے دے سکتی تھی؟

"تم کہنا کیا چاہتی ہو نشاط؟"

نشاط کچھ لمحے خاموش سے نیلوفر بیگم کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے فون اٹھایا اور تصویر کو دوبارہ دیکھا۔ "آپ کو نہیں لگتا کچھ گڑبڑ ہے؟"

نیلوفر بیگم کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "وہ زہرہ سے بہت محبت کرتی تھی۔"

"محبت کرتی تھی، لیکن..." نشاط پل بھر کو رک گئی۔ "لیکن نجف گھاٹے کا سودا نہیں کرے گی۔"

نیلوفر بیگم کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت در آئی۔ "نشاط!"

"میں غلط نہیں کہہ رہی..." اس بار اس کی آواز دھیمی تھی، رازدانہ سی۔ "آپ بھی اسے جانتی ہیں۔ وہ کسی کی خاطر خود کو قربان کرنے والی لڑکی نہیں ہے۔ کم از کم اس قیمت پر تو نہیں۔"

"تو پھر تمہارے خیال میں یہ سب کیا ہے؟"

نشاط نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اس نے لان کے دوسرے سرے پر لگے فوارے کو دیکھا جہاں پانی مسلسل ایک ہی ترتیب سے اوپر اٹھ رہا تھا اور پھر نیچے گر رہا تھا۔

"کچھ تو ہے۔"

"کیا؟" نیلوفر بیگم چونکی ہوئیں۔

"پتا نہیں۔" نشاط نے نظریں دوبارہ فون کی طرف کر دیں۔ "لیکن کچھ ہے۔" اسکا شکی مزاج یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ نجف صرف زہرہ بیگم کے کہنے پر یہ شادی کر سکتی تھی۔ البتہ نیلوفر بیگم کے چہرے پر تلخی پھیل گئی۔

"مُجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ اس لڑکی نے مُجھے بہت بڑا دکھ دیا ہے۔" ان کی آواز میں شکوہ تھا۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری اپنی بیٹی مُجھے لوگوں کے سامنے اس طرح کھڑا کر دے گی۔"

نشاط خاموش سے انہیں سنتی رہی۔ وہ جانتی تھی نیلوفر بیگم اندر سے کافی پریشان تھیں۔

"تمہیں معلوم ہے میرے سرکل میں کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ لوگ ہنس رہے ہیں۔ نجف بزدار نے شبگیر خاندان میں جا کر اپنے خاندان کی ناک کٹوا دی۔" وہ تلخی سے ہنسیں۔

"لوگوں کو دوسروں کے دکھ بھی تماشے لگتے ہیں۔"

"لوگ تو کچھ بھی کہیں گے۔" نشاط نے آہستہ سے کہا۔ اس سب کا سامنا تو وہ بھی کر رہی تھی تبھی نجف سے نفرت ہوتی تھی۔

"لیکن تم جانتی ہو یہ جملے سننا کتنا مشکل ہے؟ سالوں لگا کر میں نے اس خاندان میں اپنی ایک حیثیت بنائی ہے۔ اور اب میری اپنی بیٹی نے..." وہ رک گئیں۔ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ نشاط نے ترحم بھری نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

"مام، آپ کو نجف سے بات کرنی چاہیے۔"

"وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی بھی ہے؟" تلخی ان کی آواز میں واپس آ گئی۔ "وہ تو مُجھے نظر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کرتی۔"

" کیونکہ آپ بھی اس سے بات نہیں کرتیں۔" نشاط نے برجستگی سے کہا۔ نیلوفر بیگم اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"تم اپنی بہن کا دفاع کر رہی ہو؟"

"میں کسی کا دفاع نہیں کر رہی اور آپ کو لگتا ہے جو نجف نے میرے ساتھ کیا ہے، میں اس کا دفاع کروں گی؟" نشاط نے ضبط شدہ لہجے میں کہا۔ اسکے چہرے پر سرخی تھی۔ ملال تھا۔ لیکن اس سے زیادہ، اسکے اندر تجسس تھا۔

"میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ کچھ اور بھی ہے جو نجف ہم سے چھپا رہی ہے۔" نشاط نے دوبارہ تصویر کو دیکھا۔ "زہرہ آپا نے اپنی زندگی کے آخری وقت میں یہ نکاح کروایا ہے۔" نشاط نے فون کی اسکرین پر موجود تصویر کو زوم کیا۔

"اور اب وہ نہیں رہیں۔" اس کی انگلی تصویر پر رک گئی۔ "ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ انہوں نے نجف سے کیا کہا تھا۔ مُجھے لگتا ہے ہمیں جلد بازی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچنا چاہیے۔"

"اور اگر میں کہوں کہ مُجھے اس نکاح سے خوشی نہیں ہے؟" نیلوفر بیگم کے سوال پر نشاط کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، مگر وہ مسکراہٹ خوشی کی نہیں تھی۔

"تو یہ بات آپ نجف سے کہہ سکتی ہیں مام! لیکن دنیا سے نہیں۔"

نیلوفر بیگم جواب دے پاتیں اس سے پہلے دور پورچ میں گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔

دونوں کی نظریں بے اختیار اس طرف اٹھ گئیں۔ سیاہ گاڑی پورچ میں آ کر رکی۔ چند لمحوں بعد ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا۔ نجف باہر نکلی۔ بال بندھے ہوئے تھے اور چہرے پر عجیب سی تھکن جمی تھی۔ وہ بظاہر پرسکون تھی، مگر اس کی آنکھوں کے نیچے کے حلقے، چہرے کی بے رونقی اور قدموں کی تھکن بتا رہی تھی کہ پچھلی چند راتوں نے اسے اندر سے کس قدر نچوڑ دیا تھا۔ اس نے دور لان میں بیٹھی نشاط اور نیلوفر بیگم کو دیکھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے۔ پھر نظریں ہٹا لیں۔ وہ اندر کی جانب بڑھی۔

"السلام علیکم!" قریب سے گزرتے ہوئے اس نے سلام کیا اور اگلے چند لمحوں میں وہ گھر کے اندر غائب ہو گئی۔ نشاط نے اسے جاتے دیکھا۔ اس کی نظریں نجف کے چہرے پر تھیں۔ پھر اس نے آہستہ سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"دیکھا آپ نے؟"

نیلوفر بیگم خاموش رہیں۔ نشاط کی نگاہیں اب اس دروازے پر جمی تھیں جہاں سے نجف اندر گئی تھی۔

"وہ کچھ چھپا رہی ہے۔"

لان میں پھر خاموشی اتر آئی۔مگر اس بار خاموشی کے نیچے ایک سوال زندہ ہو چکا تھا۔

نجف نے آخر ایسا کیا دیکھا تھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی کا رخ بدل دیا؟

☆.....☆.....☆

ٹرف گراؤنڈ کے چاروں طرف اسپورٹس گالا کے رنگ برنگے بینرز لگائے جا رہے تھے۔ایک طرف افتتاحی تقریب کے لیے اسٹیج کی تیاری ہو رہی تھی، دوسری طرف رضا کار ٹیموں کے نام اور مقابلوں کا شیڈول اسٹینڈز کے سامنے نصب کر رہے تھے۔ ہاکی گراؤنڈ پر کھلاڑیوں کی پریکٹس جاری تھی۔سالانہ ہاکی ٹورنامنٹ کی تیاریوں نے پورے کالج کو جیسے ایک الگ ہی رفتار دے دی تھی۔نامرہ اسی ہنگامے کے درمیان اپنی ٹیم کے ساتھ گراؤنڈ سے متصل راہداری میں کھڑی تھی۔ایک ہاتھ میں کھلاڑیوں کی فہرست، دوسرے میں پریکٹس شیڈول اور کٹس کی تفصیلات تھیں۔

"یہ والی کٹ گول کیپر کے لیے الگ رکھنا، اور باقی لڑکیوں کو کہنا کہ کل صبح آٹھ بجے سے پہلے رپورٹ کریں۔"

وہ فائل میں کچھ نشان لگا کر آگے بڑھی ہی تھی کہ سامنے سے لڑکوں کا ایک گروپ آتا دکھائی دیا۔نامرہ ایک طرف ہونے لگی مگر عین اسی وقت ان میں سے ایک لڑکا تیزی سے مڑا اور اس کے کندھے سے جا ٹکرایا۔فائل اس کے ہاتھ سے چھوٹی۔کاغذات راہداری کے فرش پر پھیل گئے۔ایک لمحے کے لیے نامرہ نے صرف زمین پر بکھرے صفحات کو دیکھا۔پھر آہستہ سے سر اٹھایا۔

"معذرت۔"لڑکے نے کہا ضرور، مگر لہجے میں معذرت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

"دیکھ کر نہیں چل سکتی تھیں؟"دوسرا لڑکا نخوت سے بولا۔نامرہ کی بھنویں تن گئیں۔

"تم ٹکرائے ہو۔"

"اچھا؟"وہ لڑکا ہنسا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔"ہم نے تو سوچا تھا اسپورٹس کالج ہے، یہاں سب کو کھیلنا آتا ہوگا۔"

اس کے ساتھیوں میں دبی دبی ہنسی پھیل گئی۔

"کھیلنا سب کو آتا ہے۔تمہیں شاید انسانوں کے درمیان چلنا نہیں آتا۔"وہ انہی کے لہجے میں بولی تو لڑکے کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی۔

"زبان بہت چلتی ہے تمہاری۔"وہ دبا دبا سا غراتے ہوئے آگے بڑھا۔

"تم نے ابھی میری فائل گرائی ہے۔زبان کا حساب بعد میں کرنا۔پہلے یہ کاغذ اٹھاؤ۔"

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا، جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ کوئی لڑکی اس سے اس لہجے میں بات کر سکتی ہے۔"خود اٹھا لو۔"

نامرہ نے ایک قدم آگے بڑھایا۔اسکے سر پہ کیپ تھی۔اس نے کیپ کو ذرا سا اوپر اٹھایا اور پھر دونوں بازو سینے پہ باندھ لیے۔

"میں اٹھا لوں گی۔لیکن تمہیں یہ غلط فہمی نہیں رہنے دوں گی کہ بدتمیزی کر کے تم یہاں سے گزر جاؤ گے۔"

" کیا کرو گی؟" وہ لڑکا قریب آیا۔"لڑو گی؟"

"اگر ضرورت پڑی تو۔" نامرہ کی آنکھوں میں مرنے اور مارنے والی سرد سی چمک ابھری۔

"نامرہ!" اس سے پہلے کوئی کچھ کہتا، عقب سے کسی نے اسکا نام پکارا مگر نامرہ کی نظریں اس لڑکے سے نہیں ہٹیں۔ثالث چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔پریکٹس کی جرسی میں، ایک ہاتھ میں ہاکی اسٹک، ماتھے پر پسینے کی ہلکی تہہ۔وہ شاید کافی دیر سے میدان میں تھا۔ثالث نے پہلے زمین پر بکھرے کاغذات دیکھے۔پھر نامرہ کو۔پھر اس لڑکے کو۔وہ آگے بڑھا۔

" کیا ہوا ہے؟"

" کچھ نہیں، بس غلطی سے..." ایک تیسرے لڑکے نے فوراً بات سنبھالنے کی کوشش کی۔"غلطی سے فائل گری ہے۔"

"اور تم نے معذرت بھی نہیں کی؟" ثالث نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے پوچھا۔

"ہم نے کی تھی۔" گروپ کا وہ لڑکا، کم از کم ثالث سے بھڑنا نہیں چاہتا تھا۔ثالث نے اسے چند لمحے دیکھا۔

"نہیں کی۔" نامرہ کا لہجہ بلند نہیں تھا مگر اتنا حتمی تھا کہ لڑکا خاموش ہو گیا۔ثالث نے ہاکی اسٹک اپنے کندھے پر رکھی اور ایک قدم آگے بڑھا۔

"یہ اسپورٹس کالج ہے۔تم سب جانتے ہو، اگر یہاں لڑائی ہوئی تو ہڈیاں ٹوٹیں گی۔"

لڑکے نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر ثالث نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔گروپ میں مکمل خاموشی چھا گئی۔پھر ثالث نے نیچے پڑی فائل اور کاغذات اٹھائے اور نامرہ کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ تمہاری ہے۔"

نامرہ نے فائل لی۔"مجھے خود اٹھانی آتی ہے لیکن گرائی انہوں نے ہے تو اٹھا کر بھی ان کو دینی چاہیے تھی۔"

ثالث کے ہونٹوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔"معلوم ہے۔" وہ ایک لمحے کو رکا۔نامرہ نے رخ پھیر لیا تو لڑکوں کا وہ گروپ وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

"ہر لڑائی اکیلے لڑنا ضروری نہیں ہوتا۔" ثالث نے فائل کی طرف اشارہ کیا۔

"مُجھے لڑائی جھگڑے کا شوق نہیں ہے۔" وہ سنجیدہ تھی۔

"جانتا ہوں۔" ثالث نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن جب کوئی سامنے آجائے تو پیچھے بھی نہیں ہٹتیں۔" نامرہ خاموش رہی تو وہ ہاکی اسٹک گھماتا ہوا واپس گراؤنڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر دو قدم بعد رکا اور پلٹ کر بولا۔

"ویسے تمہاری ٹیم کا شیڈول غلط ہے۔"

نامرہ نے چونک کر فائل کھولی۔ "کیا مطلب؟"

"کل صبح والی پریکٹس آٹھ بجے نہیں، ساڑھے سات بجے ہے۔"

نامرہ نے فوراً صفحات پلٹنے شروع کیے۔ ثالث مسکرا دیا۔

"چیف کوچ کو بتا دینا۔ ورنہ کل سب کی دوڑ لگے گی۔"

اسکے یوں مسکرانے پر نامرہ مزید چڑ گئی۔ "اپنی فکر کرو ثالث بزدار!"

"میں نے کہیں پڑھا تھا۔" وہ ہاکی اسٹک کندھے پر رکھے الٹے قدموں چل رہا تھا۔ نامرہ نے بھنویں سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کچھ لوگوں کے منہ سے اپنا نام سننا اچھا لگتا ہے۔"

وہ اسی دلکشی سے مسکرایا اور پھر پلٹ کر بھاگتے ہوئے واپس گراؤنڈ کی طرف چلا گیا۔

نامرہ کچھ لمحے وہیں کھڑی رہی۔ پھر اس نے فائل بند کی، سینے سے لگائی اور بے اختیار اس سمت دیکھا جہاں ثالث کھلاڑیوں کے درمیان جا چکا تھا۔ میدان میں دوبارہ سیٹی گونجی۔ ہاکی کی گیند تیزی سے ٹرف پر دوڑی۔ اور نامرہ نے یہ تو سمجھ چکی تھی کہ بزدار خاندان کے ہر شخص کو ایک ہی نظر سے دیکھنا شاید اتنا آسان نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

شام کے آخری دو پیریڈز کے بعد کالج کی عمارت قدرے خاموش ہو چکی تھی۔ زیادہ تر طلبہ اپنی کلاسز سے نکل چکے تھے، مگر آخری سال کے طلبہ کے لیے لائبریری اور اسٹڈی روم اب بھی آباد تھے۔ عالیہ اپنی نشست پر بیٹھی نوٹس ترتیب دے رہی تھی جب سامنے رکھی کتاب پر کسی نے ہلکی سی دستک دی۔ اس نے سر اٹھایا۔ سامنے سلال کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی موٹے

سے نوٹس تھے جو عالیہ نے چند دن پہلے اسے دیے تھے۔

"بہت شکریہ..." اس نے فائل عالیہ کی طرف بڑھائی۔ عالیہ نے نوٹس کی طرف دیکھا۔ "تم نے پڑھ لیے؟"

"تقریباً۔" سلال سنجیدگی سے بولا۔ عالیہ نے انہیں تھام لیا، پھر بے اختیار صفحات پلٹنے لگی۔

"اتنی جلدی؟" وہ قدرے حیران ہوئی۔

"تمہارے نوٹس کافی منظّم تھے۔ مُجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔"

"یہ تعریف تھی؟" عالیہ نے ایک ابرو اٹھا کر پوچھا۔

سلال کے ہونٹوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ "ہاں تعریف تھی۔"

"تو پھر شکریہ۔" عالیہ نے نوٹس دوبارہ بند کر دیے۔ سلال چند لمحے خاموش رہا۔ وہ تذبذب کا شکار تھا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"ایک بات کہوں؟"

اسکے سوال کرنے پر عالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم نے اچھا کام کیا ہے۔" عالیہ نے اسے دیکھا۔ سلال نے فائل کی طرف اشارہ کیا۔

"خاص طور پر آخری حصے میں تم نے موضوعات کو جس ترتیب سے لکھا ہے، اس سے دوبارہ پڑھنے میں کافی آسانی ہوئی۔ بس دو جگہ مسئلہ تھا۔"

عالیہ فوراً متوجہ ہوئی۔ " کہاں؟" اس نے فائل فوراً کھول لی۔ سلال نے ایک صفحے پر انگلی رکھی۔ "یہاں۔"

"یہ غلط ہے؟" عالیہ کو قدرے حیرت ہوئی۔

" مکمل طور پر نہیں۔" سلال نے قلم نکالا اور متعلقہ سطر کے نیچے ہلکی سی لکیر کھینچی۔

"یہاں ترتیب ذرا مختلف ہونی چاہیے تھی۔ اگر امتحان میں یہی سوال آیا تو جواب غلط سمجھا جا سکتا ہے۔"

عالیہ نے غور سے صفحہ دیکھا۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔ "اور دوسری غلطی؟"

سلال نے اگلا صفحہ پلٹا۔ "یہاں ایک اصطلاح رہ گئی ہے۔"

"میں نے واقعی چھوڑ دی؟" عالیہ کو اس بار پریشانی ہوئی۔ اس نے بڑی باریک بینی سے نوٹس تیار کیے تھے۔

"اتنی محنت کے بعد بھی۔" عالیہ نے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ اسے حقیقتاً افسوس ہوا۔

"اسی لیے تو بتایا ہے۔" سلال نے قلم واپس بند کر دیا۔ "باقی نوٹس اچھے ہیں۔"

عالیہ نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم ہر چیز میں اتنے محتاط ہوتے ہیں؟"

" کیا مطلب؟" سلال نے سوال سمجھنے کی کوشش کی۔

"مطلب یہ کہ تعریف بھی کرنی ہو تو ساتھ غلطی بھی بتانا ضروری سمجھتے ہیں؟"

"اگر غلطی نظر آئے تو بتا دینی چاہیے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کام اچھا نہیں تھا۔"

عالیہ اثبات میں سر ہلاتے خاموش ہوگئی۔سلال نے نوٹس کی طرف دیکھا۔ "تم نے یہ سب خود بنائے تھے؟"

" تمہیں کوئی شک ہے؟" عالیہ کی تیوری چڑھی۔

" نہیں۔" اس بار سلال کے لہجے میں رسمی پن نہیں تھا۔ "جن دو جگہوں پر میں نے نشان لگایا ہے، انہیں درست کر لینا۔ میں نہیں چاہتا اس بار تم دو چار نمبروں سے رہ جاؤ۔"

عالیہ مسکرا دی۔ "میں کر لوں گی۔" سلال نے سر ہلایا اور جانے کے لیے مڑا۔

"سلال...." عالیہ نے بے ساختہ اسے پکارہ۔وہ رک گیا۔

"اگر مزید کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔"

"ضرور..." سلال نے چند لمحے اسے دیکھا۔پھر بہت سادہ انداز میں کہا اور چلا گیا۔عالیہ کی نگاہ اس کے جاتے ہوئے وجود پر ٹھہر گئی۔پھر اس نے اپنے نوٹس کھولے۔وہ دونوں غلطیاں اب بھی وہیں تھیں۔اس نے بے ساختہ اپنی پیشانی مسلی۔

☆.....☆.....☆

شام کے پانچ بجے قادری اسپورٹس کالج کا جم معمول سے کہیں زیادہ آباد تھا۔جم کے ایک طرف ٹریڈملز چل رہی تھیں، دوسری طرف چند کھلاڑی وزن اٹھا رہے تھے۔کچھ فرش پر بیٹھے اپنی ٹانگوں کے پٹھوں کو کھینچ رہے تھے۔پسینے سے بھیگے ٹی شرٹس، سانسوں کی تیزی اور مشینوں کی مسلسل آواز نے پورے ہال کو ایک عجیب سی توانائی دے رکھی تھی۔سقراط ہاتھ میں ٹیبلیٹ لیے جم کے درمیان کھڑا تھا۔وہ آج انہیں پریکٹس نہیں کروا رہا تھا۔آج وہ ان کے جسم سے زیادہ ان کے دماغ کی تربیت کر رہا تھا۔

"رفتار کم مت کرو۔" اس نے سامنے ٹریڈمل پر دوڑتے کھلاڑی کو دیکھ کر کہا۔

" آخری دو منٹ اسی رفتار پر۔ٹورنامنٹ میں تمہیں اس وقت تھکن محسوس ہوگی جب سامنے والا سمجھے گا کہ تم اب نہیں دوڑ

سکتے۔"

کھلاڑی نے صرف ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا اور رفتار برقرار رکھی۔ سقراط نے نظر گھمائی۔ "زاویار۔" اس نے زاویار کو پکارہ۔ وزن اٹھاتے ہوئے زاویار نے گردن موڑ کر دیکھا۔

"آج سے تم سب صرف اپنی ٹیم نہیں دیکھو گے۔ مخالف ٹیموں کو پڑھو گے۔"

زاویار نے وزن واپس اسٹینڈ پر رکھا۔ "مطلب؟"

سقراط نے سامنے لگی بڑی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ اسکرین روشن ہوئی۔ سب سے پہلے ایک ہاکی ٹیم کی اجتماعی تصویر سامنے آئی۔

"اس مہینے ہم کن ٹیموں کے خلاف کھیل رہے ہیں؟"

"تین۔" زاویار نے جواب دیا۔

"نام کیا ہیں؟"

"نیشنل اسپورٹس کالج، بزدار اسپورٹس کالج اور پنجاب اسپورٹس اکیڈمی۔"

"چلو اب دیکھتے ہیں تمہیں ان کے بارے میں کتنا معلوم ہے۔" سقراط نے اسکرین کی طرف دیکھا۔

"نیشنل اسپورٹس کالج کی سب سے بڑی طاقت کیا ہے؟"

"رفتار۔ خاص طور پر دائیں طرف سے حملہ۔ ان کا وِنگر بہت تیز ہے۔ اگر اسے جگہ مل جائے تو وہ دفاع کی پہلی لائن توڑ دیتا ہے۔" زاویار نے فوراً جواب دیا۔

"اور کمزوری؟" سقراط کی سنجیدگی برقرار رہی۔ زاویار نے چند لمحے سوچا۔

"جب ان کا حملہ ناکام ہو جائے تو واپس آنے میں وقت لیتے ہیں۔ ان کے دونوں وِنگر آگے بہت رہتے ہیں۔"

"اچھا۔" سقراط کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے اسکرین پر ایک کھلاڑی کی تصویر بڑی کر دی۔

"یہ کون ہے؟" سقراط نے باقیوں سے پوچھا۔

"قاسم..." ٹیم کے ایک کھلاڑی نے جواب دیا۔

"اور اس کی عادت کیا ہے؟"

"وہ گیند حاصل کرتے ہی سیدھا آگے نہیں جاتا۔ پہلے ایک بار اندر کی طرف کٹ کرتا ہے۔" اس بار پیچھے سے آواز آئی۔

"بالکل۔اور اگر تم نے اسے پہلی بار اندر آنے دیا تو دوسری بار وہ وہی حرکت نہیں کرے گا۔کھلاڑی کو یاد رکھنا کافی نہیں،اس کی عادت یاد رکھو۔"

اس نے تصویر بدل دی۔اب اسکرین پہ پنجاب اسپورٹس کالج تھا۔جم میں ورزش جاری تھی مگر اب تقریباً ہر کھلاڑی کی توجہ اسکرین پر تھی۔وہ ان سے اب مختلف ٹیموں کے مضبوط کھلاڑیوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اسکرین پر ایک ایک کر کے کھلاڑیوں کی تصاویر آنے لگیں۔پھر ایک تصویر پر تصویر رک گئی۔ثالث بزدار۔چند لمحوں کے لیے جم میں صرف مشینوں کی آواز سنائی دیتی رہی۔

"اس کے بارے میں کون بتائے گا؟"

" کیپٹن ہے،رفتار اچھی ہے۔"ایک کھلاڑی نے بتایا۔

"اور گیند اپنے پاس زیادہ دیر نہیں رکھتا۔"دوسرے نے فوراً اضافہ کیا۔

"اس کی اصل طاقت پاسنگ ہے۔" تیسرے نے کہا۔

سقراط نے سر ہلایا۔"اور اس کی کمزوری؟"

اس بار خاموشی رہی۔زاویار کے چہرے پر سوچ کے تاثرات ابھرے پھر اسکی آواز سنائی دی۔"وہ جلد بازی نہیں کرتا۔"

سقراط نے تعجب سے اسے دیکھا۔"یہ کمزوری نہیں ہے۔اس کی کمزوری تلاش کرو۔"

زاویار نے دوبارہ اسکرین کو دیکھا۔اسکے چہرے کے تاثرات مزید سنجیدہ ہو گئے۔

"جب وہ دباؤ میں ہوتا ہے تو کھیل زیادہ محفوظ کرتا ہے۔خطرہ مول نہیں لیتا۔"

سقراط کے چہرے پر اطمینان آیا۔"اب بات بنی۔"اس نے اسکرین پر ثالث کی تصویر کے ساتھ میدان کا خاکہ ظاہر کیا۔

"ثالث کو اگر تم کھیل بنانے کا موقع دو گے تو وہ تمہیں شکست نہیں دے گا بلکہ وہ تمہیں تھکا دے گا۔"

چند کھلاڑی مسکرائے۔سقراط نے بات جاری رکھی۔

"یہ فرق سمجھو۔ہر اچھا کھلاڑی گول نہیں کرتا۔کچھ کھلاڑی پورا کھیل اپنے حساب سے چلاتے ہیں۔ثالث انہی میں سے ہے۔"

"تو اسے کیسے روکیں؟" زاویار نے فوراً پوچھا۔

"اسے گیند لینے سے پہلے روکنا ہے۔" سقراط نے اسکرین پر ثالث کے اردگرد تین کھلاڑیوں کے فرضی مقامات بنائے۔

"جب یہ گیند حاصل کر چکا ہوگا تو بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ تمہیں اس سے پہلے اس کے راستے بند کرنے ہیں۔ اسے اکیلا مت چھوڑنا۔"

پھر اس نے زاویار کی طرف دیکھا۔ "لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اسے ذاتی مقابلہ مت سمجھنا۔"

"آپ کو لگتا ہے میں ایسا کروں گا؟" زاویار کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"مُجھے یقین ہے تم سب ایسا کر سکتے ہو۔" سقراط نے پوری ٹیم کو دیکھا۔ "خاص طور پر جب سامنے والا تمہیں جانتا ہو۔ تب دماغ سب سے پہلے کھیل چھوڑ کر انا پکڑ لیتا ہے۔" اسکرین پر ایک بار پھر تینوں مخالف ٹیموں کی تصاویر ایک ساتھ نمودار ہوئیں۔

"تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سامنے والا کون ہے۔ کیا کر سکتا ہے۔ کیا نہیں کر سکتا۔ اور سب سے اہم..." سقراط کی آواز قدرے بھاری ہوگئی۔ "کب تھک رہا ہے۔"

"اور اگر ہم نے یہ سب یاد کر لیا تو؟" زاویار کا سوال تھا۔ سقراط نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

"تو پھر میدان میں جا کر بھول جانا۔" سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ وہ مسکرایا۔

"کیونکہ میچ کے دوران تمہیں سوچنا نہیں چاہیے کہ میں نے کوچ سے کیا سنا تھا۔" اس نے اسکرین بند کر دی۔ "تمہارا جسم خود فیصلہ کرے گا۔ پانچ منٹ کی بریک!"

کئی کھلاڑی فوراً فرش پر بیٹھ گئے۔ سقراط نے زاویار کو روک لیا۔ "تم نہیں۔"

زاویار نے حیرت سے دیکھا۔ "کیوں؟"

"کیونکہ تم کیپٹن ہو۔" وہ لاپرواہی سے کہتے جم کے دروازے کی طرف بڑھا۔

"کوچ یہ ہراسمینٹ ہے۔" زاویار پیچھے سے کراہا۔

"چولہے میں جائے ہراسمینٹ..." سقراط نے اسی بے نیازی سے کہا اور جم کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ پوری ٹیم کھلکھلا کر ہنس دی جبکہ زاویار مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

صبح کے دس بجے ہسپتال کے انتظامی حصے کی آخری منزل پر واقعی کانفرنس روم میں ایک اہم میٹنگ شروع ہونے والی تھی۔ لمبی میز کے گرد ہسپتال کے چند اہم ترین لوگ بیٹھے تھے۔ چیف میڈیکل آفیسر، ڈاکٹر نجف۔ ایڈمنسٹریٹو ڈائریکٹر، ڈاکٹر شمس۔ ہیڈ آف سرجری۔ ہیڈ آف کارڈیالوجی۔ ہیڈ آف نرسنگ۔ ایچ آر، چیف فنانشل آفیسر اور Board of Directors کی نمائندگی کرتے ہوئے ڈاکٹر حق بزدار موجود تھے۔ نجف میز کے سرے پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے چند فائلیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ ایک فائل پر سرخ رنگ سے طبی معائنہ و کارکردگی کی خفیہ رپورٹ لکھا تھا۔ ڈاکٹر شمس نے سامنے رکھی دستاویز بند کی۔

"اگر سب اراکین موجود ہیں تو میٹنگ شروع کر لیتے ہیں۔"

"ایک منٹ۔" نجف نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہ دروازے کے قریب کھڑے معاون کی طرف متوجہ ہوئی۔ "ڈاکٹر کاشف کو آج میٹنگ میں بلانے کی ضرورت نہیں۔" کمرے میں چند نظریں ایک دوسرے سے ملیں۔ ہیڈ آف سرجری کے سربراہ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"لیکن آج کی پہلی بحث تو انہی کے متعلق ہے۔"

"اسی لیے کہا ہے آج انہیں بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔" نجف نے سامنے رکھی سرخ فائل کھول دی۔ "یہ معاملہ ان کی موجودگی میں زیرِ بحث نہیں آئے گا۔"

ڈاکٹر شمس نے خاموشی سے سر ہلایا۔ نجف نے فائل سے ایک رپورٹ نکالی۔

"گزشتہ ہفتے ڈاکٹر کاشف کی نگرانی میں ہونے والی سرجری کے بعد مریض کی حالت بگڑی اور اسے دوبارہ آئی سی یو میں شفٹ کرنا پڑا۔"

"مریض اب خطرے سے باہر ہے۔" ہیڈ آف سرجری نے فوراً صفائی دی۔ نجف نے سپاٹ تاثرات سے ان کی جانب دیکھا۔

"مُجھے معلوم ہے۔" اس نے رپورٹ کا اگلا صفحہ کھولا۔ "اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ سرجری کے دوران پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہر پیچیدگی غفلت کی وجہ سے نہیں ہوتی۔" اس نے انگلی سے رپورٹ کی ایک سطر پر نشان لگایا۔

"لیکن یہاں مسئلہ پیچیدگی نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مریض کی حالت بگڑنے کے بعد متعلقہ معالج کو اطلاع دینے میں تاخیر ہوئی۔"

ہیڈ آف نرسنگ کی سربراہ نے فوراً اپنی دستاویز کھولی۔ "رات دو بج کر چالیس منٹ پر مریض کے اعداد و شمار میں واضح تبدیلی

ریکارڈ ہوئی تھی۔"

"ڈاکٹر کاشف کو کب اطلاع دی گئی؟" نجف نے ہیڈ آف نرسنگ سے پوچھا۔

"دو بج کر پچپن منٹ پر۔"

"اور وہ کب پہنچے؟" نجف کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

"تین بج کر بیس منٹ پر۔" کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

نجف نے گہری سانس لیتے آہستہ سے سر اٹھایا۔ "پچیس منٹ لیٹ! سیریسلی؟"

"وہ اسی وقت ایک دوسری ایمرجنسی سرجری میں مصروف تھے۔" ہیڈ آف سرجری نے فوراً وضاحت دی۔ یہاں بات گھوم پھر کر ان کی کارکردگی پر بھی آنی تھی۔ انہوں نے بے ساختہ اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔

" کون سی سرجری تھی؟" نجف کے تاثرات نہ بدلے۔

"ایک اپینڈکس کا معاملہ تھا۔" ہیڈ آف سرجری کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوئیں۔ نجف نے چند لمحے انہیں دیکھا۔ کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز گونجتی رہی۔ وہاں موجود سبھی اراکین اپنی اپنی پوزیشن کو لے کر کچھ حد تک گھبرائے ہوئے تھے سوائے ایک شخص کے۔ وہ ہلکی نیلی شرٹ والا شخص ٹھوڑی کھجاتے کھڑکی سے باہر نیلے آسمان کو تک رہا تھا۔

"اور اس مریض کی حالت بگڑنے کی اطلاع مزید کس کو دی گئی تھی؟" نجف کا سوال برجستہ تھا۔

"ڈیوٹی پر موجود دوسرے ڈاکٹر کو۔"

"پھر اسے مریض تک پہنچنے میں کتنی دیر لگی؟"

" تقریباً دس منٹ۔" ہیڈ آف سرجری جیسے ہر چیز رٹ کر آیا تھا۔ نجف نے ہاتھ میں پکڑا اپین میز پر رکھ دیا۔

"تو پھر مسئلہ ایک شخص نہیں، نظام ہے۔" اس نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔

"ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ ایسی صورتِ حال دوبارہ پیدا ہونے کی صورت میں کون کس کا متبادل ہوگا۔"

"لیکن اگر ہم ہر ایسے معاملے کے بعد کسی ماہر سرجن کی، سرجری کی اجازت محدود کرنا شروع کر دیں تو ہمارے لیے عملی مشکلات پیدا ہوں گی۔" چیف فنانشل آفیسر نے محتاط لہجے میں بتایا۔

"نہیں ہر معاملے کے بعد کیوں روکیں گے؟" نجف نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"صرف اس وقت روکیں گے جب میڈیکل رپورٹس میں باقاعدہ کوئی تشویش درج ہو۔ اور اس معاملے میں تشویش درج

ہے۔"اس نے فائل بند کی۔"لہٰذا میری سفارش ہے کہ تحقیقات مکمل ہونے تک ڈاکٹر کاشف کو زیادہ خطرے والی سرجریز کی ذمہ داری نہ دی جائے۔"

"کتنے عرصے کے لیے؟"ہیڈ آف سرجری نے فوراً پوچھا۔

"سات دن۔"نجف نے دو الفاظ میں جواب دیا۔

"اور ایمرجنسی سرجریز؟"

"وہ صرف ہیڈ آف سرجری کی براہِ راست نگرانی میں کی جاسکتی ہیں۔"

"لیکن جو سرجریز پہلے سے مقرر ہیں؟"اس بار سوال ڈاکٹر شمس کی طرف سے تھا۔ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے وہ نجف کے ان فیصلوں سے کس قدر ناخوش تھے۔

"انہیں دوسرے سرجنز کے حوالے کیا جائے۔"

"یہ اچانک تبدیلی ہے ڈاکٹر نجف!اس سے باقی ڈاکٹروں پر بھی اضافی بوجھ پڑے گا۔"چیف فنانشل آفیسر نے پھر مداخلت کی۔

"اضافی بوجھ چند دن کے لیے برداشت کیا جاسکتا ہے۔کسی مریض کے لیے خطرہ نہیں۔"نجف نے بے تاثر انداز میں کہا۔

چند لمحوں کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔

اسی لمحے حق سیدھا ہوا۔

"مُجھے رپورٹ دیکھنے دیں۔"نجف نے فائل اس کی طرف سرکا دی۔اس نے چند صفحات پڑھے، پھر نظریں اٹھائیں۔اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں آیا۔

"کیا مریض نے کوئی شکایت درج کی ہے؟"

"نہیں..."ہیڈ آف سرجری نے فوراً کہا اور مدد طلب نظروں سے حق کو دیکھا۔ایک حق ہی تھا جو ان کے معاملات کو سدھار سکتا تھا۔

"پھر ہم کیا کر رہے ہیں؟"حق نے قدرے استہزائیہ انداز میں نجف کی طرف دیکھا۔

"مریض کی شکایت کا انتظار کر رہے ہیں۔"نجف نے جس طنزیہ انداز میں جواب دیا تھا۔وہاں بیٹھے کئی چہروں پہ دبی دبی سی

مسکراہٹ ابھری۔ وہ ذرا آگے جھکی۔

"یہ سرکاری ہسپتال نہیں ہے ڈاکٹر حق! جہاں ہم مریض کی شکایت درج ہونے کے بعد ایکشن لیں گے۔"

"ایگزیکٹلی ڈاکٹر نجف! میں بھی یہی بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ سرکاری ہسپتال نہیں ہے۔"

حق نے جتانے والے انداز میں کہا۔ کمرے میں ایک بھیانک خاموشی چھا گئی۔ حق نے اپنے سامنے رکھی فائل بند کر دی۔

نجف نے گہری سانس لے کر اگلی فائل اٹھالی۔

"نیکسٹ کیا اشو ہے؟"

"آئی سی یو میں رات کی ڈیوٹی کے دوران دو تجربہ کار نرسوں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔" ہیڈ آف نرسنگ نے اپنی فائل کھولی۔

"وجہ کیا ہے؟" نجف نے کنپٹی سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"کام کا غیر معمولی دباؤ اور عملے کی کمی کی وجہ سے۔"

"ایچ آر متبادل عملے کی تلاش کر رہا ہے۔" ڈاکٹر شمس نے فوراً جواب دیا۔

"کتنا وقت لگے گا؟" نجف نے ایچ آر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تقریباً تین ہفتے۔" ایچ آر نے جواب دیا۔

"تین ہفتے بہت زیادہ ہیں۔" نجف کی نگاہ ان پر ٹھہر گئی۔

"ہم عارضی عملہ رکھ سکتے ہیں۔ چھ نرسیں... کافی ہوں گی۔" ایچ آر کی طرف سے جواب آیا تھا۔

"آٹھ۔" نجف نے سر ہلایا۔ "آٹھ رکھیں۔"

"لیکن اس کے لیے اضافی رقم درکار ہوگی۔" چیف فنانشل آفیسر نے مداخلت کی۔

"آئی سی یو میں نرسوں کی تعداد مالی گنجائش دیکھ کر نہیں، مریضوں کی حالت دیکھ کر رکھی جائے گی۔" پھر وہ چند لمحے خاموش رہی۔ "عارضی عملے کا انتظام آج سے کیا جائے۔ مستقل ہائرنگ کا عمل اپنی جگہ جاری رہے گا۔ ہمیں ان مسائل سے فوراً نبٹنا ہوگا۔"

نجف نے فائل بند کر دی۔ "اگلے ماہ ہسپتال کے طبی معیار کا بیرونی معائنہ ہے۔"

ایچ آر، نرسنگ اور انتظامیہ کے سربراہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"تمام شعبوں کی دوبارہ جانچ کروادوں؟" ڈاکٹر شمس نے بات سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" نجف نے سامنے رکھی فہرست ان کی طرف بڑھادی۔ "ان شعبوں کی جہاں پچھلے چھ ماہ میں بار بار شکایات، کمپلیکیشنز یا عملے کی کمی رپورٹ ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر شمس نے فہرست دیکھی۔ "اور رپورٹ کب تک چاہیے؟"

"بدھ کی صبح میرے پاس ہونی چاہیے۔"

"اتنی جلدی؟" ڈاکٹر شمس قدرے حیران ہوئے۔ نجف نے انہیں دیکھا۔

"جی اتنی جلدی۔ اور ڈاکٹر کاشف کی سرجری کی اجازت کے بارے میں حتمی فیصلہ تحقیقات مکمل ہونے کے بعد ہوگا۔" اس نے واضح کیا۔ "یہ کوئی سزا نہیں ہے۔ یہ احتیاطی اقدام ہے۔"

میٹنگ ختم ہو چکی تھی۔ ایک ایک کر کے سب لوگ اپنی نشستوں سے اٹھنے لگے۔ سب سے پہلا باہر نکلنے والا حق تھا۔ وہ باہر نکلا اور دروازہ زور سے بند ہوا۔ وہاں بیٹھے افراد ایک لمحے کے لیے زور سے اچھلے پھر سب نارمل ہو گیا۔ دروازہ کھلتا اور بند ہوتا رہا۔ نجف نے ایک ذاتی فائل کھول لی۔ چند ہی لمحوں میں کمرے میں صرف نجف اور ڈاکٹر شمس رہ گئے۔ ڈاکٹر شمس کچھ دیر اسے دیکھتے رہے۔

"تم جانتی ہو نا، تمہارے فیصلے پورے ہسپتال کے نظام کو متاثر کرتے ہیں؟"

"اسی لیے تو میں یہاں بیٹھی ہوں۔" نجف نے فائل سے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔ ڈاکٹر شمس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔

" کبھی کبھی لگتا ہے تمہیں اس عہدے کا بوجھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔"

نجف نے اس بار سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں تھکن ضرور تھی، مگر فیصلہ اب بھی وہی تھا۔

"بوجھ محسوس ہوتا ہے ڈاکٹر شمس!" اس نے سامنے رکھی فائل پر ہاتھ رکھا۔ "اسی لیے اسے کسی اور کے کندھوں پر نہیں ڈال سکتی۔"

شمس کچھ نہ بولے۔ وہ اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ نجف دوبارہ کاغذات میں جھک گئی۔ باہر ہسپتال اپنی پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ اور اس وسیع عمارت کے اندر، سینکڑوں مریضوں، درجنوں شعبوں اور بے شمار فیصلوں کے درمیان، ایک میز پر بیٹھی وہ عورت صرف ڈاکٹر نہیں تھی۔ وہ اس نظام کی نگہبان تھی۔ اور یہ نگہبانی اسکے باپ نے اسے سونپی تھی۔ اسے اسکا مان

رکھنا تھا۔

☆.....☆.....☆

شام کا ملگجا اندھیرا عرب ٹاؤن میں واقع شبگیر ہاؤس کے صحن میں آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ باہر کی مدھم ہوتی روشنی کھڑکی کے شیشوں سے چھن کر اندر آ رہی تھی اور لاؤنج میں ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔ دادی صوفے پر بیٹھی، عینک کو ناک کی نوک پر ٹکائے، گود میں رکھی سٹیل کی بڑی پرات میں سے بڑی توجہ سے چاول چن رہی تھیں۔ ان کے بوڑھے ہاتھ روزمرہ کے ان معمولی کاموں میں خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ زہرہ بیگم کی یاد کا بوجھ کچھ ہلکا ہو سکے۔ ان کے قریب ہی صوفے کے دوسرے کونے پر تارہ بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کیمرہ تھا، جس کی نیلگوں سکرین پر وہ باری باری پرانی تصویریں اور ویڈیوز آگے پیچھے کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر الجھن اور بے زاری کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی چھائی ہوئی تھی۔ وہ کبھی سکرین کو دیکھتی، کبھی گہری سانس بھرتی۔ جب تصویریں دیکھتے دیکھتے اس کا دل مزید بوجھل ہو گیا، تو اس نے بے زار ہو کر کیمرہ صوفے کے نرم کشن پر ایک جانب پھینک دیا۔ کچھ دیر وہ لاؤنج کے فرش کو تکتی رہی، پھر اس نے نظر اٹھا کر دادی کی طرف دیکھا۔

"دادی...؟" اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ لاؤنج کی خاموشی میں بمشکل ہی سنائی دی۔

"ہوں...؟" دادی نے چاول چنتے چنتے مختصر سا کہا۔

"کیا نیمل آپی مجھ سے پیار نہیں کرتی ہیں؟" سوال اتنا اچانک تھا کہ دادی کے ہاتھ پرات کے کنارے پر جم گئے۔ انہوں نے فوراً اپنا سر اٹھایا اور عینک درست کرتے ہوئے تعجب سے تارہ کو دیکھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو تارہ؟ تمہیں ایسا کیوں لگا؟"

"آپی نوفہ کا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ اسے بار بار پوچھتی ہیں، اس کے پاس بیٹھتی ہیں، اسے باہر بھی لے کر گئیں۔ ڈاکٹر کے پاس بھی اپنے ساتھ لے کر گئیں۔ میرے بارے میں تو کوئی کچھ نہیں پوچھتا... اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ نوفہ سے پیار کرتی ہیں۔" تارہ نے اپنے دونوں ہاتھ گود میں کس کر بھینچ لیے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"یا تو وہ مجھ سے پیار نہیں کرتیں یا پھر وہ مجھ سے ناراض ہیں۔"

"وہ تم سے ناراض کیوں ہوگی بھلا؟" دادی نے اچنبھے سے پوچھا۔

"وہ...میں نے...اس دن زوریز سے، ان کی شادی میں بات کی تھی نا۔" تارہ نے اپنے ناخن سے صوفے کا کپڑا کریدتے ہوئے احساس جرم کے ساتھ کہا، "شاید اس لیے۔شاید اسی لیے وہ مجھ سے بات نہیں کرتیں۔"

دادی نے تارہ کا چہرہ دیکھا۔اس بچی کے ذہن میں اپنی ماں کو کھونے کے بعد ہر چیز کو کھو دینے کا خوف بیٹھ گیا تھا۔وہ خود کو ہی قصوروار سمجھ رہی تھی۔دادی نے ایک گہری سانس لی۔انہوں نے چاولوں کی پرات کو بڑی احتیاط سے سامنے والے شیشے کی میز پر رکھا اور عینک اتار کر سائیڈ پر رکھ دی۔

"ادھر آؤ میرے پاس..." انہوں نے اپنے دونوں بازو کھولتے ہوئے نرمی سے کہا۔تارہ صوفے سے اٹھی اور دادی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔دادی نے اپنے شفیق ہاتھوں سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

"تارہ میری بات غور سے سنو بیٹا...نیمل تمہاری بڑی بہن ہے، وہ ماں نہیں ہے۔مگر اس وقت وہ اپنی ماں کی جگہ کھڑے ہو کر اس گھر کے بکھرے ہوئے تنکوں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

گھر کا بڑا وہ بزرگ ہوتا ہے جو ٹپکتے ہوئے چھت کے نیچے ہر برتن کو درست جگہ رکھنا جانتا ہو۔دادی بھی کوشش کر رہی تھیں۔

تارہ نے خاموشی سے دادی کی گود میں سر رکھ دیا۔

"نوفہ بیمار ہے تارہ..." دادی نے اس کے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے سمجھایا، "نیمل اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی، اس کی خبر گیری کر رہی ہے کیونکہ نوفہ اس وقت زیادہ بوجھ تلے دب چکی ہے۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ تم سے کم پیار کرتی ہے۔تم دونوں تو اس کی آنکھوں کا تارا ہو۔"

"مگر دادی...وہ مجھ سے تو کچھ بھی شیئر نہیں کرتیں..." تارہ نے دھیمے سے کہا۔

"کیونکہ وہ تمہیں اس بڑے دکھ کے بوجھ سے بچانا چاہتی ہے۔" دادی نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا، "اور جہاں تک زوریز والی بات ہے...نیمل اتنی تنگ دل نہیں ہے کہ اپنی چھوٹی بہن کی کسی بات کو دل سے لگا کر بیٹھ جائے۔وہ تم سے ذرا بھی ناراض نہیں ہے۔تمہاری اس میں کوئی غلطی نہیں۔تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔"

"پکا نا؟" تارہ کی آنکھوں میں امید کی ایک مدہم سی چمک ابھری۔دادی نے مسکرا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"نیمل اکیلی سب کا دھیان رکھنے کی کوشش میں کبھی کبھی تھک جاتی ہے بیٹا! جب کوئی انسان اندر سے بہت تھکا ہوا ہو نا، تو وہ

کھل کر مسکرا نہیں پاتا۔اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ پیار نہیں کرتا۔تم دیکھنا...جب وہ واپس آئے گی،تو تم خود اس سے جا کر گلے ملنا۔تمہیں اپنے تمام سوالوں کا جواب اس کے لمس میں مل جائے گا۔"

تارہ نے ایک ہلکی سی سکون کی سانس خارج کی اور اپنا سر دوبارہ دادی کی گود میں رکھ دیا۔اس کے دل کا الجھا ہوا بوجھ اب آہستہ آہستہ ہلکا ہو رہا تھا۔وہ دونوں نیچے تھیں جبکہ اوپر چھت پر شام کا ملگجا اندھیرا اب رات کی سیاہی میں بدل رہا تھا۔آسمان پر چند ستارے نمودار ہو چکے تھے اور کھلی فضا میں ٹھنڈی ہوا کے خشک جھونکے چل رہے تھے،جو دن بھر کی گھٹن اور بوجھل پن کو دھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نیمل نے سب سے پہلے نوفہ کے ذہن سے خوف اور ذہنی دباؤ ہٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔نیمل نے چھت پر نوفہ کو بالکل ہلکی اور پرسکون واک کروائی۔

"بس آہستہ...کوئی جلدی نہیں ہے،سب سے پہلے اپنے ذہن کو خالی کرو نوفہ۔دنیا کا کوئی بوجھ تمہیں نہیں اٹھانا،وہ سب ابو، میں اور سلال سنبھال لیں گے۔تم بس ہوا کی سرسراہٹ کو محسوس کرو۔"

کچھ دیر واک کروانے کے بعد نیمل اسے چھت کے کونے پر رکھے پرانے لکڑی کے بینچ پر لے آئی۔اس نے نوفہ کو وہاں بٹھایا اور خود اس کے سامنے فرش پر زانو موڑ کر بیٹھ گئی۔

"اب اپنی آنکھیں بند کرو...اور ایک گہری،لمبی سانس لو۔ناک کے ذریعے ہوا کو اندر کھینچو...اپنے اندر کی ساری پریشانی اور تھکن کو اس ہوا کے ساتھ جمع کرو...اور پھر آہستہ سے منہ کے ذریعے اسے باہر نکال دو۔"

نوفہ نے اطاعت گزاری سے اپنی پلکیں موند لیں اور ایک لمبی سانس اندر کھینچنے ہی والی تھی کہ چھت پر بنی پانی کی ٹینکی کے جنگلے پر سے ایک باریک اور جانی پہچانی آواز ابھری۔

"نوفی...نوفی...سانس لو...چلو...چلو..."

نوفہ اور نیمل دونوں کی آنکھیں ایک ساتھ کھل گئیں۔سامنے پانی کی ٹینکی کے پائپ پر چغلی خان اپنی زرد اور سبز پروں والی گردن مٹکاتا،ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر بڑی ہوشیاری سے ان کی نقل اتار رہا تھا۔اس کی گول آنکھوں میں صریحاً شرارت چمک رہی تھی۔نوفہ کے مرجھائے ہوئے لبوں پر بے ساختہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"چغلی خان! تم چپ کرو نا... ہم میڈیٹیشن کر رہے ہیں۔" نوفہ نے مدہم آواز میں کہا۔ چغلی خان نے اپنے پر پھڑ پھڑائے، ٹینکی سے چھلانگ لگائی اور اڑ کر سیدھا نیمل کے شانے پر آ بیٹھا۔ اس نے نیمل کے بال کو اپنی چونچ میں پکڑ کر ہلکا سا کھینچا اور پھر نوفہ کی طرف دیکھ کر اپنی خاص تیکھی آواز میں بولا۔

"نوفی... نوفی... موٹی... نوفی..."

" لگتا ہے تمہارا دانہ پانی بند کرنا پڑے گا۔" نیمل نے چغلی خان کو اپنے شانے سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور اس کے سر پر انگلی پھیری۔ چغلی خان نیمل کی گود سے پھسل کر فرش پر آیا اور اپنی مضحکہ خیز چال چلتا ہوا نوفہ کے جوتوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی چونچ سے نوفہ کے شوز کے تسمے کو کھینچنا شروع کر دیا۔

"چلو تم بھی میڈیٹیشن کرو۔" نوفہ کے کہنے پر چغلی خان فوراً ایک ٹانگ پہ کھڑا ہو گیا۔ جس پر نے نوفہ نے کھل کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ نیمل نے اس کے چہرے پر آتی اس رونق کو دیکھا تو اس کے اپنے اندر کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہوا۔ اس نے چغلی خان کو اٹھا کر بینچ کے کنارے بٹھایا اور دوبارہ نوفہ کا دھیان اپنی طرف مرکوز کیا۔

"چلو اب دوبارہ... آنکھیں بند کرو۔" نیمل نے نرمی سے ہدایت دی۔ اس بار نوفہ نے آنکھیں بند کیں اور ایک لمبی، گہری سانس اندر کھینچی۔

"شاباش... بالکل ایسے ہی۔" نیمل نے اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے دھیمے سے سکھایا۔"

چھت پر رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور سرد ہوا اب تیز ہو رہی تھی جبکہ نیچے لاؤنج میں خاموشی تھی اور دادی کے ساتھ بیٹھی تارہ ابھی اپنے الجھے خیالات سے باہر نکل ہی رہی تھی کہ باہر مین گیٹ کی گھنٹی بجی۔ تارہ صوفے سے اٹھی اور سست قدموں سے باہر نکل کر گیٹ کے پاس آئی۔ اس نے دروازے کے چھوٹے سوراخ سے باہر جھانکا تو گلی میں ثریا چچی کھڑی تھیں، جن کے ہاتھوں میں کپڑے سے ڈھکی ایک بڑی ٹرے تھی۔ تارہ نے جلدی سے کیچ کھول کر گیٹ پورا کھول دیا۔

"السلام علیکم چچی!"

"وعلیکم السلام!" ثریا چچی نے مسکرا کر جواب دیا اور ٹرے تارہ کے آگے کی، "آج گھر میں بریانی بنائی تھی، تمہارے چچا کہنے لگے کہ بچوں کو بھی دے آؤ... زہرہ کے بغیر اب تم لوگ کہاں یہ سب بناتے ہو گے۔"

تارہ نے خاموشی سے ان کے ہاتھ سے ٹرے لی اور دونوں صحن اور لان کے بیچ میں بنی لمبی، پکی راہداری پر چلتے ہوئے اندرونِ خانہ کی طرف بڑھنے لگیں۔ راہداری کے دونوں طرف لگے پودوں کے پتے ہوا سے ہل رہے تھے۔ ثریا چچی نے چلتے چلتے ذرا جھک کر تارہ کے چہرے کو دیکھا، ان کا انداز بے حد متجسس تھا۔ ہاں وہی انداز جو رشتے داروں کا دوسروں کی بدحالی پر معلومات جمع کرتے وقت ہوتا ہے۔

"ویسے... میں نے پرسوں دیکھا تھا، نیمل صرف نوفہ کو لے کر باہر جا رہی تھی۔ سب خیریت تو ہے نا؟"

"جی وہ... نوفہ کی طبیعت ذرا خراب تھی۔"

"پھر کیا بتایا ڈاکٹر نے؟" ثریا چچی کے کان فوراً کھڑے ہو گئے، ان کا لہجہ اور دھیما ہو گیا۔

"وہ کہہ رہی تھیں اسے ڈپریشن ہے اور ساتھ ہارمونل ایشو ہے اور..."

"تارہ...!"

ابھی تارہ کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ اندرونی دروازے سے برف جیسی ٹھنڈی آواز ابھری۔ تارہ کا جملہ وہیں رک گیا۔ اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ نیمل دروازے کی دہلیز پر کھڑی تھی، اس کی آنکھوں میں واضع تنبیہہ تھی جو کہہ رہی تھی کہ ایک لفظ اور نہیں۔ تارہ کا چہرہ لمحوں میں فق ہو گیا۔ اسے اپنی نادانی کا احساس شدت سے ہوا۔ اس نے فوراً زبان دانتوں تلے دبائی، نظریں جھکائیں اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی نیمل کے پاس سے گزر کر اندر کی طرف بھاگ گئی۔ نیمل نے اگلے ایک لمحے میں اپنے چہرے کے تاثرات کو یکسر بدلا، اپنے اندر کی بے چینی کو چھپایا اور آگے بڑھ کر ثریا چچی کا استقبال کیا۔

"السلام علیکم چچی! آئیں نا اندر۔"

ثریا چچی کے چہرے پر ایک لمحے کو خفت ابھری، مگر انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور نیمل کے ساتھ لاؤنج میں آ کر دادی کے پاس صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"آپ بیٹھیں، میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔"

"ارے رہنے دو نیمل! اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں بس یہ بریانی دینے آئی تھی..." ثریا چچی نے فوراً کہا، مگر نیمل نے ہلکا سا سر ہلا کر کچن کا رخ کر لیا۔

کچن میں تارہ شیلف کے پاس کھڑی تھی۔اس نے بریانی کی ٹرے ایک طرف رکھی ہوئی تھی اور خود اپنے بائیں ہاتھ کے ناخن کو اتنی سختی سے کھرچ رہی تھی کہ کھال چھلنے کا خدشہ تھا۔اس کے چہرے پر ندامت اور گھبراہٹ صاف لکھی تھی۔نیمل نے خاموشی سے کچن کا دروازہ آڑا کیا اور اس کے قریب آئی۔

" کیا ہوا تارہ؟ سب ٹھیک ہے؟"

" آئی ایم سوری آپی..." تارہ کی آواز کانپ رہی تھی، "مُجھے نہیں پتا مجھ سے ہر بار غلطی کیوں ہو جاتی ہے؟ میں بس...میں جان بوجھ کر نہیں کر رہی تھی۔"

نیمل نے اس کی گھبراہٹ کو دیکھا تو آگے بڑھ کر جھکتے ہوئے تارہ کو دونوں کندھوں سے مضبوطی سے تھاما اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"تارہ...ریلیکس! تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔سب ٹھیک ہے، ہمم؟" نیمل کا لہجہ اتنا نرم تھا کہ تارہ کا لرزتا ہوا وجود تھوڑا پرسکون ہوا۔

"تم جاؤ اوپر، میں چائے بنا کر آتی ہوں۔سب ٹھیک ہو جائے گا، فکر مت کرو۔"

نیمل نے اس کے گال پر ہلکی سی تھپکی دی اور چولہے کی طرف پلٹ کر چائے کی کیتلی میں پانی ڈالنے لگی۔تارہ کچن کے دروازے پر ایک لمحے کو رکی۔نیچے کا ماحول، ثریا چچی کی موجودگی اور اپنے اندر کا گھٹن بھرا احساس اس کا دم گھوٹ رہا تھا۔اس سے مزید وہاں کھڑا نہیں ہوا گیا۔اس نے کچن سے قدم باہر نکالے، لاؤنج کو نظر انداز کیا اور سیڑھیوں کو دو دو پھلانگتی ہوئی تیزی سے اوپر چھت کی طرف بھاگ گئی۔نیچے کچن میں نیمل نے چولہا جلایا اور ایک بوجھل سانس خارج کی۔اسے معلوم تھا کہ اب ثریا چچی کے ذریعے یہ خبر پورے محلے میں کیسے پھیلے گی، مگر اس وقت اس کی ترجیح اس کا اپنا بکھرتا ہوا گھر تھا، رشتے داروں اور محلے داروں کی باتیں نہیں۔کچھ دیر بعد وہ چائے کی ٹرے لیے لاؤنج میں داخل ہوئی تو دادی اور ثریا چچی کے درمیان جاری گفتگو یکدم رک گئی۔فضا میں ایک عجیب سی خفگی اور چُپ سادھ لی گئی، جیسے اس کے آتے ہی کوئی بات چھپائی گئی ہو۔نیمل نے کسی تاثر کے بغیر ایک کپ دادی کے سامنے رکھا اور دوسرا کپ ثریا چچی کی طرف بڑھایا۔

"ویسے اچھا کیا نیمل تم نے یہ کورٹ کچہری کا چکر چھوڑ کر گھر سنبھال لیا۔" ثریا چچی نے کپ تھامتے ہوئے ناصحانہ انداز میں

کہا، " گھر کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے، اور ویسے بھی لڑکیوں کو وکالت کی اتنی بھاگ دوڑ زیب نہیں دیتی۔"
نیمل نے کوئی جواب نہیں دیا، بس خاموشی سے ایک مختصر سا سر ہلا دیا۔ دادی نے چائے کا کپ اٹھایا اور خاموشی سے گھونٹ بھرنے لگیں۔ ثریا چچی نے بھی چائے کا ایک گھونٹ لیا اور پھر اپنی باریک، معائنہ کرتی نگاہیں نیمل کے چہرے پر جما دیں۔

"تمہاری خلع کا کیا بنا؟ وہ تمہارا دیور تو ابھی جیل میں ہے نا؟ کوئی سزا ہوئی اسے؟"
ایک ہی سانس میں تین تیر چلائے گئے تھے۔ نیمل کے اندر ایک لمحے کے لیے لہر اٹھی، مگر اس نے بلا کا ضبط دکھایا۔ اس کے چہرے کی لکیریں ذرا برابر بھی نہ بدلیں۔
"چچی! جب خلع ہوگی تو پورے محلے کو پتا چل جائے گا... باقی میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے نپے تلے اور ٹھنڈے لہجے میں کہا۔
ثریا چچی نے اپنی خفت کو چھپاتے ہوئے چائے کا ایک اور گھونٹ بھرا، جیسے نیمل کے اس صاف جواب کی توقع نہ ہو۔ نیمل نے بھی ماحول کا دباؤ کم کرنے کے لیے بات کا رخ موڑ دیا۔
"آصفہ پھوپھو کیسی ہیں؟"

"موسم بدل رہا ہے تو بخار تھا، آرام فرما رہی ہیں۔" ثریا چچی نے گردن اکڑا کر کہا۔ آصفہ پھوپھو کے ذکر پر ان کے چہرے کی روایتی نخوت چھپ نہیں سکی۔ چائے کا کپ پلیٹ میں رکھتے ہوئے ثریا چچی نے ایک بار پھر ٹوہ لینا شروع کی۔
"ویسے... تارہ بتا رہی تھی کہ نوفہ کو کوئی ہارمونز کا مسئلہ ہو گیا ہے؟ لو بتاؤ! یہ بھی کیسی بیماریاں نکل آئی ہیں۔ بچی کل کو بڑی ہوگی، رشتے والے آئیں گے تو کیا کہیں گے؟ ایسی لڑکیوں کے رشتے کہاں ہوتے ہیں بھلا۔ ڈاکٹر تو کہتے ہیں اس بیماری میں شادی بالکل نہیں کرنی چاہیے۔"
ان کے الفاظ اتنے چبھتے ہوئے تھے کہ نیمل کی مٹھی سختی سے بھینچ گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل نے شدت سے خواہش کی کہ کاش وہ من پھٹ ہوتی، کاش وہ زبان درازی کر کے ثریا چچی کو کھری کھری سنا سکتی... مگر اس نے غصے کی جگہ مکمل تحمل اور بردباری کو چنا۔
"چچی! ایک عورت کی زندگی، اس کا سکون اور اس کی صحت... کسی بھی شادی اور رشتے سے کہیں زیادہ اہم ہوتی ہے۔ نوفہ ابھی بچی ہے۔ ہمارے معاشرے کا یہی سب سے بڑی المیہ ہے کہ جب کوئی بچی بیمار ہوتی ہے، تو لوگوں کو اس کی تکلیف اور علاج کی فکر نہیں ہوتی، بلکہ یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ کل کو وہ کسی کی بہو یا ماں کیسے بنے گی؟"

"ہاں لیکن شادی عورت کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔" ثریا چچی اپنے موقف کی ڈٹی رہیں۔

"پاکستان میں کئی لڑکیاں اور عورتیں اس مسئلے کا شکار ہیں۔ اس کا وقت پر علاج نہ ہو تو بچی کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے، کینسر اور دیگر سنگین مسائل کے چانسز بڑھ جاتے ہیں۔ پہلے اس بچی کو جی لینے دیں، شادی اور رشتے بہت بعد کی بات ہیں۔"

ثریا چچی کے چہرے کا رنگ بدلا۔ ان کے پاس نیمل کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

"ارے بھئی... میں تو ویسے ہی ایک بڑی ہونے کے ناطے کہہ رہی تھی۔" ثریا چچی نے کھسیانی ہو کر بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"نوفہ بھی مُجھے اپنی وردہ کی طرح عزیز ہے۔"

اسی اثنا میں باہر گیٹ لر گاڑی کے ہارن کی آواز ابھری۔ نیمل نے ثریا چچی پر سے نظریں ہٹائیں اور پرسکون انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ابو آ گئے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں۔" نیمل نے سپاٹ لہجے میں کہا اور لاؤنج سے باہر نکل گئی۔ پیچھے ثریا چچی اپنا سا منہ لے کر صوفے پر بیٹھی رہ گئیں، جبکہ دادی نے چائے کی اخری چسکی لیتے ہوئے ان کی طرف رخ موڑا۔

"تم طالب کے لیے رشتہ دیکھ رہی ہو کیا بنا؟" دادی کو بھی اپنے مطلب کی باتیں جاننی تھیں۔

"ارے کہاں اماں! مُجھے جو بھی لڑکی پسند آتی ہے وہ انکار کر دیتا ہے۔ آج کل کی اولاد بھی کس قدر نافرمان ہو چکی ہے۔" اس بار ثریا چچی کے چہرے پر ملال ابھرا تو دادی کا چہرہ تھوڑا پرسکون ہوا۔

"ہاں اولاد پڑھ لکھ کر سر پہ بیٹھ جائے تو ماں باپ کے لیے خاصی مشکل ہو جاتی ہے۔" دادی کے اندر بھی کسک سی ابھری۔

لاؤنج میں پھر سے خاموشی چھا گئی جبکہ باہر صحن میں سرمد صاحب اور نیمل آپس میں باتیں کرتے اندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

چند دن میں حالات نے رخ بدل لیا تھا۔ طالب کا آرٹیکل شائع ہو چکا تھا۔ پہلے اخبار کے ایک اندرونی صفحے پر چھپی ہوئی خبر اگلے ہی دن دوسرے اخبارات تک پہنچی، پھر وہی خبر مختلف انداز میں ٹیلی وژن کی سرخیوں کا حصہ بننے لگی۔ ابتدا میں معاملہ صرف زوریز کے مقدمے، اس کے خاندان کے اثر و رسوخ اور پولیس تفتیش تک محدود تھا، مگر اب خبریں سلطان احمد کے

سرکاری کردار تک پہنچ رہی تھیں۔

ان کے عہدے کے دوران کیے گئے چند ایسے فیصلے، جنہیں برسوں پہلے فائلوں میں دفن کر دیا گیا تھا، دوبارہ سامنے آ رہے تھے۔ کسی منصوبے کی منظوری میں غیر معمولی جلدی کی گئی تھی۔ ایک سرکاری ٹھیکے میں قواعد سے ہٹ کر رعایت دی گئی تھی۔ ایک ایسے افسر کا تبادلہ کروایا گیا تھا جس نے ایک اہم معاملے پر اعتراض اٹھایا تھا۔ ایک پرانی انکوائری جو مکمل ہونے سے پہلے ہی خاموش کر دی گئی تھی۔ چند افراد جو غائب ہو گئے تھے۔ خبریں ابھی الزامات اور دستاویزات کے درمیان کھڑی تھیں، مگر مسئلہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ تاریخیں بھی تھیں، دستخط بھی تھے اور سرکاری فائلوں کے حوالہ نمبر بھی۔ سلطان احمد کے لیے سب سے خطرناک بات یہی تھی۔ خبر صرف بول نہیں رہی تھی۔ خبر ثبوت کے ساتھ بول رہی تھی۔ اور دوسری طرف زوریز اب بھی جیل میں تھا۔ اس کے خلاف مقدمہ تو چل رہا تھا، مگر ابھی کوئی حتمی سزا نہیں ہوئی تھی۔ سلطان احمد مسلسل اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے اپنے بیٹے کی رہائی کی راہ نکالنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن ایک مسئلہ ہر بار ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا۔ البتہ شاہ زیب نے نے ابھی تک ڈرائیورس پیپرز پر دستخط نہیں کیے تھے۔

اسی دوران ایک کمرے میں ٹیلی وژن کی آواز مسلسل گونج رہی تھی۔ طالب صوفے پر بیٹھا سامنے چلنے والی خبر دیکھ رہا تھا۔ اسکرین پر ایک کے بعد ایک سرخی بدل رہی تھی۔

"زوریز کیس میں نئی پیش رفت..."

پھر دوسری سرخی آئی۔

"سابق سرکاری فیصلوں پر سوالات، سلطان احمد کے دور کی فائلیں زیرِ بحث۔"

طالب نے ریموٹ سے آواز کچھ بڑھا دی۔ اینکر کی آواز سنجیدہ تھی۔

"ہم یہ واضح کر دیں کہ ان دستاویزات کی مکمل قانونی حیثیت کا تعین متعلقہ ادارے کریں گے، تاہم ہمارے پاس موجود ریکارڈ میں ایسے فیصلوں کا ذکر موجود ہے جن پر ماضی میں اعتراضات اٹھائے گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ان اعتراضات پر کارروائی کیوں نہیں ہوئی؟"

طالب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے موبائل اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔

چند لمحوں بعد کال اٹھا لی گئی۔

"نیوز دیکھی آپ نے؟" دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر سرمد صاحب کی آواز آئی۔

"دیکھ تو سلطان رہا ہوگا۔"

طالب بے اختیار ہنس دیا۔ "آپ کو کیسے معلوم؟"

"کیونکہ خبر ہم نے بھیجی ہے، مگر تکلیف اسے ہو رہی ہوگی۔"

"تکلیف خاصی شدید لگ رہی ہے۔" طالب جیسے محظوظ ہوا۔

"اچھی بات ہے۔" سرمد صاحب کافی مطمئن تھے۔ طالب نے ٹیلی وژن کی طرف دیکھا۔

"آپ نے جو فائلیں دیں تھیں، ان میں سے دو چیزیں آج کی خبر میں چلی گئی ہیں۔ باقی اگر کل گئیں تو معاملہ صرف زوریز تک نہیں رہے گا۔"

سرمد صاحب چند لمحے خاموش رہے پھر گویا ہوئے۔ "مُجھے معلوم ہے۔"

"سلطان احمد اب خاموش نہیں بیٹھے گا۔" طالب نے آگاہ کیا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

"آپ چاہتے ہیں وہ ردِعمل دے؟"

"جو آدمی دباؤ میں آکر غلطی کرے، اسے کسی دشمن کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ خود اپنے خلاف ثبوت بن جاتا ہے۔" سرمد صاحب کی آواز میں عجیب سا اطمینان تھا۔

"تو پھر تیار رہیے۔" طالب نے کہا اور کال ختم ہوگئی۔

اور تقریباً اسی لمحے، شہر کے دوسرے سرے پر ایک اور کمرے میں سلطان احمد اپنا ضبط کھو رہے تھے۔

"یہ خبر کس نے چلائی ہے؟" ان کی آواز پورے کمرے میں گونجی۔ سامنے بیٹھا شخص خاموش تھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں، یہ خبر کس نے چلائی ہے؟"

"سر، خبر ایک اخبار میں پہلے آئی تھی۔ پھر دوسرے اداروں نے اٹھالی۔"

"مُجھے معلوم ہے خبر کہاں سے آئی!" انہوں نے میز پر پڑی اخبار کی کاپی اٹھا کر زمین پر پھینک دی۔ "مُجھے یہ بتاؤ کہ فائلیں باہر کیسے گئیں؟"

کمرے میں بیٹھے دو افسر ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ "سر، ہم معلوم کر رہے ہیں۔"

"معلوم کر رہے ہیں؟" سلطان احمد آگے بڑھے۔

"تم لوگوں کو معلوم ہے میں نے اس محکمے میں کتنے سال گزارے ہیں؟ تمہیں معلوم ہے کتنے لوگوں کے کیریئر بنائے ہیں میں نے؟ اور آج میرے ہی کمرے کی فائلیں اخباروں میں پڑی ہیں اور تم مُجھے کہہ رہے ہو کہ معلوم کر رہے ہیں؟"

تبھی ان کے موبائل پر ایک اور کال آئی۔ انہوں نے جھنجھلا کر فون اٹھایا۔

"ہاں بولو؟" دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ سلطان احمد کے چہرے کے تاثرات مزید سخت ہو گئے۔

"نہیں! ابھی نہیں۔ اسے رہا کروانے کی کوشش جاری رکھو۔ عدالت سے پہلے کسی راستے کی ضرورت ہے۔"

کچھ لمحے بعد انہوں نے فون بند کیا۔ "اور ان چینلز کو فون کرو۔"

سامنے بیٹھے آدمی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "کون سے؟"

"سب کو۔"

"سر، کچھ چینلز نے تو خبر نشر کر دی ہے۔"

"تو انہیں بند کرو!" وہ جھنجھلا کر بولے۔

"لیکن سر..."

"مُجھے طریقہ مت سکھاؤ۔" سلطان احمد نے انگلی میز پر ماری۔

"جس چینل نے یہ خبر دوبارہ چلائی، اسے بتاؤ کہ اس کے اشتہارات کہاں سے آتے ہیں۔ جس اخبار نے یہ چھاپا ہے، اسے یاد دلاؤ کہ اس کے کاغذ کی قیمت کون بڑھا سکتا ہے۔ اور جس صحافی نے یہ خبر بنائی ہے، اسے بتاؤ کہ صحافت اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"سر وہ صحافی... طالب سکندر ہے۔ سرمد صاحب کا بھتیجا۔"

سلطان احمد کے چہرے کا رنگ سفید ہوا۔ ایک گہری خاموشی چھا گئی اور پھر ان کے چہرے پر پچھتاوا ابھرا۔ وہ چند منٹ میز کو گھورتے رہے پھر اپنا فون اٹھایا۔ ان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور پھر اسکرین پہ کالنگ کا آپشن آیا۔ کال جانے لگی چند لمحے اور پھر فون اٹھا لیا گیا۔ دوسری جانب خاموشی چھائی رہی اور پھر سلطان احمد کی آواز سنائی دی۔

"صرف تمہیں معلوم تھا۔"

"کیا؟" سرمد صاحب کی آواز بالکل پرسکون تھی۔

"میرے بارے میں یہ سب...صرف تم جانتے تھے۔"

"تھا تو سہی۔" سرمد صاحب کی آواز کافی پرسکون تھی۔

"اور تم نے میڈیا کو دے دیا۔"

"کیا مُجھے دینا چاہیے تھا؟"

سلطان احمد چند لمحے بول نہ سکے۔ پھر ان کی آواز میں غصہ اتر آیا۔

"تم نے میرے ساتھ یہ کیا؟"

"میں نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا، سلطان۔ جو تم نے کیا تھا، وہ سامنے رکھ دیا ہے۔"

"تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"جانتا ہوں۔"

"ہم دوست تھے اور تم..."

"تم نے میری بیٹی کے معاملے میں جس دن اپنی طاقت استعمال کی، اسی دن یہ دوستی ختم ہوگئی تھی۔" سرمد صاحب نے ان کی بات کاٹ دی۔

"میں نے تمہاری بیٹی کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔"

"تم نے میری بیٹی کا تماشہ بنانے کی کوشش کی۔ تم کیونکر بھول گئے کہ میں تمہاری کمزوریوں سے واقف ہوں؟"

ان کی بات پر سلطان احمد نے دانت بھینچے۔ "اپنی حد میں رہو، سرمد۔ تمہاری اوقات ہے مجھ سے دشمنی کرنے کی؟"

"دشمنی اوقات دیکھ کر نہیں، خصلت دیکھ کر کی جاتی ہے۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ سرمد صاحب نے بات جاری رکھی۔

"اور ایک بات یاد رکھو، سلطان۔ تم نے ساری عمر لوگوں کو یہ یقین دلایا ہے کہ تمہارے پاس اختیار ہے۔ اور مُجھے لوگوں کو یہ یقین دلانے میں دیر نہیں لگے گی کہ تم نے یہ اختیار کیسے حاصل کیا ہے۔"

"تم مُجھے دھمکا رہے ہو؟"

"نہیں۔تمہیں خبردار کررہا ہوں۔"

سلطان احمد کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔"تمہاری اس حرکت کی وجہ سے میرے بیٹے کو کچھ ہوا تو..."

"تمہارے بیٹے کو جو ہوگا، وہ اس کے اپنے عمل کا نتیجہ ہے۔"سرمد صاحب نے فوراً بات کاٹ دی۔

"تمہیں اندازہ نہیں تم کس سے کھیل رہے ہو۔"

"مُجھے بالکل اندازہ ہے۔اسی لیے تو کھیل شروع کیا ہے۔"چند لمحے دونوں طرف خاموشی رہی۔پھر سرمد صاحب نے کہا خاموشی توڑی۔

"اور اپنے بیٹے سے کہو خلع کے کاغذات پر دستخط کرے۔"

"وہ بچوں کا آپسی معاملہ ہے۔"سلطان احمد نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"میں سب اچھے جانتا ہوں۔میرے سامنے ڈرامے نہیں کرو سلطان!"

"اور اگر اس نے دستخط نہ کیے؟"سلطان احمد نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"تو پھر تم میری بیٹی کو نہیں جانتے۔"سرمد صاحب کی آواز میں ایسی ٹھنڈک اتر آئی کہ سلطان احمد ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئے۔

"میں نے اپنی بیٹی کو پڑھایا لکھایا، اسے ادب، اخلاقیات سب سکھایا ہے مگر ایک چیز نہیں سکھائی۔"

دوسری جانب سے سلطان احمد کے چہرے پر تے تمسخرانہ مسکراہٹ ابھری۔

"میں نے اسے ڈرنا نہیں سکھایا۔جس دن وہ ادب و اخلاقیات بھول گئی تو پھر تم لوگوں کو بہت برا گھسیٹے گی۔"پھر ان کی آواز اور سخت ہوگئی۔"اس لیے میری بیٹی کو اخلاقیات کے دائرے میں رہنے دو۔"

سلطان احمد نے کنپٹی مسلی۔وہ اپنی طاقت کا استعمال بے اختیار کرنا چاہتے تھے مگر افسوس انکا ایک بیٹا جیل میں تھا۔اور اس وقت ان کے بیٹے نے اسکی طاقت کے گھوڑے کو لگام ڈال دی تھی۔

"تم نے غلط آدمی سے دشمنی کی ہے سلطان...تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔"اور پھر کال کٹ گئی۔سلطان احمد چند لمحے وہیں کھڑے رہے۔ٹیلی وژن پر پھر وہی خبر چل رہی تھی۔

"سلطان احمد کے دورِ اختیار سے متعلق مزید دستاویزات سامنے آ گئیں۔"

انہوں نے ریموٹ اٹھا کر ٹیلی وژن بند کر دیا۔ مگر آواز بند ہونے کے باوجود سرخی ان کے ذہن میں چلتی رہی۔

☆.....☆.....☆

شام ڈھلنے لگی تھی۔ شہر کی سڑکوں پر گاڑیوں کا ہجوم بڑھ چکا تھا۔ سرخ بتیوں کی قطاریں اور تیزی سے گزرتی گاڑیوں کے درمیان سیاہ رنگ کی گاڑی اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ پچھلی نشست پر حق خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی کیس فائل تھی جس کے صفحات وہ وقفے وقفے سے پلٹ رہا تھا۔ چند صفحات پر اس نے سرخ قلم سے نشان لگا رکھے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر اس کی انگلی رک گئی۔ اس نے رپورٹ دوبارہ پڑھی، پھر چند لمحے سوچ کر فائل بند کر دی۔ سامنے ڈرائیونگ سیٹ پر قدیر پوری توجہ سے گاڑی چلا رہا تھا۔ حق نے فائل بند کی ہی تھی کہ موبائل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر نام دیکھتے ہی اس کی نگاہ چند لمحوں کے لیے ٹھہر گئی۔ اس نے کال اٹھالی۔

"جی، مسٹر خان۔"

"حق، میں کافی دیر سے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" دوسری طرف سے بے تابی سے کہا گیا۔ حق نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

"آج کل ہسپتال میں کچھ زیادہ ہی پھنسا ہوا ہوں۔ فون دیکھنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔"

"مُجھے اندازہ ہے۔ اور بتاؤ سب ٹھیک ہے؟"

"جی بالکل... آپ بتائیں خیریت ہے۔" حق نے لہجہ نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

مسٹر خان نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میں سلویٰ اور کامل کو اپنے گھر لے آیا ہوں۔"

حق کی انگلی فائل کے کنارے پر رک گئی۔ چند لمحوں تک وہ خاموش رہا۔ "کب؟"

"آج۔" مسٹر خان نے مختصر جواب دیا۔

"سلویٰ نے خود کہا آپ سے؟"

"ہاں۔ اور میں نے بھی یہی مناسب سمجھا۔"

حق نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ "ٹھیک ہے۔"

مسٹر خان شاید اس جواب کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ "تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟"

حق نے کھڑکی کے شیشے سے باہر گزرتی عمارتوں کو دیکھا۔ "مُجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" پھر اس کی آواز میں سنجیدگی اتر آئی۔

"لیکن میرے بیٹے اور میری بیوی کی حفاظت کی ذمہ داری آپ کی ہے۔" دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔

" کیا آپ یہ ذمہ داری لیتے ہیں؟" حق کا لہجہ صاف اور دوٹوک تھا۔

"سلویٰ میری بیٹی ہے، حق۔" مسٹر خان کا لہجہ سخت ہوا پھر ذرا نرم ہو کر بولے۔ "مجھ سے زیادہ اس کی حفاظت کا احساس کس کو ہوگا؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ انہیں محفوظ نہیں رکھ سکتے۔" حق نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس بات کو سمجھیں کہ اب معاملہ صرف سلویٰ کا نہیں ہے۔ کامل بھی ہے۔"

"مُجھے معلوم ہے۔ اس لیے تم بے فکر ہو جاؤ۔"

"اور اگر کوئی مسئلہ ہوا تو؟" حق کی بھنویں ہلکی سی سکڑیں۔

"تو سب سے پہلے میں تمہیں اطلاع دوں گا۔" مسٹر خان نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔ حق خاموش ہو گیا تو مسٹر خان نے بات جاری رکھی۔

"میں تمہارا سسر ہوں، دشمن نہیں۔ اور سلویٰ کو تم سے دور لے جانے کا مقصد تمہیں اس سے الگ کرنا نہیں ہے۔ میں صرف چاہتا ہوں کہ وہ کچھ عرصہ سکون سے رہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" حق کا لہجہ پرسکون ہو گیا۔

"اور تم کامل سے ملنے آ سکتے ہو۔ جب چاہو۔"

"میں آتا رہوں گا۔"

"صرف بیٹے سے نہیں، سلویٰ سے بھی ملنے آنا۔"

حق کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، مگر آواز سنجیدہ ہی رہی۔ "وہ مُجھ سے ملنا چاہے گی تو ضرور۔"

"وہ تمہاری بیوی ہے، حق۔" مسٹر خان نے بیوی پہ زور دیا۔

"اور اسی لیے میں اسے مجبور نہیں کرنا چاہتا۔" دوسری طرف مختصر سی خاموشی چھائی۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے کہا۔ "تم جب مناسب سمجھو، آ جانا۔ گھر تمہارے لیے کھلا ہے۔"

حق نے آہستہ سے سر ہلایا، جیسے سامنے بیٹھا شخص اسے دیکھ رہا ہو۔ "ٹھیک ہے۔ میں کامل سے ملنے آتا رہوں گا۔"

"انتظار رہے گا۔" مسٹر خان الوداعی انداز میں کہا اور کال ختم ہوگئی۔ حق نے موبائل آہستہ سے نیچے رکھا۔ گاڑی بدستور سڑک پر رواں تھی۔ قدیر نے آئینے میں ایک نظر پیچھے دیکھا، مگر حق کے چہرے پر اب وہ پہلے والی یکسوئی نہیں تھی۔ اس کی نظریں سامنے کہیں خالی جگہ پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ شہر کی روشنیاں تیزی سے پیچھے چھوٹ رہی تھیں۔ حق نے دھیرے سے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔

"قدیر۔"

"جی، صاحب؟"

" گھر چلنے سے پہلے ایک جگہ رکنا ہے۔"

" کہاں، صاحب؟"

حق نے چند لمحے سوچا۔ "ابھی بتاتا ہوں۔"

قدیر نے آئینے میں دوبارہ اسے دیکھا۔ حق کی نظریں اب شیشے سے باہر تک رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں پھیل چکی تھیں۔

☆.....☆.....☆

رات کی تقریب شہر کے ان چند بڑے گھروں میں سے ایک میں منعقد ہوئی تھی جہاں دروازے پر کھڑی گاڑیوں سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اندر معمولی محفل نہیں سج رہی۔ زاویار کے والد شہر کی معروف شخصیات میں شمار ہوتے تھے۔ سیاست، کاروبار اور انتظامیہ کے بڑے نام اس تقریب میں موجود تھے۔ وسیع لان میں نرم روشنیوں کا انتظام تھا، ایک طرف موسیقی دھیمی آواز میں بج رہی تھی اور دوسری جانب مختلف حلقوں میں لوگ کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ زاویار کی پوری ٹیم موجود تھی۔ وہ بار بار اپنے ساتھیوں کے درمیان آ جا رہا تھا۔ کبھی کسی مہمان سے ملتا، کبھی اپنے کھلاڑیوں کو دیکھتا۔ مگر اس کی نگاہ ہر چند لمحوں بعد سقراط کی طرف ضرور اٹھ جاتی۔ وہ خوش تھا کہ سقراط اسکے مدعو کرنے پر آ گیا تھا۔ سقراط سفید شرٹ میں تھا۔ بال آدھے جوڑے میں بندھے تھے۔ ہاتھ میں مشروب کا گلاس تھا۔ وہ اپنی ہی فیلڈ کے چند ایک لوگوں سے محو گفتگو تھا اور پھر اسکی نظر مسکرا کر کسی سے بات کرتے ایک شخص پہ ٹھہر گئی۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس حق وہاں رسمی طور پر آیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دور

سے دیکھا۔ایک لمحہ۔صرف ایک لمحہ پھر دونوں نے نظریں ہٹالیں۔جیسے دس برس کی نفرت ایک نظر سے بھی زیادہ بھاری ہو۔
کچھ دیر بعد لوگوں کی بھیڑ سے نکلتے ہوئے دونوں تقریباً بے اختیار ایک ہی سمت میں آ گئے۔لان کے نسبتاً سنسان حصے میں آ کر ان کے درمیان چند قدم کا فاصلہ رہ گیا۔
"تم تو تقریبات کا حصہ نہیں بنتے تھے؟" حق نے گفتگو کا آغاز کیا۔
سقراط رک گیا۔اس کا چہرہ یک دم سپاٹ ہو گیا۔"وہ دس سال پرانی بات ہے۔"
"لیکن تم آج بھی ویسے ہی ہو۔" حق نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

سقراط کی نگاہیں اسکی طرف پلٹیں اور جم گئیں۔ دو بہترین دوست...دو بدترین دشمن۔حق کو دیکھتے ہوئے سقراط کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔
"تمہیں غلط لگتا ہے،حق صاحب۔" وہ ایک قدم آگے آیا۔"جس سقراط کو تم جانتے تھے،وہ مر چکا ہے۔"
حق نے ایک گہری سانس لی۔کچھ لمحوں تک وہ صرف سقراط کو دیکھتا رہا۔اس کی آنکھوں کا تاثر نرم تھا۔
"اگر تم بدل چکے ہوتے...تو نجف سے نکاح نہ کرتے۔" حق نے یہ بات بالکل معمول کے انداز میں کہی تھی۔مگر الفاظ سیدھے سقراط کے اندر اترے۔اگلے ہی لمحے وہ ہنس دیا۔استہزائیہ اور پراسرار سی ہنسی پھر وہ حق کی طرف جھکا۔
"تمہیں کیا لگتا ہے،میں نے اس سے یہ نکاح کیوں کیا ہے،حق؟" اس کی آنکھوں میں تپش تھی۔جیسے وہ کسی پرانے زخم کو انگلی سے کرید کر لطف لے رہا ہو۔اسکی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے حق کے ہاتھ میں پکڑا گلاس ہولے سے لرزا۔اس نے فوراً اپنی گرفت مضبوط کر لی۔
"اس کا کوئی قصور نہیں ہے،سقراط۔" یہ کہتے ہوئے حق کو اپنی ہی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔

سقراط مُسکراتے ہوئے سیدھا ہوا۔"یہ فیصلہ میرا ہونا چاہیے کہ میرا قصوروار کون ہے کون نہیں۔" سقراط بظاہر بالکل لاپرواہ تھا۔مگر حق کو محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں دھڑکتا دل ایک لمحے کو ڈوب گیا ہو۔یعنی باقی سب کے خدشات درست تھے؟ وہ دشمنی کا آغاز کر رہا تھا؟ وہ بدلا لینے آیا تھا؟
"بھول جاؤ سب..." بہت دیر بعد حق کی آواز نکلی۔سقراط نے اسے دیکھا۔
"نہیں بھول سکتا۔" پھر سر جھکا کر بوٹ سے گھاس پر ہلکی سی ٹھوکر ماری،پھر دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈال لیے۔

"نہیں بھول سکتا۔"اس بار اس نے بہت آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں بھول سکتا۔"اس بار آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔اتنی معمولی کہ شاید ہی کوئی دیکھ پاتا مگر حق دیکھ سکتا تھا۔وہ نظریں نہ بھی ملاتا،تب بھی دیکھ لیتا۔وہ اس شخص کی آنکھوں کو برسوں سے جانتا تھا۔

"سقراط...ہم اس طرح نہیں رہ سکتے۔"

سقراط کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ آئی۔"ہم؟"اس نے لفظ کو جیسے اپنے درمیان رکھ کر دیکھا۔

"ہم دوست تھے۔"حق نے یاددہانی کرانا چاہی۔

"تھے۔"سقراط نے تھے پر زور دیا۔"ہم دوست تھے۔"

"اوراب؟"حق کی نظریں ایک پل کو بھی اسکے چہرے سے نہ ہٹیں۔سقراط نے چند لمحے اسے دیکھا۔

"اب تم میرے راستے میں کھڑے ہو۔"

حق کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے تکلیف ابھری۔"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔"

"تم ہو۔"سقراط کا جواب فوراً آیا۔"کیونکہ تم اس خاندان کا حصہ ہو جس سے میرا حساب باقی ہے۔"

حق نے اس بار نگاہیں جھکالیں۔اندر کہیں کسک سی اُٹھی۔آہ کاش!وہ اس خاندان کا حصہ نہ ہوتا۔وہ حق امام بزدار نہ ہوگا۔وہ بس حق امام ہوتا۔ایک عام انسان ہوتا تو آج سقراط اسکے ساتھ ہوتا۔

"میں نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا۔"حق نے پھر سے صفائی دی۔سقراط کچھ دیر خاموش رہا پھر بہت دھیرے سے بولا۔

"ہاں تم نے کچھ نہیں کیا۔"پھر اس کی نگاہ حق کی سیاہ شرٹ پر ٹھہر گئی۔"تم سیاہ مت پہنا کرو۔"

یہ غیر متوقع تھا۔حق نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔سقراط کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"تم پر صرف نیلا رنگ جچتا ہے۔تم پانی کی طرح ہو،ضروری اور بے رحم!سقراط کے بے رحم تجزیے پر ایک لمحے کے لیے دونوں کے درمیان خاموشی اتر آئی۔

"پانی کے بغیر زندگی نہیں ہے لیکن یہ ڈبودے تو سانس تک واپس نہیں کرتا۔"اس کی مسکراہٹ مدھم پڑ گئی اور حق کے ہونٹ بھنچ گئے۔

"اسی لیے سیاہ مت پہنا کرو کیونکہ تم سیاہ سے زیادہ ظالم ہو۔"

حق کچھ بول ہی نہ پایا۔کوئی اور اسکا یہ تجزیہ کرتا تو کہانی کچھ اور ہوتی مگر چوٹ تو سقراط نے کی تھی۔اس پر لازم تھا وہ سہہ جائے۔وہ سہہ گیا تھا۔خاموشی روح فرساں ہوئی تو سقراط پلٹنے لگا۔حق نے اس کی پشت کو دیکھا۔اور پھر اچانک اس کی آواز اس کے عقب میں ابھری۔

"میں جینا چاہتا ہوں،سقراط!"

سقراط کے قدم ساکت ہو گئے۔نہیں زمین نے اسکے قدم جکڑ لیے تھے۔جیسے اس نے کوئی نا قابلِ یقین بات سنی ہو،پھر وہ ایک جھٹکے سے پلٹا۔دونوں کے درمیان چند قدم کا فاصلہ تھا۔سقراط اسے بے یقینی سے تکنے لگا۔حق نے ایک قدم آگے بڑھایا۔پھر دوسرا۔وہ سقراط کے عین سامنے آ کر رک گیا۔دو مرد۔دو دوست۔اور ان دونوں کے درمیان دس برس کی ایسی دشمنی تھی جس کی بنیاد دوستی پر تھی۔اور دوستی آج بھی دشمنی کا حصہ تھی۔

"میں جینا چاہتا ہوں۔" حق کی آواز اس بار بہت دھیمی تھی۔سقراط کے چہرے پر کچھ بدل گیا۔

"اپنے بیٹے کے ساتھ۔" حق نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔"مُجھے جینے دو۔"

سقراط کے گلے کی گلٹی ڈوب کر ابھری۔وہ کچھ کہہ نہ سکا۔بس ایک لمحہ لگا اور اسکے آس پاس کا منظر بدل گیا۔اب وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا۔ان کی جگہ بدل چکی تھی۔

"میں مرنا نہیں چاہتا،حق۔میں جینا چاہتا ہوں۔میری مدد کرو۔مُجھے یہاں سے نکالو۔"

دس سال پہلے کے الفاظ،سقراط کی سماعت سے ٹکرائے۔وہی الفاظ،وہی درخواست۔فرق صرف اتنا تھا کہ دس سال پہلے زندگی مانگنے والا سقراط تھا۔اور آج حق۔سقراط نے لب بھینچ لیے۔اس کی آنکھیں چند لمحوں کے لیے بند ہوئیں۔پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔

"اگر جینا چاہتے ہو...تو میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔"اس کی آواز بھاری تھی۔حق خاموش رہا۔سقراط نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور تنبیہہ کی۔

"میں بھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔"

وہ پلٹا۔اس بار حق نے اسے نہیں روکا۔سقراط چند قدم دور چلا گیا۔پھر بھیڑ میں گم ہو گیا۔حق وہیں کھڑا رہا۔اس کے ہاتھ میں موجود گلاس اب بھی تھا،مگر اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے یہ گلاس کب سے پکڑ رکھا تھا۔اس کی نگاہیں اس جگہ جمی تھیں جہاں ابھی

سقراط کھڑا تھا۔ وہ جانتا تھا، سقراط کا بدلہ صرف اس تک محدود نہیں تھ بلکہ اس کے خاندان تک جاتا تھا۔ اور ان دونوں کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ بھی وہ خود تھا۔

حق بزدار! وہی آدمی جو اس وقت سقراط کے راستے میں کھڑا تھا۔ وہی آدمی جسے کبھی سقراط اپنا بھائی کہتا تھا۔ اور آج...وہی اس کا دشمن تھا۔ حق نے آہستہ سے نظریں اٹھائیں۔ لان کی روشنیاں پہلے جیسی تھیں۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ موسیقی بج رہی تھی۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ اسی محفل کے ایک گوشے میں دو ایسے آدمی موجود تھے جن کے درمیان کبھی دنیا کی سب سے مضبوط دوستی ہوا کرتی تھی۔ اور اب وہ ایک دوسرے کی زندگی کے راستے میں کھڑے تھے۔ دوستی، محبت سے بھی بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ حق یہ محسوس کر چکا تھا کہ سقراط اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ شاید وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ حق راستے سے ہٹ جائے۔ مگر الفا کبھی راستہ نہیں چھوڑتا۔ چاہے سامنے دشمن ہو... یا سب سے عزیز دوست!

☆.....☆.....☆

شام ہسپتال کی بلند شیشوں والی عمارت پر اترنے لگی تھی۔ نجف کا آج کا آخری دورہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہ لمبی راہداری سے گزر رہی تھی جبکہ اس کا اسسٹنٹ ایک قدم پیچھے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

" کل صبح پہلی شفٹ شروع ہونے سے پہلے آئی سی یو کے تمام مریضوں کی فہرست میرے میز پر ہونی چاہیے۔"

"جی، میڈم۔"

"اور جن مریضوں کی حالت آج بدلی ہے، ان کی رپورٹ بھی الگ سے تیار کرو۔ خاص طور پر وہ دو مریض جن کے..."

نجف کی آواز اچانک دھیمی پڑ گئی۔ راہداری کے دوسرے سرے سے ایک وہیل چیئر آ رہی تھی۔ اس پر کوئی شخص بیٹھا تھا، ایک وارڈ بوائے اسے دھکیلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ نجف نے ایک نظر وہیل چیئر پر ڈالی اور پھر اپنے اسسٹنٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"اور ہاں، کل..."

تبھی دوسری طرف سے کسی نے وارڈ بوائے کو آواز دی۔ نجف کی آواز پھر پس منظر میں چلی گئی۔ وارڈ بوائے رک گیا۔

"ذرا ادھر آنا!" اسے ایک ڈاکٹر نے پکارہ تھا۔ وارڈ بوائے نے وہیل چیئر کو راہداری کے کنارے، ایک بڑی کھڑکی کے پاس روک دیا۔

"کیا مریض کو یہیں رکھنا ہے؟"

"نہیں صرف تمہیں بلایا ہے، پہلے ادھر آؤ۔"

وارڈ بوائے نے وہیل چیئر کا رخ کھڑکی کی جانب کر دیا اور تیزی سے دوسری سمت چلا گیا۔ نجف آگے بڑھتی رہی۔ اس کے قدم وہیل چیئر کے برابر آ کر رک گئے۔ وہ کچھ یاد آنے پر اسسٹنٹ کو سمجھ آ رہی تھی کہ اچانک اس کا ہاتھ بے اختیار وہیل چیئر کی پشت پر رکھا گیا۔ یہ بالکل لاشعوری طور پر ہوا تھا۔ صرف ایک لمس۔ ایک لمحہ اور پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ راہداری غائب ہو گئی۔ نہ سفید دیواریں تھیں، نہ روشنیاں، نہ لوگوں کی آوازیں۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا جس میں سانس لینے کی آواز بھی بہت دور سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ نجف نے پوری آنکھیں کھول کر اپنے سامنے دیکھا۔ اندھیرے کے بیچ ایک گول دائرے کی روشنی جل رہی تھی۔ اور اس روشنی کے عین وسط میں وہی وہیل چیئر موجود تھی۔ اس پر ایک وجود بیٹھا تھا۔ چہرہ اندھیرے میں چھپا ہوا۔ جسم ساکت تھا اور سر قدرے جھکا ہوا۔

"پلیز ہیلپ می!"

نجف کے دل جیسے رک گیا۔ وجود نے سر اٹھایا۔

"پلیز ہیلپ می!"

آواز میں ایسی گھٹن تھی جیسے کوئی بہت دیر سے چیخ رہا ہو اور اب اس کے پاس چیخنے کی طاقت بھی باقی نہ رہی ہو۔ نجف نے ایک قدم آگے بڑھانا چاہا۔ اس کے پاؤں جیسے زمین میں دھنس گئے۔

"کون ہو تم؟"

اس کی آواز خود اسے اجنبی لگی۔ وہ وجود حرکت نہیں کر رہا تھا۔ صرف وہیل چیئر کے دونوں پہیوں پر پڑتی ہوئی روشنی ہلکی ہلکی کانپ رہی تھی۔

"پلیز...ہیلپ می!"

آواز دوبارہ آئی۔ اس بار پہلے سے زیادہ قریب سے۔

"ہیلپ می..."

نجف کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے دیکھا وہیل چیئر کے پیچھے اندھیرے میں کچھ تھا۔ دو سفید نقطے۔ دو آنکھیں؟ یا روشنی کا دھوکا؟ اس نے پیچھے ہٹنا چاہا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی۔

"میڈم؟" کہیں دور سے آواز آئی۔اندھیرا ٹوٹ گیا۔

"ڈاکٹر...؟ ڈاکٹر نجف؟"

نجف نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔وہ دوبارہ اسی ہسپتال کی راہداری میں کھڑی تھی۔پیشانی پر پسینے کے باریک قطرے نمودار ہو چکے تھے۔سانس بے ترتیب تھی۔اس کا اسسٹنٹ اس کے سامنے کھڑا اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟"

نجف نے جواب نہیں دیا۔اس نے جھٹکے سے چاروں طرف دیکھا۔وہی راہداری تھی۔سفید دیواریں تھیں۔چھت پر روشنیاں بھی تھیں۔دور سے آتی قدموں کی آوازیں تھیں۔سب کچھ اپنی جگہ موجود تھا۔مگر وہیل چیئر ...وہ وہاں نہیں تھی۔نجف کی نگاہیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑیں۔

"یہاں..."اس کے لب بمشکل ہلے،"یہاں ابھی وہیل چیئر تھی۔وہ کہاں گئی؟"

اسسٹنٹ نے حیرت سے پیچھے دیکھا۔"وہ تو وارڈ بوائے لے گیا۔"

نجف نے اسے دیکھا۔"لے گیا؟"وہ چند لمحے اسے خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔

"کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے؟"

نجف نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔"ہاں... ہاں،سب ٹھیک ہے۔"البتہ آواز میں جان نہیں تھی۔وہ پلٹ گئی۔مگر اس بار اس کے قدم پہلے جیسے نہیں تھے۔وہ تیز چل رہی تھی۔پھر اس سے بھی تیز۔جیسے اسے اس راہداری سے جلد از جلد باہر نکلنا ہو۔اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل ہلکے ہلکے کانپ رہی تھی۔اور انگلیاں...وہ انگلیاں جنہوں نے صرف ایک لمحہ پہلے اس وہیل چیئر کو چھوا تھا۔اب بھی کپکپا رہی تھیں۔

نجف نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔لیکن راہداری کے دوسرے سرے پر وہی وہیل چیئر ایک دوسری جانب والی راہداری کے کنارے کھڑی تھی۔بالکل خاموش اور خالی۔اس کی پشت پر دو الفاظ کدھے تھے۔وہ پرانے ہو چکے تھے مگر غور کرنے پر اب بھی نظر آتے تھے۔دو الفاظ۔

Help Me.

☆.....☆.....☆

شبگیر ہاؤس کے پُرسکون کمرے میں شام آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ نیمل کھڑکی کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں وہی پرانی ڈائری کھلی ہوئی تھی جو عاصفہ پھوپھو نے اسے کچھ دن پہلے دی تھی۔ صفحات پر بکھرے ہوئے فارسی اشعار اور ادھورے جملے اس کی توجہ اپنے اندر کھینچے ہوئے تھے۔ کبھی وہ کسی سطر پر رک جاتی، کبھی انگلی سے لفظوں کو چھوتی اور پھر خاموشی سے اگلا صفحہ پلٹ دیتی۔ اچانک میز پر رکھا فون بج اٹھا۔ نیمل نے بے دھیانی میں فون اٹھایا۔ اسکرین پر نام دیکھتے ہی اس کی انگلی رک گئی۔ چند لمحوں تک وہ فون کو دیکھتی رہی، پھر ایک گہری سانس لے کر کال اٹھالی۔ "ہیلو۔"

دوسری طرف چند لمحوں کی خاموشی رہی۔ پھر شاہزیب کی آواز آئی۔

"خلع کے کاغذات پر دستخط کر دیے ہیں۔"

نیمل کی آنکھیں چند لمحوں کے لیے بند ہو گئیں۔ نہ حیرت ہوئی، نہ دل دھڑکا۔ بس ایک عجیب سا اطمینان اس کے اندر اترتا چلا گیا۔

"اوکے۔"

شاہ زیب ہنسا۔ "بس اتنا ہی؟ مُجھے لگا تھا شاید تمہیں کم از کم یہ احساس تو ہوگا کہ تم نے کیا کھویا ہے۔"

نیمل کے ہونٹوں پر تھکی ہوئی سی مسکراہٹ ابھری۔ "جو چیز کبھی میری تھی ہی نہیں، اسے کھونے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔"

"خیر، اب آزاد ہو تم۔ شاید یہی چاہتی تھیں۔" شاہ زیب کا لہجہ طنزیہ تھا۔ نیمل نے ڈائری بند کر کے میز پر رکھ دی۔ اس بار اس کی آواز میں نہ غصہ تھا، نہ دکھ۔

"ہاں۔ آزاد ہوں۔"

"میں نے تمہیں پورے دل سے اپنایا تھا نیمل۔ تم نے میرا دل مٹی کر دیا۔ تم پچھتاؤ گی۔"

"اب ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میری طرف سے تم سونا بنو یا مٹی، مُجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ نیمل نے فون کان سے ہٹا لیا۔ کال ابھی جاری تھی، مگر اس کے لیے وہ گفتگو ختم ہو چکی تھی۔ اس نے فون بند کیا اور چند لمحے اسے ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ اس کے سینے پر رکھا ہوا کوئی بہت بھاری پتھر ہٹ گیا تھا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں وہی دیواریں تھیں، وہی پردے، وہی میز، وہی کھڑکی۔ مگر آج سب کچھ مختلف لگ رہا تھا۔ جیسے کمرہ ذرا کشادہ ہو گیا ہو۔ جیسے ہوا میں جگہ بڑھ گئی ہو۔ جیسے وہ پہلی بار اپنے ہی وجود کے اندر پوری طرح سانس لے پا رہی ہو۔

یوں تو طلاق کا لفظ معاشرے کی زبان میں ایک داغ تھا۔ایک ایسا داغ جسے لوگ نام کے ساتھ لگا دیتے ہیں، پھر برسوں اس نام کو اسی داغ سے پہچانتے رہتے ہیں۔مگر نیمل جانتی تھی اس کے لیے یہ داغ نہیں تھا۔ یہ ایک دروازہ تھا۔ایک ایسا دروازہ جس کے دوسری طرف زندگی ابھی باقی تھی۔اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اس نے انہیں فوراً صاف نہیں کیا۔کچھ آنسو دکھ کے تھے۔اس زندگی کے جو کبھی اس نے اپنے لیے سوچی تھی اور جو کبھی اسے ملی ہی نہیں۔کچھ آنسو اس ذلت کے تھے جس سے اسے گزرنا پڑا تھا۔اور کچھ...صرف آزادی کے تھے۔وہ کمرے سے باہر نکلی۔لاؤنج سے گزرتی ہوئی جب وہ دادی کے کمرے میں پہنچی تو نہ جانے کیوں اس کے قدم رک گئے۔دادی نے اسے دیکھا پھر اسکی نم آنکھوں کو۔انکا دل ہول اٹھا۔

"کیا ہوا نیمل؟"

نیمل نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ آگے بڑھی اور جھک کر دادی سے لپٹ گئی۔دادی کے کندھے پر سر رکھتے ہی اس کے آنسو بہہ نکلے۔دادی نے گھبرا کر اس کی پشت سہلائی۔
"ارے...کیا ہوا میری بچی؟"نیمل نے آنکھیں بند کر لیں۔پھر بہت دھیمی آواز میں کہا۔

"کچھ نہیں دادی...بس...آج میں آزاد ہو گئی ہوں۔"اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔دادی کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رک گئے۔پھر انہوں نے اسے اور مضبوطی سے اپنے سینے سے لگا لیا۔نیمل کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔اسے معلوم تھا، دنیا اسے شاید طلاق یافتہ کہے گی۔شاید کچھ لوگ سوال کریں گے۔شاید کچھ نگاہیں ترس سے دیکھیں گی، کچھ طنز سے۔لیکن اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی کسی کم ظرف انسان کے نام لکھے جانے سے پہلے ہی واپس لے لی تھی۔کبھی کبھی زندگی میں سب سے بڑی خوشی کسی کو حاصل کرنا نہیں ہوتی۔کسی غلط انسان سے خود کو آزاد کر لینا ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

خان ہاؤس میں اس وقت غیر معمولی سی خاموشی تھی۔حق گاڑی سے اتر کر اندر آیا تو اسے بتایا گیا کہ مسٹر خان گھر پر نہیں ہیں۔ اس نے صرف سر ہلایا۔وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور بغیر کسی عجلت کے صوفے پر بیٹھ گیا۔چند لمحوں بعد سیڑھیوں کی طرف

سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔سلویٰ سامنے آئی۔حق کی نظر اس پر پڑی تو وہ ایک لمحے کو رک گئی۔وہ آج کچھ مختلف لگ رہی تھی۔ ہلکے رنگ کا سادہ سا لباس، پیروں میں چپل اور چہرے پر کئی دنوں بعد نظر آنے والی رونق تھی۔وہ آزاد لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر حق کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔سلویٰ نے اسے دیکھا تو اس کی بھنویں فوراً سکڑ گئیں۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

حق اسی انداز میں صوفے پر بیٹھا رہا۔اس نے چند لمحوں تک سلویٰ کو خاموشی سے دیکھا، جیسے اس کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"اپنے بیٹے کو لینے آیا ہوں۔"

سلویٰ کے چہرے کی رونق ذرا مدھم پڑی پھر وہ اس کے سامنے والے صوفے پر آ کر نفاست سے بیٹھ گئی۔"تم نے مُجھے تو نہیں بتایا آنے سے پہلے؟"

"مسٹر خان کو بتا دیا تھا۔" حق نے نظریں اس سے ہٹائے بغیر جواب دیا۔

"کامل میرا بیٹا ہے۔تم اسے لے جانے کی بات ڈیڈ سے کیسے کر سکتے ہو؟" اس بار سلویٰ کی آواز میں اعتراض تھا۔حق کی نگاہ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر ٹھہری۔پھر وہ قدرے سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"جیسے تم اسے میری اجازت کے بغیر یہاں لا سکتی ہو۔"

سلویٰ کے چہرے کا رنگ فق ہوا۔حق چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر بہت دھیمے لہجے میں بولا۔ "آئندہ ایسی غلطی مت کرنا، سلویٰ۔"

بس اتنا ہی۔مگر اس ایک جملے نے سلوی کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑا دی۔اس سے پہلے وہ کچھ کہتی دروازے کی طرف سے آیا اندر داخل ہوئی۔اس کی گود میں کامل تھا۔حق کی نظر جیسے ہی کامل پر پڑی، اس کے چہرے کی تمام سختی یک دم کہیں غائب ہو گئی۔کامل نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

"پا... پا!"

وہ آیا کی گود سے تقریباً اچھلتا ہوا حق کی طرف لپکا۔حق فوراً صوفے سے اٹھا۔اگلے ہی لمحے وہ گھٹنوں کے بل زمین پر تھا اور کامل اس کی بانہوں میں تھا۔

"میرا بچہ..."

حق نے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔اسکی خوشبو سے حق کو اپنے اندر نئی زندگی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔کامل نے دونوں بازو اس کی گردن کے گرد ڈال دیے۔حق نے اس کے بالوں پر بوسہ دیا، پھر اسے اپنے سے ذرا دور کر کے اس کا چہرہ دیکھا۔

"کیا کر رہا تھا میرا بیٹا؟"

کامل اپنی توتلی سی زبان میں کچھ کہنے لگا۔حق نے پوری توجہ سے سننے لگا، جیسے اس وقت دنیا میں اس سے زیادہ اہم کوئی بات موجود ہی نہ ہو۔سلویٰ خاموش بیٹھی انہیں دیکھتی رہی۔اس کے اندر جمع سارا خوف آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا۔اور پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔وہ جانتی تھی کہ حق، کامل سے کس قدر محبت کرتا تھا۔وہ جانتی تھی کہ کامل صرف حق کا بیٹا نہیں، اس کی زندگی تھا۔ وہ اسے اسکے باپ سے دور نہیں کر سکتی تھی۔نہ اسے کرنا چاہیے تھا۔حق کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ آگے کیا۔

"چلیں، کامل؟"

کامل نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔حق نے اس ننھے ہاتھ کو اپنی انگلیوں میں تھام لیا۔

سلویٰ بھی آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔چند لمحوں تک وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتی رہی، پھر جھجکتے ہوئے بولی۔

"کب...کب تک واپس لاؤ گے؟"

"ایک دو دن میں چھوڑ جاؤں گا۔" حق نے کامل سے نظریں نہیں ہٹائیں۔اس کے لہجے میں اب بھی وہی سکون تھا۔مگر اس بار اس سکون میں سختی نہیں تھی۔اس نے کامل کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔کامل اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔دروازے سے نکلتے ہوئے کامل نے ایک بار پیچھے مڑ کر سلویٰ کو دیکھا، ہاتھ ہلا کر بائے کہا اور پھر دوبارہ اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔حق بھی بغیر پلٹے باہر نکل گیا۔دروازہ بند ہوا تو سلویٰ وہیں کھڑی رہ گئی۔اس نے ایک گہری سانس لی۔پھر دوسری۔جیسے ابھی تک سینے میں رکی ہوئی سانس اب جا کر باہر نکلی ہو۔اس کی نگاہ دروازے پر جمی رہی۔اسے معلوم تھا کہ حق سے اس کا رشتہ ختم ہونے کے قریب تھا۔مگر کامل کا رشتہ؟ وہ صرف کاغذوں یا فیصلوں سے ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ باپ تھا۔اور کامل...اس کا اکلوتا بیٹا۔

☆.....☆.....☆

شہر کے نسبتاً پُرسکون حصے میں قائم وہ جگہ خاص طور پر ایسے بچوں کے لیے بنائی گئی تھی جہاں وہ اپنی دنیا سے کچھ دیر کے لیے باہر آ سکتے تھے۔ کشادہ ہال، بڑے صحن، رنگ برنگے جھولے، نرم فرش، چھوٹے چھوٹے کھیلنے کے گوشے اور ہر طرف بچوں کی ہنسی بکھری ہوئی تھی۔ کامل کھیلنے والے حصے میں تھا اور حق اس کے ساتھ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنا کوٹ گاڑی میں اتار کر آیا تھا۔ برفیلے رنگ کی شرٹ کے اوپری دو بٹن کھلے تھے اور آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔ دونوں گارڈ اور آیا کچھ فاصلے پر ایک طرف کھڑے تھے۔ اور اب وہ خود کامل کے کھیل کا حصہ بن چکا تھا۔ کامل کبھی گیند اس کی طرف پھینکتا، کبھی دوڑ کر اس کے پاس آتا اور پھر اچانک کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ حق ہر بار اس کے پیچھے جاتا۔ کامل ہنستا تو حق بھی بے اختیار ہنس دیتا۔ کامل نے ایک رنگین گیند اٹھا کر اس کے سینے پر ماری۔

"اچھا!" حق نے مصنوعی غصے سے آنکھیں تنگ کیں۔ "یہ حملہ تھا؟"

کامل پھر ہنس دیا۔ حق نے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ بھاگنے لگا۔ وہ بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ اس لمحے اس کے چہرے پر وہ سختی نہیں تھی جس سے لوگ اسے جانتے تھے۔ وہ بس ایک باپ تھا۔ کامل نے اچانک پلٹ کر اسے دیکھا اور دونوں بازو پھیلا دیے۔ حق نے اسے فوراً اٹھا لیا۔

"مل گیا میرا شیر!"

کامل نے اس کے گلے میں بازو ڈال دیے۔ حق نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے بالوں میں چہرہ چھپا کر ہنس دیا۔

کچھ فاصلے پر کھڑی آیا کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ دونوں گارڈ خاموشی سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ اور عین اس وقت...

باہر مرکزی دروازے پر اچانک کچھ ہلچل ہوئی۔ ایک عورت گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹی ہوئی۔ عمر نے اس کے چہرے پر گہری لکیریں چھوڑ دی تھیں، مگر اس وقت ان جھریوں میں تھکن سے زیادہ بے قراری تھی۔ اس کے ساتھ ایک کم عمر لڑکی کھڑی تھی جو بار بار گھبرا کر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ ایک گارڈ نے ہاتھ آگے بڑھا کر راستہ روک دیا۔

"آپ یہاں کی میمبر نہیں ہیں۔ آپ اندر نہیں جا سکتیں۔"

"مُجھے بس ایک بار اندر جانے دیں۔ میرا بیٹا اندر ہے۔ مُجھے اپنے بیٹے سے ضروری بات کرنی ہے۔" اس کی آواز میں ایسی التجا تھی جس نے قریب کھڑے دوسرے گارڈ کو بھی ایک لمحے کے لیے متوجہ کر دیا۔ مگر پہلے گارڈ نے سر ہلا دیا۔

"کہانا، آپ اندر نہیں جاسکتیں۔"

"پھوپھو..." لڑکی نے بے چینی سے ان کا بازو پکڑا۔ آواز میں گھبراہٹ تھی۔ "ہمیں جلد واپس جانا ہوگا۔ امی کے گھر پہنچنے سے پہلے۔"

آصفہ پھوپھو نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ اس کی نظریں اب بھی گیٹ کے اندر تھیں۔ آج بڑے دنوں بعد انہیں گھر سے نکلنے کا موقع ملا تھا اور وہ جانتی تھیں، حق ہر پندرہ دنوں بعد یہاں آتا تھا۔ اگر آج وہ اس سے نہ مل پائیں تو پھر اگلے پندرہ دن مزید انتظار کرنا ہوگا اور پھر پتا نہیں گھر سے نکلنے کا موقع ملے یا نہیں۔ ثریا چچی کی غیر موجودگی میں وہ وردہ کے ساتھ یہاں تک تو آ گئی تھیں، مگر اب وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اگر ثریا واپس آ گئی تو؟ وہ آگے کیا ہوگا، اس کا تصور ہی آصفہ پھوپھو کے لیے خوفناک تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھیں۔

"مہربانی، بھائی صاحب..." اس نے پھر منت کی۔ "مُجھے اندر جانے دیں۔"

"آپ کے بیٹے کا نام کیا ہے؟" گارڈ نے قدرے بے زاری سے اسے دیکھا۔ آصفہ پھوپھو ایک لمحے کو خاموش ہوئیں۔ جیسے اس ایک نام کو زبان پر لانے سے پہلے انہیں اپنے اندر کئی برس کا فاصلہ طے کرنا پڑ رہا ہو۔ ان کے ہونٹ کپکپائے۔

"ح...حق۔"

گارڈ نے غور سے انہیں دیکھا۔

"حق بزدار۔"

ایک دم فضا بدل گئی۔ گیٹ پر موجود دونوں گارڈز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

پھر ان کی نظریں آصفہ پھوپھو پر گئیں۔ سر سے پاؤں تک۔ اور دوبارہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پہلے گارڈ نے بے یقینی سے کہا۔

"ماں جی...آپ پاگل ہیں؟" دوسرے نے بھی انہیں عجیب نظروں سے دیکھا۔

"آپ کا ذہنی توازن ٹھیک ہے؟"

پھر دونوں کی نظر وردہ پر گئی۔ "بچے، آپ انہیں یہاں سے لے جائیں۔" ان کے لہجے میں اب سختی کے ساتھ ہمدردی بھی شامل تھی۔ "ان کا علاج کروائیں۔" وردہ کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا۔

"یہ سچ کہہ رہی ہیں!" اس نے فوراً کہا۔ "یہ واقعی ان کی ماں ہیں۔ آپ انہیں صرف ایک بار بات کرنے دیں۔"

"لیکن..." گارڈ نے کچھ کہنا چاہا۔

"خدا کے لیے، صرف ایک بار۔" آصفہ پھوپھو کی آواز بھیگ گئی۔

"آپ انہیں اندر نہیں جانے دیں گے تو کم از کم ان کے بیٹے کو اطلاع تو کر دیں۔"

دونوں گارڈ ایک بار پھر ایک دوسرے کے قریب ہوئے۔ مدھم آوازوں میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر ایک گارڈ نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ اس نے گیٹ کے اندر موجود استقبالیہ کی طرف دیکھا، پھر اپنا رابطہ آلہ نکالا۔ چند لمحے بعد اس نے استقبالیہ کا نمبر ملایا۔

"مرکزی دروازے پر ایک خاتون آئی ہیں۔" وہ آصفہ پھوپھو کو دیکھتے ہوئے رکا۔

"وہ کہہ رہی ہیں کہ..." اس کی آواز میں اچانک جھجک آ گئی۔ اس نے وردہ اور آصفہ پھوپھو دونوں کو دیکھا۔ پھر بہت احتیاط سے کہا۔

"وہ کہہ رہی ہیں کہ وہ حق بزدار صاحب کی والدہ ہیں۔"

گیٹ پر اچانک خاموشی چھا گئی جیسے کسی نے وقت روک دیا ہو۔ استقبالیہ کی ایک خاتون ملازمہ نے گھبرائے ہوئے اور محتاط قدموں سے اندر کی طرف پیش قدمی کی۔

"سر..." اس نے چند گز کے فاصلے پر رک کر، نہایت جھجکتے ہوئے پکارا حق کو پکارہ۔

حق نے کامل کی نکیلی ٹوپی درست کرتے ہوئے حق نے سر اٹھایا۔

"سر... باہر مرکزی دروازے پر ایک خاتون آئی ہیں۔" اس کی آواز میں غیر یقینی اور ڈر صاف محسوس ہو رہا تھا، "وہ کہہ رہی ہیں کہ... وہ آپ کی والدہ ہیں اور آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

حق کے چہرے کا رنگ پل کے ہزارویں حصے میں بدلا۔ پہلے اس کے گالوں کی رنگت یکلخت نچڑ گئی اور چہرہ کاغذ کی طرح سفید پڑ گیا... اور پھر اگلے ہی پل، شدید غصے نے اس کی گردن اور چہرے کو سرخ کر دیا۔ اس کے وجود کا پورا نظام جیسے الٹ پلٹ ہو گیا۔ وقت کا پہیہ گھوم کر سالوں پیچھے چلا گیا۔ ایک کشادہ، روشن کمرہ تھا... جہاں ایک بے حد خوبصورت اور نفیس عورت کے سامنے ایک خوبصورت سا بچہ کھڑا تھا۔

" کبھی مت بھولنا حق! کہ تمہیں اپنے بھائی کی حفاظت کرنی ہے...تمہاری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے، حازق کی حفاظت کرنا۔"

بچے کی چھوٹی چھوٹی بانہیں ماں کے گلے میں تنی ہوئی تھیں، مگر ان الفاظ کے ساتھ ہی بچے کے چہرے کی معصوم مسکراہٹ دھندلا گئی۔ دھیرے دھیرے، اس کی گرفت ماں کے گرد سے پھسل کر نیچے گر گئی۔

"'حازق کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں میں تمہارے لیے اہم ہوں...اور حازق میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ بس یہ بات بھولنا مت..."

بچے نے اپنے چھوٹے چھوٹے جوتوں کی نوک کو تکتے ہوئے، سر جھکا کر بہت دھیمی آواز میں اعتراف کیا تھا۔

"مُجھے بھی اہم ہونا ہے ماما...مُجھے بھی حازق جتنا پیار چاہیے۔"

ماں نے مسکرا کر بچے کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "تم تندرست ہو حق! حازق ابنارمل ہے۔ تم سمجھدار ہو...حازق نادان ہے۔"

"مُجھے بھی ابنارمل ہونا ہے! مُجھے بھی حازق والا پیار چاہیے۔"

بچے نے پہلی بار ماں کی بات کاٹ دی تھی۔ شاید اسکا دماغ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسکی ماں کا زیادہ وقت اسکے بڑے بھائی کی دیکھ بھال میں کیوں گزرتا تھا؟ وہ اسکی ماں کے لیے اسکے بڑے بھائی جتنا اہم کیوں نہیں تھا؟ اسے اپنی ماں کی ساری توجہ چاہیے تھی۔ صرف ایک دن کے لیے...! اس دن بچے کے سر پر رکھا ماں کا ہاتھ ہٹ گیا تھا۔

"تم تو سمجھدار ہو نا؟" ماں نے بچہ کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

"نہیں...مُجھے بھی حازق بننا ہے۔ میں نارمل کیوں ہو؟ مُجھے ابنارمل ہونا ہے۔"

"حق..." ماں کی غصے بھری آواز ابھری۔ "دوبارہ مت کہنا کہ تمہیں حازق جیسا بننا ہے۔" ماں مزید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر بچہ ڈبڈبائی آنکھیں لیے وہاں سے بھاگتا چلا گیا۔

"سر...سر!"

سٹاف کی اس نسوانی آواز نے حق کو اس ہولناک ماضی کی گہرائی سے کھینچ کر واپس حال میں پٹخ دیا۔ حق ساکت کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں، جیسے زندگی کا تمام توازن ہی بگڑ چکا ہو۔

"وہ...وہ خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔" سٹاف میمبر نے حق کے گرد پھیلی خوفناک خاموشی سے گھبرا کر پوچھا، "کیا انہیں اندر آنے دیں؟"

حق کو لگا جیسے اس کا سانس سینے کے اندر گھٹ رہا ہو۔اس کا پورا جسم تناؤ سے پتھر ہو چکا تھا۔اس نے اپنے پورے ضبط کو اکٹھا کرتے ہوئے سختی سے آنکھیں میچیں، پھر اپنے سوکھتے ہوئے حلق سے منہ کھول کر ایک لمبی سانس اندر کھینچی۔

"بھیج دیں۔"

صرف دو لفظی جواب۔سٹاف ممبر نے فوراً سر جھکایا اور تیزی سے واپس پلٹ گئی۔

حق نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر پیچھے مڑ کر دیکھا، جہاں آیا اور گارڈز کھڑے تھے۔

"کامل کو گاڑی میں لے جاؤ۔"

آیا نے جلدی سے کامل کو گود میں اٹھایا اور دونوں گارڈز کی حفاظت میں عقبی راستے سے باہر کی طرف نکل گئی۔اب ہال کے اس کشادہ، رنگ برنگے حصے میں صرف حق بزدار کھڑا تھا۔دوسری جانب سے بچوں کی کھیلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر... بوجھل اور شکستہ قدموں کی چاپ ابھری۔آصفہ پھوپھو چادر میں لپٹی، جھریوں زدہ چہرے اور خوف سے کانپتے ہوئے وجود کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔حق کے دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہو چکی تھیں کہ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔چاپ اسکے عقب میں آ کر ٹھہر گئی۔

"ح...حق...!"

آصفہ پھوپھو کے خشک ہونٹوں سے اس کا نام ایک التجا بن کر پھسلا۔حق نے ایک بار پھر شدتِ ضبط سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔یہ وہی نام تھا...جسے بچپن میں اس عورت کی زبان سے سننے کے لیے وہ ہر حد سے گزر جاتا تھا۔وہ اپنے بھائی سے مار کھاتا تھا اور پھر بھی مسکراتا تھا، کیونکہ دن کے اختتام پر یہی عورت اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہتی تھی...'میرا حق!' وہ اپنے بھائی کے لیے باقی لڑکوں سے لڑتا تھا جو اسے تنگ کرتے تھے اور خون آلود چہرے کے ساتھ گھر لوٹتا تھا کیونکہ اسے اس نام کی پکار چاہیے ہوتی تھی۔حق نے آہستگی سے اپنی آنکھیں کھولیں اور پلٹ گیا۔اس کے سامنے چادر میں لپٹی ہوئیں آصفہ سکندر کھڑی تھیں۔ یہ وہ خوبصورت، نفیس ماں نہیں تھی جس کے پیار کے لیے وہ سب سہتا تھا...یہ اپنے شوہر کے قتل کا جرم ثابت ہونے پر سالوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے کاٹ کر آنے والی ایک مجرمہ تھی۔ ایک ایسی عورت جس نے اپنے بیٹے کا سارا بچپن زندہ نگل لیا تھا، اس کی معصومیت اور اس کی روح کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر دیا تھا۔

"کیوں آئی ہیں آپ یہاں؟"

"مُجھے ...مُجھے تم سے بات کرنی ہے حق۔" آصفہ پھوپھو نے تڑپ کر ایک قدم آگے بڑھایا۔حق نے اپنا ایک ہاتھ ہوا میں اٹھا کر انہیں وہیں روک دیا۔اسکی گردن کی نسیں ابھری ہوئی تھیں۔

"جو کہنا ہے جلدی کہیں۔"

آصفہ پھوپھو کا چہرہ لمحوں میں زرد پڑ گیا۔حق ان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا،اس کی نظریں ان کی چادر کے نچلے کونے پر جمی ہوئی تھیں،جیسے ان سے آنکھیں ملانا بھی اس کے لیے گناہ ہو۔

"م...مُجھے معاف کر دو حق!" آصفہ پھوپھو کی آنکھوں سے پچھتاوے کا گرم پانی بہہ کر چہرے کی جھریوں میں جذب ہونے لگا۔حق نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔اس کی سرخ آنکھوں میں تعجب اور اذیت تھی۔

"معافی...؟" حق کا پورا وجود اس ایک لفظ پر لرز اٹھا۔اس کے لبوں سے اذیت بھری ہنسی نکلی۔اسکی آنکھوں کے گوشے نم تھے۔

"کس بات کی معافی چاہیے آپ کو؟ کس جرم کا حساب برابر کرنے آئی ہیں آپ؟"

آصفہ پھوپھو نے ہچکی لی۔ "حق...میں مجبور تھی..."

"مُجھے پیدا کرنے کی معافی مانگنے آئی ہیں؟" حق نے ان کی بات کاٹتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"کہ مُجھے ایک بیٹا بنا کر نہیں...صرف اپنے بیمار بچے کی حفاظت کے لیے ایک پالتو محافظ بنا کر اس دنیا میں لایا گیا تھا؟ یا میرے اس بچپن کی معافی مانگیں گی جو آپ نے حازق کے علاج اور اس کی دیکھ بھال کی بھٹی میں اپنے ہاتھوں سے جھونک دیا؟"

حق کا گلا رندھ گیا۔اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھی اتنی سختی سے بھینچی کہ ناخن ہتھیلی میں پیوست ہو گئے۔

"یا پھر...میرے باپ کے قتل کی معافی مانگیں گی؟" حق کی آواز اتنی دھیمی مگر اتنی خوفناک ہو گئی کہ آصفہ پھوپھو کے قدم پیچھے کو ہٹے۔

"آپ کس منہ سے میرے سامنے کھڑی ہیں؟ کیسی ماں تھیں آپ؟" حق کی آنکھوں کے گوشوں سے ضبط کا ایک بوجھل قطرہ ڈھلکا مگر اس کے چہرے کی سفاکی قائم رہی۔

"جس عمر میں بچے ماں کی گود میں سر رکھ کر سکون کی نیند سوتے ہیں...اس عمر میں مُجھے اپنے باپ کی لاش کے ساتھ اور اپنی ماں

کے مجرمانہ وجود کے ساتھ جینا سکھایا گیا۔" وہ جیسے سانس لینے کو رہا مگر سانس آ کب رہا تھا؟

" آپ نے میری معصومیت کھالی...آپ نے مجھ سے میری ہنسی، میرا بچپن، میرا احساس...سب کچھ چھین لیا۔"

حق کی آواز بلند ہوئی تو چند ایک لوگوں نے پلٹ کر دیکھا۔ یوں تو مشینی جھولوں کی چلنے کے شور میں اسکی آواز دب رہی تھی مگر پھر بھی چند ایک قریبی لوگوں نے اسے پہچان لیا تھا۔ آصفہ پھوپھو اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں، ان کا سر حق کے سامنے جھک چکا تھا۔

"میں جانتی ہوں میں اچھی ماں نہیں بن سکی۔"

" آپ واقعی نہیں بن سکیں۔" وہ بہت آہستہ بولا۔ آصفہ پھوپھو نے سسکی لی۔

"میں مجبور تھی، حق!"

حق کے چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آئی۔ "میں بھی بچہ تھا۔ آپ نے اتنی بڑی زمہداری میرے کندھوں پر ڈال دی۔"

آصفہ پھوپھو کا سر مزید جھک گیا۔

" آپ کو یاد ہے؟" وہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "مُجھے ہمیشہ کہا گیا کہ حازق کو میری ضرورت ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ مُجھے کس کی ضرورت ہے؟"

" حق..." آصفہ پھوپھو کا وجود تڑپ رہا تھا۔ حق انکا تابعدار بیٹا تھا۔

"میں نے آپ سے بہت کم مانگا تھا۔ بس اتنا...اتنا کہ کبھی کبھی مُجھے بھی حازق جتنا پیار کریں۔"

"میں جانتی ہوں..." آصفہ پھوپھو اب باقاعدہ رو رہی تھیں۔

"نہیں۔" حق نے آہستہ سے سر ہلایا۔ " آپ نہیں جانتیں۔ اگر جانتیں تو مُجھے یہ سیکھنے میں اتنے سال نہ لگتے کہ کسی کے لیے ضروری ہونا اور کسی کا بیٹا ہونا...دو الگ چیزیں ہیں۔"

"میں نے بہت کچھ کھویا ہے۔" آصفہ پھوپھو نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

"میں نے تو خود کو بھی کھو دیا۔" بھیانک خاموشی چھا گئی۔ آصف پھوپھو نے اپنے آنسو پونچھنے کی کوشش کی۔

" حق..." انہوں نے مزید ایک قدم آگے بڑھایا۔

" آپ کیا چاہتی ہیں؟" وہ رک گئیں۔ " کہ میں آپ کو معاف کر دوں؟" آصفہ پھوپھو سے کچھ بولا نہیں گیا۔ حق نے سر جھکا لیا۔

"شاید ایک دن کر دوں لیکن آج نہیں۔اور مُجھے نہیں معلوم وہ دن کبھی آئے گا بھی یا نہیں۔"

آصفہ کی آنکھوں سے پھر آنسو نکل آئے۔"حق...میں سزا بھگت چکی ہوں...میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں بیٹا...مُجھے ایک بار سن لو..."

"مُجھے بیٹا مت کہیے!" حق نے اپنے کوٹ کے بٹن درست کیے،اپنی آستینیں نیچے کیں اور بالکل سرد اور بے رحم لہجے میں بات جاری رکھی۔"میرا باپ...میری ماں...اور میرا بھائی...سب مر چکے ہیں۔"

آصفہ پھوپھو نے سہم کر سر اٹھایا۔

"اور میرا اس دنیا میں...اب کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔" حق نے اپنے قدم موڑے اور بغیر پیچھے مڑے،بغیر ان کی تڑپتی ہوئی آوازوں پر کان دھرے...اپنے بھاری قدموں سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔پیچھے،ہال کے درمیان میں،آصفہ پھوپھو اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ،اپنی برباد ہوئی دنیا کے کھنڈر پر تنہا اور شکست خوردہ کھڑی رہ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

شبگیر ہاؤس میں آج کئی دنوں بعد جیسے زندگی واپس لوٹ آئی تھی۔نیمل کی زندگی سے شاہ زیب کا نام اور رشتہ ختم ہو چکا تھا۔تارہ اور نوفہ لاؤنج میں قالین پر کتابیں کھولے بیٹھی تھیں۔دونوں اپنے ہوم ورک میں مصروف ہونے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں،کیونکہ ہر چند منٹ بعد ان میں سے ایک دوسرے کی کاپی میں جھانک لیتی۔

"تم نے یہ سوال کیسے کیا؟" تارہ نے نوفہ کی کاپی اپنی طرف کھینچی۔

"خود کرو۔" نوفہ نے اوپر ہاتھ رکھا۔

"مُجھے آتا ہے۔بس دیکھ رہی ہوں تم نے غلط تو نہیں کیا۔"

"تمہیں ہر چیز میں غلطی نظر آتی ہے۔" نوفہ نے فوراً اپنی کاپی واپس کھینچ لی۔قریب ہی دادی بیٹھی تھیں جبکہ نیمل اور سرمد صاحب ان کے ساتھ فیکٹری کی سنجیدہ گفتگو میں مشغول تھے۔سرمد صاحب کبھی نیمل کی طرف دیکھتے،کبھی دادی کی طرف اور کبھی آہستہ سے سر ہلا دیتے۔دوسری طرف صوفے پر نامرہ اور سلال آمنے سامنے بیٹھے تھے۔کئی دنوں بعد دونوں کی باقاعدہ بحث شروع ہوئی تھی۔اور اس گھر میں سب جانتے تھے کہ جب یہ دونوں خاموشی توڑتے تھے تو باقی سب کو خاموش تماشائی بننا پڑتا تھا۔نامرہ نے سلال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہہ دیا ہے، میں اس کھیل میں حصہ لے رہی ہوں۔" نامرہ نے بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔سلال نے اپنی کتاب سے نظریں اٹھائیں۔

"اور میں نے کہہ دیا ہے، تم نہیں لے رہی۔"

"تم ہوتے کون ہو فیصلہ کرنے والے؟"

"تمہارا بھائی۔" سلال نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"تو؟" نامرہ کی بھنویں سکڑیں۔

"تو اتنا حق تو بنتا ہے کہ تمہیں غلط فیصلہ کرنے سے روک سکوں۔"

"میرے کالج میں اسپورٹس گالا ہے، سلال۔کوئی جنگ نہیں ہو رہی۔"

"مُجھے معلوم ہے۔"

"پھر مسئلہ کیا ہے؟" نامرہ جھنجلائی۔

"مسئلہ یہ ہے کہ تم نے مُجھے بتایا ہی نہیں کہ تم نے باسکٹ بال میں نام لکھوا دیا ہے۔"

"بتانے کی ضرورت کیا تھی؟" نامرہ نے الٹا سوال کیا تو سلال نے کتاب بند کر دی۔

"کیونکہ پچھلے ہفتے تمہارا پاؤں مڑا تھا۔"

"اب ٹھیک ہے۔" نامرہ نے فوراً کہا۔

"ڈاکٹر نے کہا تھا زیادہ زور نہ دینا۔"

"کونسا ڈاکٹر؟" نامرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"آئی ایم دی ڈاکٹر! ڈاکٹر سلال شبگیر!"

"صرف ایک دن کا میچ ہے وہ بھی گالا کے آخری دن۔تب تک تو ٹھیک ہو جائے گا۔" نامرہ نے معاملہ سدھارنے کے لیے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

"تم سے بحث کرنا واقعی اپنے آپ کو سزا دینے کے برابر ہے۔" سلال نے طنز کیا۔

"تو مت کرو۔" نامرہ نے ایک پاؤں صوفے سے نیچے لٹکایا۔

"میں نہیں کروں گا۔" سلال نے ایک لمحہ توقف کیا۔"میں سیدھا کیس کروں گا۔"

"ڈیفنس لائر ہے میرے پاس ہے۔"

"تمہاری لائر پریکٹس چھوڑ چکی ہے۔" اس بار سلال نے نیمل پر طنز کیا مگر نیمل نے جیسے سنا ہی نہیں البتہ نامرہ کے چہرے کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہوئی۔

"وہ میری بہن ہے۔"

"وہ تمہیں بچانے کے لیے دوبارہ پریکٹس شروع نہیں کرے گی۔" اس نے آج جانے کیا کھایا تھا۔

"سلال!" نامرہ نے اسے روکنا چاہا۔

" کیا؟ حقیقت ہی تو بتا رہا ہوں۔"

نامرہ نے پاس پڑا کشن اٹھالیا۔ "اگر تم نے مزید ایک لفظ بولا تو..."

"یہ بھی اپنے کیس کی فہرست میں شامل کرلوں گا۔" سلال نے کمال بے نیازی سے جواب دیا۔

" تمہیں ہر بات میں کیس کیوں نظر آتا ہے؟"

" کیونکہ تم ہر روز کوئی نہ کوئی جرم کرتی ہو۔"

"میرا اسپورٹس گالا خراب کیا تو یاد رکھنا، میں تمہارے خلاف بھی مقدمہ دائر کردوں گی۔" نامرہ نے انگلی اٹھا کر وارن کیا۔

"میں گھر سے بھاگ جاؤں گا۔"

اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا مگر نامرہ کے ساتھ ساتھ سرمد صاحب سے سنجیدگی سے گفتگو کرتی نیمل بھی چونک گئی۔

"سلال..." نیمل نے بے یقینی سے اسے پکارا۔

"ارے بھئی مزاق کر رہا ہوں۔ میں اپنی بہنوں کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ سکتا ہوں؟" اس نے مصالحت بھرے انداز میں کہا تو نیمل سر جھٹک کر واپس سرمد صاحب کی طرف متوجہ ہوگئی البتہ سلال اور نامرہ کی چوں چوں آہستہ آہستہ جاری تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کا ایک بجنے والا تھا۔ گھر کی بیشتر روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ بچوں کے کمروں کے دروازے بند تھے اور پورا گھر دن بھر کی ہلچل کے بعد جیسے گہری نیند کی تیاری کر رہا تھا۔ صرف لاؤنج کی ایک جانب زرد روشنی جل رہی تھی۔ وہاں دادی اور سرمد

صاحب اب بھی جاگ رہے تھے۔ان کے درمیان مصالحوں کی ترکیبی نوٹ بک کھلی پڑی تھی،جس کے ایک طرف مختلف اجزاء کے نام لکھے تھے اور دوسری طرف مقداریں۔

سرمد صاحب نے قلم ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

"اگر اس بار ذائقہ ذرا تیز ہو گیا تو؟"

دادی نے فوراً سر اٹھایا۔"تو تھوڑا زیرہ کم کرنا۔"

"لیکن پچھلی بار آپ نے کہا تھا زیرہ بڑھاؤ۔"

"پچھلی بار تم نے مرچ زیادہ ڈال دی تھی۔"

سرمد صاحب نے ایک لمحے کو سوچا۔"اچھا...تو مسئلہ مرچ کا تھا؟"

دادی نے انہیں ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پچھلے چالیس برس میں یہ بات کم از کم چار سو مرتبہ سمجھا چکی ہوں۔

"تم مصالحہ بناتے ہو یا صرف میری باتیں بھولنے کا کاروبار کرتے ہو؟"

سرمد صاحب ہنس دیے۔ان کے مصالحوں کی خاص بات ہی یہی تھی کہ عام پاکستانی ذائقے کے ساتھ ان میں نیپالی ذائقے کی ایک ہلکی سی جھلک ہوتی تھی۔وہ خوشبو،وہ تیکھا پن اور اجزاء کا تناسب،سب کچھ دادی کی نیپالی یادداشت سے آتا تھا۔دادی کبھی کسی خشک جڑی بوٹی کا نام بتاتیں،کبھی کسی بیج کی مقدار کم کرنے کا مشورہ دیتیں اور سرمد صاحب پوری سنجیدگی سے نوٹ کرتے جاتے۔

"یہ والا ذرا بھون کر ڈالنا۔"

"کتنی دیر بھوننا ہے؟"سرمد صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آنکھ سے اندازہ کرنا۔"دادی نے سکون سے جواب دیا۔

"اماں،کاروبار آنکھ کے اندازے پر نہیں چلتا۔"سرمد صاحب نے قلم روک دیا۔

"تو پھر اپنی ماں کی آنکھ پر اعتبار کرنا سیکھو۔"دادی نے گھڑکا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"وہ خاموش ہو گئے۔اسی لمحے بیرونی دروازہ کھلا۔چند لمحوں بعد سقراط اندر داخل ہوا۔اس کی نظر لاؤنج میں بیٹھی اماں اور سرمد صاحب پر پڑی تو وہ ایک لمحے کو رک گیا۔رات کا ایک بجنے والا تھا۔دونوں ابھی تک مصالحوں کی مجلس

سجائے بیٹھے تھے۔سقراط نے قدرے حیرت سے انہیں دیکھا، پھر سلام کیا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" دادی نے منہ بنا کر جواب دیا۔وہ ابھی تک اس سے ناراض تھیں۔

سرمد صاحب نے گھڑی کی طرف دیکھا۔پھر سقراط کی طرف۔

" کہاں تھے تم؟" لہجے میں بڑے بھائی والی پوچھ گچھ کم اور ناراضی زیادہ تھی۔

"ادھر ہی تھا۔" وہ مزید وضاحت کیے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ سرمد صاحب نے پیچھے طنز کا نشتر چلایا۔

"مُجھے لگا سسرال گئے ہوگے، حاضری دینے۔"

سقراط کا دوسرا قدم سیڑھی پر اٹھتے اٹھتے رک گیا۔چند لمحے وہ وہیں کھڑا رہا۔پھر آہستہ سے پلٹا۔اس نے سرمد صاحب کو دیکھا۔

" آپ کا سسرال بھی تو وہی ہے۔آپ کیوں نہیں جاتے حاضری دینے؟"

اس نے لفظ حاضری پر خاصا زور دیا۔لاؤنج میں ایسی خاموشی چھائی جیسے کسی نے مصالحوں کی پوری ترکیب میں نمک کے بجائے بارود ڈال دیا ہو۔سرمد صاحب کو شاید اس بدلحاظی کی توقع نہیں تھی۔وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"دیکھ رہی ہیں اماں اسے؟" انہوں نے فوراً دادی کی طرف دیکھا۔"دیکھ رہی ہیں آپ اس کی زبان؟ کس قدر بدلحظ ہو چکا ہے۔"

سقراط نے لب بھینچ لیے۔اسے بھی فوراً اندازہ ہو گیا تھا کہ تیر کچھ زیادہ ہی نشانے پر لگ گیا تھا۔ دادی نے پہلے سرمد صاحب کو دیکھا، پھر سقراط کو۔چند لمحے دونوں کو خاموشی سے دیکھنے کے بعد انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"اگر تم دونوں نے میری پسند سے شادی کی ہوتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"

" کیا اماں یار..." دونوں بیٹوں نے بے اختیار سر پہ ہاتھ رکھا۔لیکن دادی اب رکنے والی نہیں تھیں۔

"میں نے دونوں کے لیے کتنے اچھے رشتے دیکھے تھے۔ایک نے اپنی مرضی کر لی، دوسرے نے بھی۔اب بیٹھو اور بھگتو۔"

سقراط نے سرمد صاحب کی طرف دیکھا۔سرمد صاحب نے سقراط کو دیکھا۔اس بحث میں اماں سے بھلا کون جیت سکتا تھا؟

جواب دونوں کو معلوم تھا۔کوئی نہیں۔سقراط نے خاموشی سے پہلا قدم دوبارہ سیڑھی پر رکھا۔سرمد صاحب نے بھی فوراً رخ موڑ لیا۔

"شب بخیر!"

وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔دادی نے حیرت سے دونوں کو جاتے دیکھا۔ایک بیٹا سیڑھیوں کی طرف بھاگ رہا تھا۔ دوسرا اپنے کمرے کی طرف۔دونوں یوں فرار ہوئے جیسے انہوں نے مصالحوں کی ترکیب نہیں،ان کے نکاح نامے نکال لیے ہوں۔چند لمحوں بعد لاؤنج پھر خاموش ہو گیا۔دادی نے سامنے پڑی ترکیبی نوٹ بک کو دیکھا۔پھر خالی صوفے کو۔پھر سیڑھیوں کی طرف۔اور آخر کار گہری سانس لے کر بڑبڑائی۔

"مُجھے کیا..."انہوں نے نوٹ بک بند کی۔"میری تو اس گھر میں کوئی قدر ہی نہیں ہے۔"

کوئی جواب نہیں آیا۔وہ مزید دکھی ہوئیں۔

"جس دن مر جاؤں گی نا..."انہوں نے ذرا اونچی آواز میں کہا،"پھر احساس ہو گا سب کو!"

اوپر سیڑھیوں سے سقراط کے قدم ایک لمحے کو رکے۔دوسری طرف اپنے کمرے میں جاتے ہوئے سرمد صاحب بھی ٹھٹکے۔ دونوں نے بیک وقت آسمان کی طرف دیکھا۔مگر کسی نے واپس آ کر دادی کو جواب دینے کی حماقت نہیں کی۔دادی نے چند لمحے انتظار کیا۔پھر خود ہی ناک سکیڑ کر بولیں۔

"ہونہہ۔کسی کو کوئی فکر نہیں۔"

اور مصالحوں کی وہ ترکیبی نوٹ بک اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئیں۔آخر ماں تھیں۔اور انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اگلی صبح بیٹے کو یہی ترکیب دوبارہ چاہیے ہو گی۔

☆.....☆.....☆

"عالیہ بی بی صاحب آپ کو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔" ملازم کی اطلاع پر عالیہ کی چھٹی حس فوراً جاگ اٹھی۔ اس گھر میں باپ کا بلانا کبھی محض بلانا نہیں ہوتا تھا۔ خاص طور پر جب اسے اکیلے بلایا جائے۔ عالیہ نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں، پھر گہری سانس لے کر ان کے کمرے کے دروازے تک پہنچی اور ہلکی سی دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ شمس بزدار اپنی میز کے پیچھے بیٹھے کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں معمول کی خاموشی تھی۔ عالیہ چند قدم اندر آئی اور رک گئی۔

"آپ نے بلایا؟"

انہوں نے فوراً جواب نہیں دیا۔ وہ ایک کاغذ سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگے۔ پھر دوسرا کاغذ اٹھایا۔

"آج کل تم بہت مصروف رہنے لگی ہو۔"

عالیہ نے ان کے لہجے کو سمجھنے کی کوشش کی پھر لہجے کو نارمل کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کالج کی پڑھائی میں..."

"صرف پڑھائی؟" شمس بزدار نے اسکی بات کاٹ دی۔ وہ خاموش رہی تو شمس بزدار نے کاغذ میز پر رکھ دیا۔

"مُجھے رپورٹ ملی ہے کہ آج کل تم دشمنوں کے ساتھ بہت زیادہ بات چیت کر رہی ہو۔"

عالیہ کا دل ڈوب کر ابھرا۔ آخر کار بات یہاں تک پہنچ ہی گئی تھی۔

"وہ دشمن نہیں ہے۔" وہ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ شمس بزدار نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اسکے پیروں کو چھوتی ہوئی لمبی قمیص اور آدھ کھلے بالوں میں وہ الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

"تو پھر کون ہے؟"

"وہ میرا کلاس فیلو ہے، ڈیڈ۔"

"تو یہ روز روز کی گفتگو، ساتھ بیٹھنا، ایک دوسرے کے معاملات میں دلچسپی لینا... یہ سب کیا ہے؟"

انکا لہجہ ایسا تھا کہ عالیہ کے اندر کئی دن سے دبا ہوا غصہ سر اٹھانے لگا۔ "آپ کو میری ہر بات کی رپورٹ کون دیتا ہے؟"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ شمس بزدار کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے سختی اتری۔

"سوال کا جواب سوال سے مت دو۔"

"میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ میری زندگی کا کون سا حصہ آپ کی نظروں سے چھپا ہوا ہے؟" عالیہ نے اس بار نظریں اٹھا کر

پوچھا۔اسکی آنکھیں طیش سے سرخ ہورہی تھیں۔اسکا چہرہ شدت ضبط سے اپنی رنگت بدل رہا تھا۔

"عالیہ!" وہ دبی دبی سی آواز میں دھاڑے۔عالیہ ایک قدم پیچھے ہوئی،مگر نظریں نہیں جھکائیں۔

"وہ میرا کلاس فیلو ہے،ڈیڈ۔میں اس سے بات کیوں نہیں کرسکتی؟"

" کیونکہ وہ ہمارا دشمن ہے۔"

"وہ خود میرا دشمن نہیں ہے۔" وہ دوبدو بولی۔

"یہ فیصلہ تم کروگی؟" شمس بزدار نے نخوت سے پوچھا۔

"تو پھر کون کرے گا؟" عالیہ نے مٹھیاں بھینچ لیں۔اسکی گردن کی نسیں واضح ہوئیں۔شمس بزدار اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"عالیہ تمہیں اندازہ بھی ہے تم کس خاندان..."

"میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔اس خاندان میں انسان سے پہلے اس کا خاندان دیکھا جاتا ہے۔اس کی نیت سے پہلے اس کا نام دیکھا جاتا ہے۔اوراس سے بات کرنے سے پہلے اسکا مقام دیکھا جاتا ہے۔"

شمس بزدار نے خاموشی سے اسکی بات سنی پھر آہستہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئے۔

"میں نے تمہیں کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔تمہیں باہر جانے کی اجازت دی،اعلیٰ تعلیم حاصل کی اجازت دی،اپنی پسند کے شعبے میں آگے بڑھنے دیا۔"

"آپ نے اجازت دی ہے؟" عالیہ استہزائیہ بولی۔اس کی آواز میں اب نمی تھی،مگر لہجہ واضح تھا۔

"آپ نے مُجھے زندگی جینے کی اجازت نہیں دی،ڈیڈ۔آپ نے بس مُجھے زندہ رہنے کی اجازت دی ہے۔"

"تم حد پار کررہی ہو۔" شمس بزدار کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"میں حد کے اندر رہی ہوں۔اسی لیے تو سانس گھٹتی ہے۔" عالیہ کا گلا رندھ گیا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔عالیہ کی آنکھوں میں آنسو آچکے تھے،مگر وہ انہیں گرنے نہیں دے رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں میری ہر حرکت کی خبر آپ تک پہنچتی ہے۔مُجھے نہیں معلوم کون دیتا ہے۔مُجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میرے فون سے لے کر کالج تک کون میری نگرانی کرتا ہے۔لیکن اتنا جانتی ہوں کہ اگر مُجھے معلوم ہوگیا نا..." وہ رک گئی۔نظریں اٹھا کر شمس

بزدار کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

"تمہیں دھمکی دینے کی عادت کب سے ہوگئی ہے؟" ان کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

"میں دھمکی نہیں دے رہی۔ میں صرف یہ بتا رہی ہوں کہ میں تھک گئی ہوں۔ ایک دن میری ہمت ٹوٹ جائے گی اور پھر سب کچھ غلط ہوگا۔"

کمرے میں پھر خاموشی پھیل گئی۔ شمس بزدار نے ایک گہری سانس لی۔

"میں بس چاہتا ہوں کہ تم سلال سے دور رہو۔"

ان کی بات پر عالیہ نے فوراً سر اٹھایا۔ "میں ایسا کیوں کروں؟"

"کیونکہ میں کہہ رہا ہوں۔"

"یہ وجہ میرے لیے کافی نہیں ہے۔" یوں تو اسکی سلال سے نہ اتنی بے تکلفی تھی اور نہ ہی دوسری مگر شمس کا اسے یوں بار بار کہنا عالیہ کو زچ کر رہا تھا۔

"وہ تمہیں استعمال کر سکتا ہے۔" انہوں نے مزید پر ہاتھ رکھا۔

"آپ مُجھے خود فیصلہ کرنے دیں۔"

"تمہیں اپنے فیصلوں کا اندازہ نہیں ہے تم ابھی بچی ہو۔"

"کیونکہ آپ نے کبھی مُجھے فیصلہ کرنے دیا ہی نہیں۔" شمس بزدار لمحہ بھر کو خاموش ہو گئے۔ عالیہ نے آہستگی سے بات جاری رکھی۔

"آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔ آپ کو کبھی مجھ پر بھروسہ نہیں تھا۔"

"مُجھے دنیا پر بھروسہ نہیں۔"

"دنیا میں میں بھی شامل ہوں۔؟"

اس سوال نے شمس بزدار کو دوبارہ خاموش کر دیا۔ عالیہ نے چند لمحے ان کے چہرے کو دیکھا، پھر نظریں جھکا لیں۔ انہوں نے اس بار قدرے نرم مگر قطعی لہجے میں کہا۔

"مُجھے مایوس مت کرنا، عالیہ۔"

عالیہ کے ہونٹ ہولے سے کپکپائے۔ "میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتی۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ "لیکن ہر بار آپ

کی توقع پوری کرنے کے لیے اگر مُجھے خود کی نظروں میں گرنا پڑے تو میں کیا کروں؟" وہ رک گئی۔
"مُجھے میری زندگی جینے دیں ڈیڈ! میں آپ سے اور کچھ نہیں مانگوں گی۔" آخری جملے پر اسکی آواز بھرا گئی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ شمس بزدار اپنی جگہ کھڑے اسے جاتے دیکھتے رہے۔ اور عالیہ راہداری میں آ کر چند لمحے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ واقعی کسی گھر میں نہیں بلکہ ایک خوبصورت پنجرے میں قید تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کافی گزر چکی تھی۔ کمرے کی بیشتر روشنیاں بند تھیں اور صرف ایک زردسی روشنی صوفے کے قریب رکھے لیمپ سے پھیل رہی تھی۔ اس کے سامنے میز پر چند کاغذات رکھے تھے۔ خلع کے کاغذات۔ ہاں سلویٰ نے بھیج دیے تھے۔ حق کافی دیر سے انہیں دیکھ رہا تھا، جیسے کاغذ پر لکھی ہوئی چند سطریں کسی قانونی فیصلے سے زیادہ اس کے سامنے اس کی پوری زندگی رکھ رہی ہوں۔ اس نے پہلا صفحہ دوبارہ اٹھایا۔ نام، دستخط، تاریخ اور شرائط۔ اس کی نظریں ایک ایک سطر پر ٹھہرتی گئیں۔ سلویٰ نے اس سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ نہ کوئی مالی حق۔ نہ جائیداد میں حصہ اور نہ کسی قسم کا معاوضہ۔ صرف ایک بات بار بار واضح کی گئی تھی۔ کامل کے معاملات میں حق کی حیثیت اور اختیار برقرار رہے گا۔ حق کی انگلی کاغذ کے ایک کونے پر رک گئی۔ اس نے گہری سانس آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جانے کتنے برس پیچھے چلا گیا۔ اس کی ماں اپنے باپ کے سامنے کھڑی تھی۔
"مُجھے خلع چاہیے امام!"
اور اس کے باپ کا جواب آج بھی اسے یاد تھا۔
"اس گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے تمہیں۔"
بچپن میں حق ان الفاظ کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔ وہ صرف یہ سمجھتا تھا کہ اس کی ماں بہت روتی تھی۔ آج اسے اس بات کا مطلب سمجھ آیا تھا۔ لیکن ایک سوال یہ بھی تھا کہ اگر کوئی عورت کسی رشتے میں نہیں رہنا چاہتی تو اسے وہاں رکھا کیوں جاتا ہے؟ اس وقت وہ بہت چھوٹا تھا۔ آج وہ بڑا ہو چکا تھا۔ مگر اس سوال کا جواب اب بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ حق نے آنکھیں کھول لیں۔ اس نے کاغذات دوبارہ دیکھے۔
"عورت کو قید کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔"

یہ بات وہ جانتا تھا۔اس نے آخری صفحہ دوبارہ کھولا۔کامل کے متعلق لکھی گئی چند شرائط دوبارہ پڑھیں۔پھر کاغذات میز پر رکھ دیے۔اس سے پہلے وہ کچھ کرتا،اسی لمحے میز پر رکھا ہوا پرانا کی پیڈ موبائل فون بج اٹھا۔اس نے فون اٹھالیا مگر کہا کچھ نہیں۔ دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔پھر ایک غیر فطری سی آواز سنائی دی۔

"بزدار صاحب۔" حق کے ماتھے پر شکن نمودار ہوئی۔

"اگلے چند دن آپ کی بیوی کے لیے بہت اہم ہیں۔" حق سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"اپنی بیوی کا خیال رکھیے گا۔"

اور پھر کال منقطع ہوگئی۔حق نے چند لمحوں تک فون کان سے لگائے رکھا۔پھر آہستہ سے اسے نیچے کیا۔اس کی نگاہ سامنے خالی دیوار پر جم گئی۔اس کے ذہن میں کئی باتیں ایک دوسرے سے جڑنے لگیں،مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔وہ اٹھا اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔باہر شہر کی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے واپس آکر اپنا فون اٹھایا اور سلویٰ کا نمبر ملایا۔کچھ دیر بعد فون اٹھالیا گیا۔

"پیپرز مل گئے تمہیں؟" سلویٰ چھوٹتے ہی پوچھا۔

"مل چکے ہیں۔میں تمہیں آزاد کر دوں گا لیکن..." حق نے بات اُدھوری چھوڑی تو سلویٰ کا جیسے سانس اٹک گیا۔

"لیکن کیا؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"میری بات مانو تو گھر سے باہر مت نکلو۔"

یہ سنتے ہی دوسری جانب سلویٰ کے چہرے پر تمسخر ابھرا۔وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔شب خوابی کے ڈھیلے لباس میں وہ فون کان اور کندھے کے درمیان ٹکائے اپنے ہاتھوں پر لوشن مسل رہی تھی۔

"تم مُجھے ڈرا رہے ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں تم ہی مُجھے مارنا چاہتے ہو؟"

یہ سنتے ہی حق کے جبڑے بھنچ گئے۔

"تم ایک بے وقوف عورت ہو سلویٰ!" وہ سرد لہجے میں بولا تو سلویٰ کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"جانتی ہوں،تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہو پائی کیونکہ تمہارا دل تو آج بھی ایک ذہین لڑکی کا اسیر ہے۔"

اس بار سلویٰ نے لحاظ بلائے طاق رکھتے ہوئے چوٹ کی تو حق پل بھر کو ساکت رہ گیا۔بزدار پیلس کے اونچے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے حق بزدار کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" وہ دبے دبے سے لہجے میں غرایا۔

"چچ چچ...افسوس کہ میری ضد نے تم سے تمہاری محبت چھین لی۔خیر...اب تم بھی آزاد ہو جاؤ گے اور وہ تمہاری 'پرفیکٹ گرل' بھی آزاد ہو چکی ہے۔یو گائیز کین..."

ٹوں...ٹوں...ٹوں...سلویٰ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی حق فون کاٹ چکا تھا۔اس نے فون کی اسکرین دیکھتے ہوئے اسے مٹھی میں بھینچ لیا۔سلویٰ بے وقوف ہی نہیں کم ظرف بھی تھی۔جبکہ دوسری جانب خان ہاؤس کے کشادہ کمرے میں بیڈ پہ بیٹھی سلویٰ نے تعجب سے فون کو دیکھا۔

" لگتا ہے زخم آج بھی تازہ ہے۔"اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا اور فون کو وہیں چھوڑ کر بیڈ سے اٹھ گئی۔بس چند دن...اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

☆.....☆.....☆

دوسری جانب شہر کے ایک نسبتاً گمنام حصے میں موجود ایک عمارت کی بالائی منزل پر نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔کمرے میں روشنی کم تھی،مگر دیواروں پر لگی ہوئی درجنوں اسکرینیں مسلسل روشن تھیں۔کسی پر سڑک کا منظر تھا۔کسی پر ہسپتال کی عمارت۔

کسی پر چند لوگوں کی نقل وحرکت۔اور کسی پر صرف اعداد وشمار چل رہے تھے۔

ایک شخص ان سب کے درمیان خاموش بیٹھا تھا۔اس کے سامنے ایک بڑی اسکرین تھی۔میز پر ایک مائیک رکھا تھا،جس کے ساتھ آواز بدلنے والا آلہ لگا ہوا تھا۔

"اپنی بیوی کا خیال رکھیے گا۔"یہ آخری الفاظ تھے جو اس نے کہے تھے اور پھر آلہ بند کیا۔وہ چند لمحے اسکرین کو دیکھتا رہا۔پھر کرسی سے پیچھے ٹیک لگا لی۔پہلے اسکے بال نمایاں ہوئے پھر چہرے کی سانولی رنگت اور پھر نقوش...وہ طالب تھا۔طالب سکندر!

صحافت کی دنیا میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرنے والا وہی طالب جسے لوگ ابھی تک صرف ایک نوجوان صحافی سمجھتے تھے۔مگر آج اس کی میز پر صرف خبر نہیں تھی۔کسی کا بدلہ تھا۔اور ایک پرانا حساب تھا۔طالب نے ایک ایک کر کے اسکرینیں بند کرنا شروع کیں۔کمرہ آہستہ آہستہ اندھیرے میں ڈوبتا گیا۔آخری اسکرین بند کرنے سے پہلے اس نے چند لمحے اس پر نظریں جمائے رکھیں۔پھر بہت دھیمی آواز میں گویا ہوا۔

"جو تم لوگوں نے میری پھوپھو کے ساتھ کیا ہے...اس کا حساب تو بنتا ہے۔"

اس نے میز سے اپنا بیگ اٹھایا۔ کندھے پر ڈالا اور کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد اسکی موٹر سائیکل عرب ٹاؤن کی گلیوں میں داخل ہوئی۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ اس نے سکندر ہاؤس کے سامنے موٹر سائیکل روکی۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ پھر بڑا گیٹ کھولا اور موٹر سائیکل گیراج میں کھڑی گاڑی کے قریب کھڑی کر دی۔ لاؤنج میں خاموشی تھی۔ اس نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا۔ مگر بیٹھنے کے بجائے سیدھا آصفہ پھوپھو کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر رک کر ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے کمزور سی آواز آئی۔

"آجاؤ۔"

طالب اندر داخل ہوا۔ کمرے میں مدھم روشنی تھی۔ آصفہ پھوپھو بستر پر نیم دراز تھیں۔ چند دن پہلے تک ان کے چہرے پر جو زندگی تھی، وہ جیسے کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ بیماری اور حق سے ملنے کے بعد ذہنی صدمے نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔ چہرہ زرد تھا، آنکھوں کے نیچے ہلکے گہرے تھے اور ہاتھوں میں پہلے جیسی طاقت نہیں رہی تھی۔ طالب نے انہیں دیکھا تو اس کے قدم خود بخود آہستہ ہو گئے۔ وہ بستر کے قریب بیٹھ گیا۔

"پھوپھو..." اس نے دھیمے سے پکارہ۔ آصفہ پھوپھو نے آنکھیں پوری کھولنے کی کوشش کی اور پھر تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

"تم آ گئے؟"

"جی آ گیا ہوں۔" طالب نے ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ کچھ لمحے وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"آپ کو حق سے ملنے نہیں جانا چاہیے تھا۔"

"وہ میرا بیٹا ہے، طالب!" آصفہ پھوپھو کی آنکھیں نم ہو گئیں جبکہ طالب خاموش رہا۔

"میں کیسے بھول جاؤں؟" ان کی آواز بھیگنے لگی۔ "لوگ کہتے رہے کہ بھول جاؤ۔ جو ہو گیا اسے دفن کر دو۔ مگر ماں اپنے بچے کو کیسے دفن کرتی ہے؟"

"لیکن آپ وہاں اکیلی چلی گئی تھیں۔ آپ کو مُجھے بتانا چاہیے تھا۔" طالب نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"میں اکیلی نہیں تھی۔" انہوں نے کمزور سی مسکراہٹ کے ساتھ وردہ کا ذکر کیے بغیر کہا۔

"اور اگر وہاں آپ کے ساتھ کچھ ہو جاتا تو؟"

"میرے ساتھ مزید کچھ برا نہیں ہو سکتا طالب! جو بھی کیا ہے، میں نے خود کیا ہے۔" آصفہ پھوپھو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مُجھے ان سب پر بہت غصہ آتا ہے۔" طالب خود کو کہنے سے نہیں روک پایا۔

"حق پر بھی؟" آصفہ پھوپھو نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ طالب نے آہستہ سے سر اٹھا کر ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

"حق پر بھی۔" آصفہ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اداسی ابھری۔

"وہ برا نہیں ہے طالب!"

"وہ بہت برا ہے پھوپھو!" طالب نے تلخی سے مسکرایا۔

" کبھی کبھی اچھے لوگ بھی غلط خاندان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ میرا اچھا بیٹا ہے۔"

"اور میں آپ کا بھتیجا ہوں۔" طالب نے ان کا ہاتھ اپنے ماتھے سے لگا لیا۔ "اسی لیے آپ کو دوبارہ کسی کے سامنے ہاتھ جوڑتے نہیں دیکھ سکتا۔"

آصفہ پھوپھو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "طالب... بدلہ لینے کی کوشش مت کرنا۔"

"بدلہ نہیں ہے پھوپھو! بس کچھ حساب کتاب کرنے ہوں گے۔" اس نے پھوپھو کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"مُجھے کسی حساب کی ضرورت نہیں۔ مُجھے صرف میرا بیٹا چاہیے۔" یہ سن کر طالب کا چہرہ نرم پڑ گیا۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر جھک کر ان کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"مل جائے گا۔" آصفہ پھوپھو نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ " کیسے؟"

" آپ نے مُجھے ہمیشہ سکھایا ہے نا، پھوپھو... کہ کچھ چیزیں مانگنے سے نہیں ملتیں۔ ان کے لیے کھڑا ہونا پڑتا ہے۔" طالب کی آواز بہت دھیمی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب آپ آرام کریں۔" وہ ان پر چادر درست کرتے ہوئے پلٹ گیا۔

"طالب..." وہ دروازے تک پہنچ کر رک گیا۔ آصفہ پھوپھو نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"خود کو مت کھونا۔"

طالب چند لمحے خاموش رہا۔ پھر ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی۔

" آپ کے لیے جو بھی کروں گا، پھوپھو... خود کو نہیں کھوؤں گا۔" وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہوا تو آصفہ پھوپھو کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے طالب کے چہرے پر اب وہ معصومیت نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے

تک اس کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ وہ رک کر اپنے موبائل کی اسکرین دیکھنے لگا۔
پھر اس نے فون کی اسکرین بند کر دی اور کمرے کو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ دروازہ بند ہو گیا اور لاؤنج میں خاموشی چھا گئی۔

☆.....☆.....☆

صبح کی دھوپ صحن کے راستے لاؤنج کی کھڑکی سے چھن کر فرش پر بکھری ہوئی تھی، اور گھر میں ایک مدت بعد ایک ہلکی پھلکی اور پرسکون فضا کا احساس ہو رہا تھا۔ سرمد صاحب صبح ہی فیکٹری جا چکے تھے جبکہ نامرہ اور سلال اپنے اپنے کالج تھے۔ آج اسکول کی چھٹی ہونے کی وجہ سے تارہ اور نوفہ دونوں گھر پر ہی تھیں۔ نیمل تیار سی لاؤنج میں کھڑی تھی۔ ایک طویل عرصے کے بعد آج وہ اپنے چہرے پر تازگی اور سکون لیے گھر سے باہر نکلنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کا خوبصورت لباس زیبِ تن کر رکھا تھا جس پر ہلکے گلابی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول بنے تھے، اور شانے پر گلابی رنگ کا دوپٹہ سلیقے سے پھیلا ہوا تھا۔ اسکے سیاہ بال کمر پر بکھرے ہوئے تھے۔ عام نقوش اور چھوٹی آنکھوں والی نیمل اس وقت اچھی لگ رہی تھی۔
لاؤنج کی شیشے والی میز پر اس کا ہینڈ بیگ رکھا تھا، اور وہ ایک کھلی ڈائری پر پینسل سے تیزی سے کچھ لکھ رہی تھی۔
"یہ میں نے نجف خالہ کا نمبر لکھ دیا ہے..." نیمل نے ڈائری پر سے نظریں اٹھائے بغیر پرسکون آواز میں کہا، "اگر کوئی ایمرجنسی ہو اور سلال فون نہ اٹھائے، تو خالہ کو فون کر لینا۔"
صوفے پر بیٹھی دادی نے جیسے ہی نجف کا نام سنا، ان کے ابرو تن گئے۔ نیمل نے بنا دیکھے بھی دادی کے چہرے کے بگڑتے تاثرات محسوس کر لیے تھے، مگر اس نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔

"میں دو تین گھنٹوں تک آ جاؤں گی..." اس نے ڈائری بند کرتے ہوئے کہا۔ آج وہ بہت دنوں بعد اپنے پرانے قانونی ساتھیوں سے ملنے جا رہی تھی، اور اس کی آنکھوں کی روشنی بتا رہی تھی کہ یہ مختصر سا فرار اس کی ذہنی تھکن کے لیے کتنا ضروری تھا۔ اس نے لاؤنج کے ایک کونے میں رکھی استری اسٹینڈ کے دراز سے سٹرپسلز (Strepsils) کی ایک ڈبی نکالا اور دادی کی طرف بڑھائی۔
"اور دادی! یہ لیں سٹرپسلز... آپ کے گلے کی خراش کے لیے۔ میں شام میں آ کر آپ کو قہوہ بنا دوں گی۔"

دادی نے ہاتھ نہیں بڑھایا تو نیمل نے انہیں میز پر رکھ دیا۔ دادی نے ایک نظر میز پر رکھی سٹر پیسلز کو دیکھا، اور پھر جھٹکے سے اپنا رخ دوسری طرف موڑ لیا۔ ان کی خفت اور ناراضی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ نیمل نے اپنے ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ ضبط کی۔

"آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں آپی!" تارہ نے صوفے پر سے نیمل کے سراپے کو سراہتے ہوئے معصومیت سے تعریف کی۔

نیمل مسکرا دی۔

"چلو اب...تم دونوں دادی کا خیال رکھنا، میری کیب آ چکی ہے۔"

اس نے میز پر سے اپنا بیگ اٹھایا اور ہلکے قدموں سے باہر کی جانب چل دی۔ لاؤنج کا بھاری دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ نیمل کے جاتے ہی لاؤنج میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ دادی نے عینک درست کی، صوفے سے ذرا آگے کو جھکیں اور میز پر کھلی اس نوٹ بک کو دیکھا جس پر نجف کا نمبر صاف جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ پھر انہوں نے یکدم گردن موڑ کر صوفے کے دوسرے کونے پر بیٹھی اپنی دونوں پوتیوں کو سخت نظروں سے گھورا۔

"خبردار! جو تم دونوں میں سے کسی نے اسے فون کیا۔"

انہوں نے اپنی شہادت کی انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔ تارہ اور نوفہ، جو پہلے ہی ان کی خفا صورت کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں، ایک ساتھ صوفے سے اٹھیں اور دادی کے دائیں بائیں بیٹھ کر ان کے گلے سے لپٹ گئیں۔

"نہیں کرتے دادی... بالکل نہیں کرتے۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ دادی کے چہرے کی سختی اس پیار پر لمحوں میں پگھل گئی۔

"ہاں ٹھیک ہے...بس بس، چھوڑو اب مُجھے!"

"دادی! کوئی کہانی سنائیں نا..." تارہ نے دادی کے شانے پر اپنا سر ٹکایا اور لاڈ سے بولی۔

"یہ کوئی کہانی سننے کا ٹائم ہے بھلا؟ دن کے بارہ بج رہے ہیں اور انہیں کہانیاں سوجھ رہی ہیں۔ چلو ٹی وی لگاؤ۔"

تارہ نے منہ بسورتے ہوئے ٹی وی لگا دیا۔ دادی نے سٹر پیسلز کا پتا اٹھایا اور صوفے سے ٹیک لگا کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ کمالہ بیگم کو بھلا کسی ڈاکٹر کی کیا ضرورت؟

☆.....☆.....☆

شہر کے مرکزی حصہ میں واقع وکلاء کے چیمبرز کی قدیم سرخ اینٹوں والی عمارت کے وسیع لان میں زندگی اپنی معمول کی چہل پہل کے ساتھ جاری تھی۔ لان کے ایک سرے پر بنے پرانے، گھنے برگد کے درخت کی چھاؤں میں نیمل اپنی دو وکیل ساتھیوں ماہم اور زویا کے ساتھ لوہے کے بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کتنے ہی عرصے بعد آج نیمل کے چہرے پر شاداب مسکراہٹ تھی۔ اپنی خلع کی حتمی منظوری کے بعد، آج وہ پہلی بار اندر سے واقعی آزاد محسوس کر رہی تھی۔ اسی اثنا میں، چیمبرز کی بیرونی فصیل کے ساتھ بنی لوہے کی گرل کے باہر ایک سیاہ رنگ کی چمکتی ہوئی گاڑی آ کر رکی۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر حق بیٹھا تھا۔ سلویٰ کے بھیجے گئے خلع کے نوٹس پر وہ اپنے سینئر کونسل سے کیس کی قانونی باریکیوں پر بات کرنے یہاں آیا تھا۔ گاڑی کے سیاہ شیشوں کے پار سے اس کی سرد اور تھکی ہوئی نگاہیں لان پر پڑیں... اور وہیں ٹھہر گئیں۔ گاڑی کا شیشہ نیچے پھسلتا چلا گیا۔

درخت کے نیچے نیمل بیٹھی تھی۔ کھلی ہوا میں سانس لیتی، مسکراتی، آزادی کے نکھار سے دمکتی ہوئی نیمل شگیر۔ تبھی عمارت کے مرکزی دروازے سے ایک ادھیڑ عمر وکیل باہر نکلے۔ ہاتھ میں چمڑے کا سیاہ بریف کیس تھامے بیرسٹر طاہر تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے گرل کے باہر کھڑی حق کی گاڑی کی طرف بڑھے۔ سیاہ فام گاڑی کا یوں وکلاء کے بلاک کے باہر آ کر رکنا لان میں بیٹھی ماہم کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا۔ اس نے جوس کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے گاڑی کو دیکھا اور پھر نیمل کی طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولی۔

"آج کل تو پورے لیگل سرکل میں حق بزدار کی ڈائیورس کی خبریں گرم ہیں۔ انکی بیوی نے خلع کا دعویٰ دائر کر دیا ہے۔"

نیمل نے چونک کر ماہم کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں شدید حیرت ابھری۔

"ڈرائیورس؟ لیکن تمہیں کیسے پتا؟"

ماہم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شانے اچکائے۔ "وکلاء کی اس دنیا سے بھی بھلا کوئی بات چھپی رہی ہے؟ خبریں تو ہوا کی طرح اڑتی ہیں، خاص کر جب معاملہ بزدار خاندان کا ہو۔"

اسی اثنا میں، بیرسٹر طاہر گاڑی کے قریب پہنچے اور پچھلا دروازہ ادھ کھلا کر کے اندر جھکے۔ اور ٹھیک اسی لمحے... ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ نیمل کی نگاہیں بے ساختہ سڑک کے کنارے کھڑی اس سیاہ گاڑی پر جا ٹکیں۔ حق کی نگاہیں بھی شیشے کے پار سے سیدھی نیمل سے ملیں۔ فاصلے کے باوجود، چند لمحوں کے لیے وقت جیسے ساکت ہو گیا۔

"شادی مبارک ہو، حق بزدار...!"

آج حالات کی بساط الٹ چکی تھی۔جس بندھن کا طوق نیمل کے گلے میں تھا، وہ اس سے آزاد ہو کر مسکرا رہی تھی...اور جس شادی کی مبارکباد نیمل نے حق کو دی تھی، وہ آج خلع کے کاغذات کی صورت میں اس کے ہاتھوں میں راکھ بن چکی تھی۔حق نے نیمل کی گہری نگاہوں کا دباؤ محسوس کیا۔اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور سیاہ گوگلز اپنی آنکھوں پر جما لیا۔گاڑی کا سیاہ شیشہ اوپر ہوتا گیا۔ڈرائیور نے ایکسلریٹر پر پاؤں رکھا، اور وہ سیاہ گاڑی ایک زناٹے کے ساتھ سڑک پر آگے بڑھ گئی۔نیمل کی نگاہیں ساکت رہیں۔وہ سڑک کے اس موڑ کو تکتی رہی جہاں گاڑی ایک کالے دھبے کی طرح اوجھل ہو چکی تھی۔

"نیمل...؟" زویا نے اس کے شانے کو ہلکا سا چھوا، جس سے نیمل کا دھیان ٹوٹا۔

"تم اپنے چیمبر میں واپس کب آ رہی ہو؟ ہم سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

نیمل نے ایک گہری سانس خارج کی، اپنے بالوں کو سمیٹ کر شانے پر ڈالا اور دور سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

نجف بزدار اپنی میٹل ڈیسک پر رکھی دوائیوں کے سٹاک کی فائنل لسٹ اور ایمرجنسی رپورٹس پر سائن کر رہی تھی۔اسی اثنا میں، ٹیبل پر رکھا اس کا ذاتی فون بج اٹھا۔

سکرین پر ایک انجان نمبر چمک رہا تھا۔نجف نے ایک نظر دیکھا اور نظر انداز کر کے دوبارہ فائل پر پین چلا دیا۔مگر کال کٹتے ہی فون دوبارہ بجنے لگا۔مسلسل تین بار فون گھنٹیاں بجاتا رہا تو نجف نے زچ ہو کر پین رکھا اور کال ریسیو کر کے فون کان سے لگایا۔

"ہیلو...؟" نجف کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"ہیلو...! نجف خالہ؟...میں نوفہ بات کر رہی ہوں۔"

آواز کے ساتھ ہی نجف کے ہاتھ میں پکڑا پین لمحے بھر کو رک گیا۔اس کے چہرے کی سردی غائب ہوئی اور وہ فوراً کرسی کی پشت سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"نوفہ؟...سب خیریت تو ہے نا؟"

"خالہ! گھر پر کوئی نہیں ہے۔سلال بھائی فون نہیں اٹھا رہے، نیمل آپی کا نمبر نہیں لگ رہا...وہ...وہ دادی نے دو گھنٹوں میں

سٹر پیسلز کی سولہ گولیاں کھالی ہیں جبکہ ڈبی پر لکھا ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں بارہ سے زیادہ نہیں کھا سکتے۔ خالہ! اب کیا ہوگا؟ کیا دادی مرنے والی ہیں؟"

نوفہ کی آواز میں ایسا خوف اور افراتفری تھی کہ نجف ایک لمحے کو بالکل ہک بک رہ گئی۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ دادی ٹی وی دیکھتے دیکھتے نیمل کی رکھی ہوئی سٹر پیسلز کی ڈبی کو ٹافیاں سمجھ کر ایک کے بعد ایک چبا کر صاف کر چکی تھیں۔ جب تارہ نے صوفے پر پڑی خالی ڈبی اٹھائی اور اسکی نظر پیچھے لکھی پر ہدایات پڑی تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"دادی! یہ کیا کیا آپ نے؟ آپ نے ساری گولیاں کھالیں؟" تارہ نے ہاتھ میں خالی بلسٹر پکڑ کر ہولناک نگاہوں سے دادی کو دیکھا تھا۔ دادی نے عینک کے اوپر سے خالی ڈبی دیکھی، ان کی اپنی آنکھیں پھیل گئیں۔

" کیا لکھا ہے اس پر؟"

"یہی کہ آپ کو ساری نہیں کھانی چاہئیں تھیں دادی! کیا آپ... کیا آپ مر جائیں گی؟" تارہ نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

دادی تلملا اٹھیں۔ "ارے مریں میرے دشمن! میرے پوتے کو فون ملاؤ۔"

سلال نے فون نہیں اٹھایا، نیمل کا نمبر آؤٹ آف کوریج جا رہا تھا۔ ادھر گولیوں کے تیز مینتھول اور اینٹی سیپٹک نے دادی کے معدے میں ایسی آگ لگائی کہ ان کے سینے میں شدید جلن شروع ہوگئی۔

"ہائے میری سینے میں آگ لگ رہی ہے... ارے نوفی! مُجھے پانی لا دو۔" دادی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ خود بھی اندر سے بری طرح ڈر چکی تھیں۔ تارہ نے دادی کا لال ہوتا چہرہ دیکھا تو اس کے ہاتھ سے فون چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"دادی! آپ کو ہارٹ اٹیک تو نہیں ہو رہا؟ نوفہ! دیکھو... دادی کو ہارٹ اٹیک آ رہا ہے۔ ٹھہرو، میں چیٹ جی پی ٹی سے پوچھتی ہوں کہ ہارٹ اٹیک آئے تو کیا کرتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی دادی نے تارہ کی کمر پر ایک زوردار دھموکا جڑا۔ "نانہجار! پہلے پانی لا کر دو۔"

نوفہ بھاگ کر کچن سے پانی لے آئی، مگر اسی دوران تارہ کی نظر میز پر کھلی اس نوٹ بک پر پڑی جہاں نیمل جلی حروف میں نجف کا نمبر لکھ کر گئی تھی۔ تارہ نے لپک کر نوٹ بک اٹھائی۔

"نجف خالہ کو فون کر لیں؟"

دادی نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے، جلتے سینے کے ساتھ تڑپ کر کہا۔

"ہرگز نہیں! اس بزدارنی کو فون کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"دادی! آپ کو اپنی زندگی پیاری ہے یا ایگو؟" تارہ نے لال آنکھوں سے دادی کو دیکھا۔ اور دادی کے مزید کچھ بولنے سے پہلے ہی تارہ نے نمبر ڈائل کر کے فون نوفہ کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ ہسپتال کے آفس میں بیٹھی نجف کو اب فون کے سپیکر سے دادی کی دھیمی اور سراسیمہ آواز سنائی دے رہی تھی۔

"سنو نوفی! میرا نام مت لینا... کہنا کہ کسی سہیلی کی دادی نے کھائی ہیں۔"

"لیکن ہماری سہیلی کی دادی تو پہلے ہی مر چکی ہے۔" تارہ نے منہ پر ہاتھ رکھا۔

"دادی! گولیاں تو آپ نے ہی کھائی ہیں نا... اب میں خالہ سے جھوٹ بولوں؟" نوفہ نے فون پر روہانسی آواز میں کہا۔ فون کے دوسری طرف، سی ایم او کے دفتر میں بیٹھی نجف کے چہرے پر غیر متوقع مسکراہٹ ابھر آئی۔ نجف نے اپنی آواز کو نپا تلا اور پرسکون بناتے ہوئے کہا۔

"نوفہ! میری بات غور سے سنو... بالکل گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سٹرپسلز کھانے سے کوئی نہیں مرتا۔"

"سچ میں خالہ؟" نوفہ نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں! ان گولیوں میں مینتھول ہوتا ہے۔ جب زیادہ کھالیں تو معدے میں شدید تیزابیت اور جلن ہوتی ہے۔ جو تم لوگوں کو ہارٹ اٹیک لگ رہا ہے، وہ صرف معدے کی گیس اور جلن ہے۔"

" کیا کہہ رہی ہے وہ؟ زہر تو نہیں پھیل رہا نا؟" سپیکر سے دادی کی اونچی آواز پھر ابھری۔

"دادی! آپ دو منٹ خاموش رہیں نا، خالہ کو بولنے دیں۔" تارہ نے دادی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ نجف کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

"نوفہ! دادی سے کہو ایک بڑا گلاس ٹھنڈا دودھ یا پانی پی لیں، اور اب اگلے چوبیس گھنٹے ایک بھی گولی نہ لیں۔ گھر میں سیرپ یا اینٹاسڈ پڑا ہو تو ایک چمچ پلا دو۔ کوئی ایمرجنسی نہیں ہے، وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

نوفہ کے سانس میں سانس آئی۔ "تھینک یو نجف خالہ! آپ بہت اچھی ہیں..."

" کچھ نہیں اچھی! فون بند کرو نوفی، ورنہ وہ ہمیں احساسِ کمتری میں مبتلا کر دے گی۔" پیچھے سے دادی کی کڑکدار آواز آئی۔

"دادی! احساسِ احسان ہوتا ہے وہ۔" تارہ نے چڑتے ہوئے کہا۔

"خالہ! دادی کہہ رہی ہیں فون بند کرو..." نوفہ کہہ رہی تھی اور اس سے پہلے کہ نجف کچھ اور کہتی، دوسری طرف سے کھٹاک کی آواز کے ساتھ کال کٹ گئی۔ نجف نے خاموش ہو چکے فون کو کچھ دیر اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا۔ اس کے چہرے پر چھایا تناؤ غائب ہو چکا تھا، اور اس کی جگہ اپنائیت پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے پُرسکون سانس خارج کی، فون میز پر رکھا اور چہرے پر مسکراہٹ لیے دوبارہ رپورٹس پر سائن کرنے میں مصروف ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

ریستوران کے نسبتاً تاریک کونے میں بیٹھی نجف کی ساری توجہ اپنے سامنے کھلے ہوئے لیپ ٹاپ پر مرکوز تھی۔ اس نے بیٹھنے کے لیے جان بوجھ کر ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں لوگوں کی آمد و رفت کم تھی اور کسی کی نگاہ بار بار اس کی اسکرین پر نہ پڑتی۔ میز پر لیپ ٹاپ کے ساتھ ایک موٹی فائل کھلی ہوئی تھی۔ اس کے چند صفحات پرانے طبی ریکارڈ کی نقول تھے، کچھ پر اس کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے سوالات اور چند پر ایسے واقعات کی تفصیلات جنہیں اب تک کسی تسلی بخش وضاحت کے ساتھ جوڑا نہیں جا سکا تھا۔ آج وہ اپنی دوست سارہ سے ملنے والی تھی جس کو پہنچنے میں ابھی وقت تھا۔ نجف نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور پھر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کبھی وہ کسی سطر کو نقل کر کے اپنی فائل میں درج کرتی، کبھی کسی پرانی تحقیق کا حوالہ کھولتی اور کبھی نوٹ بک میں لکھے کسی سوال کے گرد دائرہ کھینچ دیتی۔ اس کے ذہن میں کئی سوال ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔ اس نے انگلیوں سے پیشانی دبائی۔

پچھلے چند دنوں سے نیند پوری نہ ہونے کے باعث اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی اتر آئی تھی۔ وہ تھک چکی تھی، لیکن اس کے پاس رکنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اسے جواب چاہئیں تھے۔ اور اب اسے یہ بھی جاننا تھا کہ ان جوابوں تک پہنچنے سے پہلے اسے اور کتنی چیزیں کھونی پڑیں گی۔ اچانک اسے اپنے اوپر کسی کی نگاہوں کا احساس ہوا۔
ایسا نہیں تھا کہ کوئی راہ چلتا شخص اتفاقاً اس کی طرف دیکھ رہا ہو۔ یہ احساس مسلسل تھا۔ گہرا اور بے تکلف، جیسے کوئی کافی دیر سے اسے دیکھ رہا ہو اور اب اس کے ردعمل کا منتظر ہو۔ نجف کی انگلیاں رک گئیں۔ اس نے پہلے اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر پہلو میں دیکھا۔ پھر آہستہ سے سر اٹھایا۔ اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میز کے دوسری طرف ایک شخص بیٹھا تھا۔

بھڑ کیلے، بھدے میک اپ سے اٹا ہوا چہرہ، ضرورت سے زیادہ گہری سرخ لپ اسٹک، آنکھوں کے گرد پھیلا ہوا سیاہ رنگ اور مصنوعی پلکوں کے نیچے سے جھانکتی ہوئی آنکھیں۔ اس کے بال عجیب سے انداز میں بندھے تھے اور رنگین کپڑوں پر سستا چمک دار کام تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے وہ کسی محفل میں نہیں، کسی تماشے کے انتظار میں بیٹھا ہو۔ وہ اسے پہچانتی تھی۔ یہ وہی خواجہ سرا تھا جس نے اسے بہت تنگ کیا تھا۔ نجف کا گلا خشک ہو گیا۔

"تم؟" اس کے منہ سے بمشکل آواز نکلی۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اس نے اپنی آواز کو معمول پر رکھنے کی کوشش کی، مگر آخری لفظ پر اس کی گھبراہٹ نمایاں ہو گئی۔ سامنے بیٹھے شخص نے گردن ایک طرف جھکائی، پھر اپنے دانتوں کی پوری قطار دکھاتے ہوئے مسکرایا۔

" کیسی ہے، ملکانی؟"

نجف نے ایک لمحے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ ریستوران میں لوگ موجود تھے۔ چند میزوں پر خاندان بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، کھڑکی کے پاس دو نوجوان اپنے فون میں مصروف تھے اور کاؤنٹر پر کھڑا ملازم کسی گاہک کا بل بنا رہا تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ صرف اس کی میز پر بیٹھا ہوا شخص معمول کا حصہ نہیں لگ رہا تھا۔

"تم یہاں کیسے آئے؟" نجف نے قدرے سختی سے پوچھا۔ "تم میرا پیچھا کر رہے ہو؟"

"چل نا ملکانی اب تو اتنی سندر بھی نہیں کہ روشن تیرا پیچھا کرے۔" اس نے ہاتھ نچا کر ادائے بے نیازی سے کہا۔ نجف نے بے اختیار اپنے سامنے پڑی فائل بند کرنے کی کوشش کی، مگر اس کی انگلیاں کاغذوں کے کناروں میں الجھ گئیں۔ اس نے فائل کو اپنی طرف کھینچا اور لیپ ٹاپ کی اسکرین نیچے گرا دی۔ اب وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟ مجھ پر نظر رکھتے ہو؟"

"لو کر لو بات! اب ہم اپنی مرضی سے کہیں بیٹھ بھی نہیں سکتے؟" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ادا سے کہا۔ "ہائے اللہ، اتنی بے رخی! اور ہم تو سوچ کر آئے تھے کہ ملکانی سے دو گھڑی پیار محبت کی باتیں کریں گے۔"

"روشن، بکواس بند کرواور بتاؤ یہاں کیوں آئے ہو؟" نجف نے اسے اس بار، اسکے نام سے پکارہ۔

"آے ہائے! نام بھی یاد ہو گیا ہمارا۔" وہ خوش ہو کر تالیاں بجانے لگا۔ "سہیلیو، سن لو! ملکانی کو روشن یاد ہے! اب تو روشن کی زندگی کامیاب ہو گئی۔"

چند لوگوں نے پلٹ کر انکی جانب دیکھا۔ دیکھ تو پہلے بھی رہے تھے۔ نجف نے اسے گھورا۔ روشن نے فوراً اپنی ہنسی سمیٹی، ذرا آگے جھکا اور آواز دھیمی کر لی۔

"میری جگہ کب چھوڑ رہی ہے ملکانی؟"

"کیا بکواس ہے یہ؟ تم ہر بار یہ جملہ کیوں دہراتے ہو؟" نجف نے میز پر ہاتھ مارا۔ اسکا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا جبکہ روشن کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"چل ایک بات بتا ملکانی؟ تو اپنے شوہر سے کتنی باتیں کرتی ہے؟" نجف کا دل ایک بار پھر زور سے دھڑکا۔

"اس سے تمہارا کیا تعلق؟"

"تعلق میرا نہیں، تیرا ہے ملکانی! شادی تو نے کی ہے، میں نے نہیں۔" روشن نے بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میری شادی کو درمیان میں مت لاؤ۔" نجف نے فوراً ٹوکا۔

"میں نہیں لا رہا ملکانی! تیری شادی خود درمیان میں کھڑی ہے۔" اس نے انگلی اٹھا کر نجف کی طرف اشارہ کیا۔

"تو اپنی زندگی کے جواب کمپیوٹر میں ڈھونڈ رہی ہے، پرانی فائلوں میں کھوج رہی ہے، لوگوں کے پاس جا رہی ہے مگر ایک شخص ہے، جس کے گھر میں تیرا جواب تیرا انتظار کر رہا ہے۔"

نجف کی پیشانی پر شکنیں گہری ہو گئیں۔ "کون؟"

روشن نے ایسے آنکھیں پھیلائیں جیسے نجف نے دنیا کا سب سے احمقانہ سوال پوچھ لیا ہو۔ "ارے، تیرا شوہر ملکانی! اور کون؟" وہ ہنستا گیا اور نجف کے چہرے کا رنگ سفید پڑ چکا تھا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے صدمے کی سی کیفیت میں روشن کو دیکھا۔

"دیکھ ملکانی، سچ جاننا ہے نا؟ تو جا، اپنے شوہر کے گھر! وہیں کھلے گی تیرے رازوں کی پوٹلی۔" نجف ساکت رہ گئی۔ روشن نے اپنا پرس اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔

"کافی لے کر جا رہا ہوں۔بل دے دینا ملکانی! روشن کسی کے ساتھ فری میں نہیں بیٹھتا۔" وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔روشن نے کاؤنٹر پہ کافی کا آڈر دیا۔نجف سن سی بیٹھی رہی۔چند لمحوں بعد اس نے کافی کا کپ اٹھایا، پھر مڑ کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ ویٹر نے نجف کو دیکھا تو اس نے سر ہلا دیا اور روشن ہاتھ ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

نجف نے آنکھیں بند کر لیں۔اسے پہلی بار شبگیر ہاؤس جانے کی خواہش ہو رہی تھی۔اگر روشن جھوٹ بول رہا تھا تو اس کے پاس کھونے کو کچھ نہیں تھا۔لیکن اگر وہ سچ کہہ رہا تھا...تو پھر جس شخص کے ساتھ وہ اپنی زندگی گزارنے جا رہی تھی، شاید وہ اس کی زندگی کے سب سے بڑے راز کا محافظ تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ اسی رات کی بات تھی، نجف کے کمرے میں اس رات معمول سے زیادہ خاموشی تھی۔میز پر کھلا ہوا لیپ ٹاپ روشن تھا اور اس کی اسکرین پر ایک ویڈیو چل رہی تھی۔

وہ جو محسوس کرتی تھی، وہ آخر تھا کیا؟ ہر بار کسی کو چھونے کے بعد چند لمحوں کے لیے حقیقت کا غائب ہو جانا، اندھیرے میں کسی واقعے کا نمودار ہونا، ایسی آوازیں جن کا اس لمحے کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور پھر واپس اسی جگہ آ کھڑا ہونا جہاں وہ چند لمحے پہلے موجود تھی۔وہ ڈاکٹر تھی۔اس لیے وہ ان چیزوں کو محض وہم کہہ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہتی تھی۔اسی لیے اس نے میڈیکل ریسرچ، نفسیاتی بیماریوں، اور Touch سے وابستہ غیر معمولی تجربات اور تاریخ میں درج ایسے واقعات کے بارے میں پڑھنا شروع کر دیا تھا جنہیں کبھی بیماری کہا گیا، کبھی وہم اور کبھی ایسی چیز جس کی کوئی واضح سائنسی توجیہ سامنے نہ آ سکی۔میز پر ایک موٹی فائل بھی کھلی پڑی تھی۔اس کے اندر پرانے کاغذات، چند چھپے ہوئے تحقیقی صفحات، تاریخوں کے ساتھ درج واقعات اور ہاتھ سے کیے گئے چند نوٹس تھے۔اسی دوران کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔نیلوفر بیگم اندر داخل ہوئیں۔ وہ کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑی رہیں۔آج وہ یہاں کسی جھگڑے یا بحث کے لیے نہیں آئی تھیں۔وہ اپنی بیٹی سے بات کرنا چاہتی تھیں۔ناراضیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ایک دوسرے کے درمیان جو فاصلہ پہلے صرف خاموشی تھا، اب دیوار بن چکا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ آج اس دیوار میں کوئی دراڑ پڑے۔

"نجف؟"

کوئی جواب نہیں آیا۔انہوں نے کمرے میں نظر دوڑائی۔کمرہ خالی تھا۔پھر باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز سنائی دی۔نیلوفر

بیگم واپس جانے کے لیے پلٹیں اور پھر ان کی نگاہ میز پر پڑی۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر چلتی ہوئی ویڈیو نے ان کے قدم روک دیے۔ وہ بے اختیار چند قدم آگے بڑھیں۔ اسکرین پر کسی پرانے واقعے کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔

"بعض افراد نے دعویٰ کیا کہ کسی شخص کو چھونے کے فوراً بعد انہیں ایسی تصاویر یا مناظر دکھائی دیے جو اس وقت موجود نہیں تھے۔ بعض واقعات میں بعد میں ہونے والے حادثے کی تفصیلات بھی..."

بس ایک لمحہ اور نیلوفر بیگم کا چہرہ بدل گیا۔ وہ لیپ ٹاپ کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر میز پر رکھی فائل کی طرف دیکھا۔ ان کی انگلیاں جیسے خود بخود فائل کی طرف بڑھیں۔

انہوں نے پہلا صفحہ اٹھایا پھر دوسرا، تیسرا اور پھر وہ صفحے پلٹتی چلی گئیں۔ ان کی سانسیں آہستہ آہستہ تیز ہونے لگیں۔ کچھ ایسے الفاظ جنہیں دیکھ کر ان کے ہاتھ رک گئے۔ پہلے ان کے چہرے پر پہلے بے یقینی ابھری۔ پھر خوف۔ اور پھر... بے تحاشہ غصہ۔ انہوں نے فائل کے مزید صفحات پلٹنے شروع کر دیے۔

"نہیں... ایسا نہیں ہو سکتا۔"

بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا۔ پھر انہوں نے ایک صفحہ دوبارہ کھولا۔ اسے غور سے پڑھا۔ ان کی انگلیاں کانپنے لگیں۔

باتھ روم کا دروازہ کھلا۔ نجف، سفید رنگ کے باتھ روب میں باہر نکلی۔ اس کے بال تولیے میں لپٹے ہوئے تھے۔ اس نے چلتے چلتے تولیہ بالوں سے نکالا تو بال کندھوں پر بکھر گئے۔ اس کی نظر نیلوفر بیگم پر پڑی تو وہ ٹھٹک گئی۔

"آپ یہاں؟" پھر اس نے میز کی طرف دیکھا۔ نیلوفر بیگم فائل ہاتھ میں لیے کھڑی تھیں۔ نجف کے چہرے سے رنگ اتر گیا۔

"خیریت ہے؟" اس نے اگلا سوال کیا۔ نیلوفر بیگم نے جواب نہیں دیا۔ وہ فائل کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر آہستہ سے پلٹیں۔ "یہ سب کیا ہے نجف؟"

"آپ کو کیا نظر آ رہا ہے؟"

"مُجھے یہ نظر آ رہا ہے کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

نجف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاصی پرسکون نظر آتی تھی۔

"ایک ڈاکٹر ہو کر تم کن چیزوں میں پڑ گئی ہو؟"

"میں جواب تلاش کر رہی ہوں۔"

" کیسے جواب؟" نیلوفر بیگم نے فائل میز پر دے ماری۔

"جو کچھ میرے ساتھ کچھ ہو رہا ہے۔"

" کہا نا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اور کچھ بھی نہیں..."

" آپ کو پتا بھی ہے میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟" نجف کی آواز پہلی بار بلند ہوئی۔

اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ "میری زندگی کیسے بدل گئی ہے؟"

یہ سنتے نیلوفر بیگم نے رخ پھیر لیا۔ "تم نے خود بدلی ہے اپنی زندگی۔ اس آدمی سے شادی کر کے۔"

نجف نے انہیں تاسف سے دیکھا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر اس نے لب آپس میں بھینچ لیے۔

"ہم نے تمہیں کیا کم دیا تھا؟ تمہیں کس چیز کی کمی تھی؟ مگر تم نے اپنی مرضی سے ایک ایسا فیصلہ کیا جس نے سب کچھ بدل دیا۔

اب جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا الزام بھی ہمیں دو گی؟"

"میں نے آپ کو کوئی الزام نہیں دیا۔" وہ حلق میں پھنسے آنسوؤں کے گولے کو ضبط کرتی ہوئی بولی۔

"پھر کیا چاہتی ہو؟" نیلوفر بیگم کا لہجہ ابھی بھی طنزیہ تھا۔

"میں چاہتی تھی آپ میری بات سنیں..." پس منظر میں ابھی بھی لیپ ٹاپ سے ابھرنے والی آوازیں گونج رہی تھیں۔ نجف نے آگے بڑھ کر لیپ ٹاپ کی اسکرین گرا دی۔

"میں بہت سن چکی ہوں۔" نیلوفر بیگم نے اپنے ہاتھ اٹھایا تو انکا سلک کا کافتان لہرایا۔

" آپ نے کبھی نہیں سنا۔" نجف نے سر ہلایا۔ "میں خود سے ڈرنے لگی ہوں۔"

نیلوفر بیگم کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے کچھ ابھرا۔ خوف؟ وحشت؟ یا پھر کچھ اور... مگر وہ فوراً چھپ گیا۔

" تمہیں اپنے فیصلوں کے نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔" وہ گردن اکڑا کر بولیں تو نجف نے انہیں خالی نظروں سے دیکھا۔

"میرا دل کرتا ہے میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں۔"

"تو چلی جاؤ۔" وہ اسی انداز میں بولیں تو نجف جیسے جم گئی۔ پچھلے دس سال سے وہ سزائیں بھگت رہی تھی۔ ایک غلط شخص سے محبت کی سزا، اپنی بہن کی زندگی تباہ کرنے کی سزا، کسی اور کا دل اپنے سینے میں لیے پھرنے کی سزا، اور اب؟ اسی کم ظرف شخص سے نکاح کی سزا۔ ساری سزائیں اسکے حصے میں کیوں آئی تھیں؟ وہ بے یقنی سے اپنی ماں کو دیکھے گئی جسے اپنی بیٹی سے زیادہ اپنا سرکل عزیز تھا۔

"تمہیں جانے کے لیے بھی اسی کا گھر ملے گا۔"

نیلوفر بیگم مزید کچھ کہہ رہی تھیں مگر نجف کی آنکھوں میں انکا وجود دندھلا گیا۔ نیلوفر بیگم نے گہری سانس لی اور لہجہ نرم کرتے ہوئے فائل کی جانب انگلی اٹھائی۔

"اپنے آپ کو ان چیزوں میں مت الجھاؤ۔ تم ڈاکٹر ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ذہن انسان کے ساتھ کیا کیا کھیل کھیل سکتا ہے۔"

"اور اگر یہ میرے ذہن کا کھیل نہیں ہوا تو؟" وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھے گئی۔ نیلوفر بیگم ٹھہر سی گئیں۔

"اگر واقعی کچھ ایسا ہوا جسے آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں تو؟"

نیلوفر بیگم کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے خوف بجلی کی طرح لپکا۔ صرف ایک لمحہ۔ پھر وہ پلٹ گئیں۔

"اپنے وہم میں جیتی رہو۔" وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔ نجف وہیں کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ دروازہ کھلا۔ نیلوفر بیگم باہر نکل گئیں۔ دروازہ بند ہوا۔ اور اسی لمحے ان کے چہرے سے غصہ غائب ہو گیا۔ جیسے وہ غصہ صرف ایک نقاب ہو۔ انہوں نے راہداری میں دو قدم آگے بڑھائے اور پھر رک گئیں۔ ایک ہاتھ گردن پر رکھا، پھر چہرے پر۔ ہتھیلی نم تھی۔ انہیں پسینہ آ گیا تھا۔ ان کی سانسیں بے ترتیب ہو گئیں۔ راہداری سنسان تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئیں۔ مگر خاموشی انہیں سکون نہ دے سکی کیونکہ برسوں پرانی ایک آواز اچانک ان کی سماعت میں ابھرنے لگی۔ پہلے وہ آواز دور تھی۔ پھر قریب آئی پھر اتنی قریب جیسے کوئی عین ان کے پیچھے کھڑا ہو۔

"میری بات سنو، نیلوفر!"

نیلوفر بیگم نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کے قدم جیسے زمین میں جم گئے۔ آواز دوبارہ آئی۔

"مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے۔" ان کی سانس رکنے لگی۔

"میرے ساتھ کچھ برا ہو رہا ہے..." نیلوفر بیگم نے بے اختیار پیچھے دیکھا۔ راہداری خالی تھی۔ مگر آواز رکنے والی نہیں تھی۔

"میں تمہاری بہن ہوں، نیلوفر..." ان کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔

"تمہیں میرا یقین کرنا چاہیے تھا۔"

نیلوفر بیگم نے دونوں ہاتھ اپنی سماعت پر رکھ لیے۔ وہ آواز ماضی سے نہیں آ رہی تھی۔ وہ ماضی ان کے اندر سے نکل کر ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ اور جتنا وہ تیزی سے راہداری میں آگے بڑھ رہی تھیں، اتنی ہی تیزی سے وہ آواز ان کے قریب آ رہی تھی۔

جبکہ نجف اپنے کمرے میں وہیں ساکت کھڑی رہی تھی۔ گیلے بالوں سے پانی کے چند قطرے اس کے سفید باتھ روب میں جذب ہو چکے تھے مگر اسے اپنے وجود کی ٹھنڈک کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر میز پر بکھری ہوئی اس فائل کو دیکھا، جس نے آج اس کے اور نیلوفر کے درمیان بچی کھچی ڈور کو بھی راکھ کر دیا تھا۔

اسی بوجھل سکوت کے درمیان، بیڈ پڑے اس کے فون کی سکرین اچانک روشن ہوئی اور ایک مدہم سی نوٹیفکیشن وائبریشن نے کمرے کے جمود کو توڑا۔ نجف نے چند لمحے اسی طرح خالی نظروں سے جلتی بجھتی سکرین کو دیکھا، پھر بے دلی اور شدید تھکن کے ساتھ قدم آگے بڑھائے اور جھک کر فون اٹھا لیا۔ سکرین پر ایک نیا میسج چمک رہا تھا۔

"کیا ہم مل سکتے ہیں؟ سقراط!"

لفظ سقراط کو دیکھتے ہی اس کا وجود چند لمحوں کے لیے بالکل ساکت ہو گیا۔ اسے کم از کم اسکی توقع نہیں تھی۔ وہ بے تاثر آنکھوں سے سکرین پر جگمگاتے ان چند الفاظ کو تکتی رہی۔ اس لمحے، جب اس کی اپنی ذات کے تمام رشتے اسے پاگل قرار دے کر پیچھے ہٹ رہے تھے... اس شخص کا یہ میسج ایک ناگزیر سوال بن کر سامنے آیا تھا۔

"دیکھ ملکانی، سچ جاننا ہے نا؟ تو جا، اپنے شوہر کے گھر! وہیں کھلے گی تیرے رازوں کی پوٹلی۔" روشن کے الفاظ اسکی سماعت میں گونجے۔ اس نے ایک طویل سانس اپنے اندر کھینچی، میسج باکس پر انگلی رکھی اور بغیر کسی سوچ بچار کے، سست انگلیوں سے ٹائپ کرنا شروع کیا۔

"لوکیشن بھیج رہی ہوں، آ جاؤ۔"

ٹائپ کرنے کے بعد اس نے ایک ریستوران کی لوکیشن پن کی، سینڈ کا بٹن دبایا اور فون کو بغیر کسی دوسری نظر کے، بیڈ پر واپس پھینک دیا۔ پھر اس نے اپنے چہرے پر پھیلی پھیلی نمی کو ہاتھ کی پشت سے پونچھا، اپنے بکھرے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا اور واک ان کلازٹ کا شیشے دار دروازہ دھکیل کر اندر گھس گئی۔

☆.....☆.....☆

کچھ دیر بعد سڑک کے کناروں پر کھڑے اسٹریٹ لیمپس کی زرد روشنیاں نجف کی گاڑی کی ونڈ اسکرین پر پھسلتی ہوئی پیچھے کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی، مگر اس کا ذہن اب بھی اس کے کمرے میں تھا، جہاں نیلوفر بیگم کے تلخ الفاظ کسی ہتھوڑے کی طرح اس کی سماعتوں پر برس رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی گاڑی متعلقہ ریستوران کی پارکنگ میں آ کر رکی۔ انجن بند کر کے اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس نے گہرے کائی رنگ کا ایک سادہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ بالوں کی ایک جانب سے مانگ نکال کر انہیں کھلا چھوڑا گیا تھا جو رات کی ہلکی ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ ابھی ریستوران کے شیشے والے مرکزی دروازے کی جانب بڑھ ہی رہی تھی کہ اس کے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر میسج کی ٹون ابھری۔ اسکرین پر سقراط کا پیغام تھا۔

"روف ٹاپ پر آ جاؤ۔"

یعنی وہ اس سے پہلے پہنچ چکا تھا۔ نجف نے فون واپس مٹھی میں دبایا اور لفٹ کی جانب بڑھ گئی۔ چند لمحوں بعد لفٹ کے دروازے کھلے تو چھت کی خنک ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ روف ٹاپ پر مدھم سی روشنیاں تھیں اور لوگوں کا رش بہت کم تھا۔ اس نے ایک سرسری سی نگاہ دوڑائی اور پھر اس کی نظریں سقراط پر جا ٹھہریں۔

وہ ایک کونے والی میز کے قریب کھڑا تھا، البتہ اس کا رخ نیچے سڑک پر چلتی ٹریفک کی جانب تھا۔ اس نے کریم رنگ کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا اور اس کے بال پیچھے کی جانب سلیقے سے بندھے ہوئے تھے۔ نجف نے اپنے قدموں میں مضبوطی پیدا کی اور اس کی جانب بڑھی۔

"تم جلدی پہنچ گئے؟" سقراط سے چند قدم کے فاصلے پر رکتے ہوئے اس نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

سقراط نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "میں قریب ہی تھا۔"

اس کی گہری نگاہوں نے ایک سیکنڈ کے لیے نجف کے سراپے کا جائزہ لیا اور پھر اس نے کرسی کھینچ کر نجف کو بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور خود میز کی دوسری جانب بیٹھ گیا۔ نجف خاموشی سے کرسی پر براجمان ہوگئی۔ اب وہ دونوں ایک چھوٹی سی میز کے پار بالکل آمنے سامنے تھے۔

" کہو... کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے؟" نجف نے بیٹھتے ہی سیدھا مدعے پر آنے کو ترجیح دی۔ حالانکہ روشن سے ملاقات کے بعد وہ خود اس سے ملنا چاہتی تھی۔

" کیا لوگی؟" سقراط نے اس کا سوال نہایت سکون سے نظر انداز کر دیا۔

نجف نے زچ ہو کر ایک گہری سانس خارج کی۔ "چائے۔"

سقراط نے اس کی جانب دیکھے بنا ویٹر کو اشارہ کیا اور دو کپ چائے کا آڈر دے دیا۔ پھر وہ پوری طرح نجف کی جانب متوجہ ہوا۔

" تمہیں میرا نمبر کہاں سے ملا؟"

"اتنی امیر بیوی کا نمبر نہیں رکھوں گا تو ڈفر کہلاؤں گا۔" وہ جس سکون سے بولا تھا نجف کڑوا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔

"مُجھے بیوی مت کہو۔" وہ میز کی جانب جھکتے ہوئے چبا کر بولی تو سقراط استہزائیہ ہنس دیا۔

"مسز کہہ لوں؟" اسکے اگلے جواب نے نجف کو مزید سلگا گیا۔ وہ شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

" دیکھ ملکانی، سچ جاننا ہے نا؟ تو جا، اپنے شوہر کے گھر! وہیں کھلے گی تیرے رازوں کی پوٹلی۔" روشن کے الفاظ تھے کہ ذہن سے نکل ہی نہیں رہے تھے۔ وہ سقراط کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ کیا چھپا رہا تھا وہ شخص؟ بس چند لمحے اور اس نے ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ پھر پیچھے کو ہو کر کرسی سے ٹیک لگا لی۔ سیاہ رنگ کا ایک گرم سکارف کندھوں کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔

"مُجھے تم سے یہی امید رکھنی چاہیے تھے۔" وہ سقراط کے چہرے کو دیکھتے ہوئے تاسف سے بولی تو سقراط نے کندھے اچکا دیے۔ اسے شاید فرق ہی نہیں پڑتا تھا۔

"مُجھے نیمل کے حوالے سے بات کرنی تھی۔" اس بار اسکی آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا

نجف نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں چاہتا ہوں تم نیمل سے بات کرو۔" سقراط نے میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "وہ خود کو گھر کی چار دیواری میں ضائع کر رہی ہے۔ اسے اپنی لاء پریکٹس دوبارہ شروع کرنی چاہیے۔ سرمد بھائی اس کی اس حالت کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ تم اسے سمجھاؤ کہ وہ اپنی زندگی کی طرف واپس لوٹے۔"

نجف بظاہر اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، اس کی باتیں سن رہی تھی لیکن اس کا اپنا ذہن اس وقت ایک ایسے خوفناک بھنور میں پھنسا ہوا تھا کہ وہ نیمل کو کیا خاک سمجھاتی۔ اسے تو خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔

"اس کا بوسیدہ سا بہانہ ہے کہ گھر کو اس کی ضرورت ہے حالانکہ گھر میں سب بڑے موجود ہیں۔ اسے اس قید سے باہر نکالنا ضروری ہے۔"

نجف نے پلکیں جھپکائیں۔ اس کے اندر چلنے والی آندھی نے اچانک ایک عجیب و غریب اور غیر متوقع شکل اختیار کر لی۔

"تمہیں جانے کے لیے بھی اسی کا گھر ملے گا۔" کچھ تھا جو اسکے اندر ٹوٹ رہا تھا۔

"اگر میں تمہارے گھر آ جاؤں... تو کیا نیمل واپس پریکٹس شروع کر لے گی؟"

نجف کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے اس ایک جملے نے جیسے وقت کے پہیے کو بریک لگا دی ہو۔ سوال ایسا تھا کہ سقراط کے الفاظ اس کے حلق میں ہی دم توڑ گئے۔ اس نے بے یقینی سے نجف کے سپاٹ چہرے کو دیکھا۔

"مطلب...؟" وہ پہلی بار الجھا۔ نجف نے اپنی جانچتی، ٹھنڈی نگاہیں سقراط کے چہرے پر جمائیں اور ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔

"مسٹر سقراط شبگیر ...اگر میں رخصت ہو کر تمہارے ساتھ تمہارے گھر آ جاؤں، تو کیا نیمل واپس اپنی زندگی کی طرف لوٹ جائے گی؟"

ہاں، اس نے بالکل وہی کہا تھا جو سقراط نے سمجھا تھا۔ مگر یہ بات اس حد تک غیر متوقع تھی کہ وہ کتنے ہی لمحے بغیر پلک جھپکائے نجف کو دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کی لکیریں کھنچ سی گئیں۔

"کیا تم واقعی ایسا کرنا چاہتی ہو؟" سقراط کی آواز قدرے دھیمی مگر گہری تھی۔ نجف نے آنکھیں میچ کر ایک اور گہری سانس لی۔

اسی لمحے ویٹر آیا اور دونوں کے سامنے چائے کے کپ رکھ کر چلا گیا۔

"میری کچھ مجبوری ہے۔" نجف نے نظریں جھکا کر چائے کے کپ کو دیکھا، "میرے خیال سے فی الحال... یہی بہتر رہے گا۔ شاید کچھ وقت کے لیے..."
"اور تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے باپ اور بھائی مُجھے زندہ چھوڑ دیں گے؟" سقراط نے تمسخرانہ انداز میں اس کی بات کاٹی اور چائے کا کپ اٹھالیا۔ نجف کی رگوں میں جیسے کسی نے سوئی چبھودی۔ اس نے سختی سے لب بھینچے اور نظریں اٹھا کر طنز کیا۔
"تم میرے باپ اور بھائیوں سے ڈرتے ہو؟"

سقراط نے نہایت سکون سے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا، ایک گھونٹ بھرا اور پھر نجف کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔
"دھوکے بازوں، مکاروں اور قاتلوں سے... ڈرنا ہی چاہیے۔"
نجف کو لگا جیسے کسی نے ابلتی ہوئی چائے اس کے وجود پر انڈیل دی ہو۔ اس کا سارا غرور، ساری انا ایک دم پھنکار کر جاگ اٹھی۔

"زبان سنبھال کر و بات سقراط!" اسے خود پر شدید افسوس ہوا کہ وہ آخر اس مغرور اور بدتمیز شخص کے بلانے پر آئی ہی کیوں تھی؟ اور آخر اس نے روشن کی باتوں کا یقین ہی کیوں کیا؟ چولہے میں جائے روشن۔
"تم خود کو کیا سمجھتے ہو؟ پارسا؟ تمہارے اپنے ہاتھ کتنے صاف ہیں، یہ مُجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ اسے کھری کھری سنا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں، مگر عین اسی لمحے چھت پر چلنے والی ہوا تیز ہوگئی۔ نجف کے بال اڑ کر اس کے چہرے کے گرد بکھرنے لگے۔ اس نے جھنجھلا کر بال کان کے پیچھے اڑسے، مگر ہوا کی سرکشی جاری رہی۔ اور تب... سقراط کی نگاہیں نجف کی بھڑکتی ہوئی آنکھوں سے پھسلیں۔ اسے نجف کی زہریلی باتیں، اس کے طنزیہ نشتر... کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی نظریں نجف کے کان کی لو پر چمکتے ہوئے سونے کے ان انتہائی معمولی اور چھوٹے سے ٹاپسوں پر اٹک کر رہ گئی تھیں۔ وہ بال جو بار بار ہوا سے اڑ کر ان ٹاپس کو چھپا رہے تھے، اور وہ سونا جو روشنی پڑنے پر ایک عجیب سی کشش کے ساتھ چمک رہا تھا۔ نجف بولتی جا رہی تھی مگر سقراط ساکت اور مبہوت... بس اس کے کانوں میں چمکتے اس

معمولی سے زیور کو دیکھ رہا تھا۔ دس سال پہلے کے مناظر کسی فلم کی طرح اسکے تصور کے پردے پر چلنے لگے۔
"تم مر جاتے سقراط!" ایک طمانچہ اسکے منہ پر پڑا اور پھر طلسم ٹوٹ گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے نظریں نجف کے کانوں میں چمکتے ان معمولی ٹاپسوں سے ہٹائیں اور اپنے اعصاب کو یکجا کیا۔

"میں یہاں صرف گھر والوں کی خاطر آیا تھا۔" سقراط نے تھکے ہوئے، قدرے سپاٹ لہجے میں کہا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ نجف کی چلتی زبان کو بریک لگی۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔
"میں بھی... گھر کے لیے ہی یہ سب کر رہی ہوں۔" اس کی آواز کی سختی ماند پڑ چکی تھی۔ اس جملے کے بعد ان کے درمیان ایک بوجھل خاموشی چھا گئی۔ چائے کے کپ ان کے سامنے رکھے ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد سقراط سیدھا ہو کر بیٹھا، اس کی نظروں میں ایک سنجیدہ تنبیہ تھی۔

"ٹھیک ہے۔ تم اچھے سے سوچ لو۔ میرے گھر میں آنا اور وہاں رہنا... اتنا آسان نہیں ہوگا۔"

نجف جانتی تھی۔ وہ بہت اچھے سے جانتی تھی کہ شبگیروں کے گھر میں اس کا استقبال پھولوں سے نہیں ہونے والا تھا، مگر اس وقت اسے یہ کرنا تھا۔ اپنے لیے کرنا تھا۔ اسے اپنی حقیقت جاننی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنے بکھرتے اعصاب کو مجتمع کیا۔
"میں کل نیمل سے بات کرتی ہوں۔"
اس ایک جملے سے سقراط کا طیش بھی بیٹھ گیا۔ اس نے نجف کو ایک نظر دیکھا، پھر میز سے اپنا کپ اٹھا لیا۔
"ہماری زندگی تو جیسی تیسے گزر رہی گئی ہے... لیکن گھر والوں کو ہماری ضرورت ہے۔ ہم یہ گھر کے لیے کر رہے ہیں۔" (مکار آدمی!)
نجف نے چند لمحے اسے دیکھا اور پھر اپنا کپ بھی اٹھا لیا۔ "گھر کے لیے۔" (مکار عورت!)

دونوں (مطلبی اور مکار) ایک فیصلے پر متفق ہونے کے بعد خاموشی سے نیچے پارکنگ میں آ گئے۔ سقراط اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا جبکہ نجف اپنی گاڑی کی طرف۔ نجف نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اگنیشن میں چابی گھمائی، مگر گاڑی نے صرف

ایک بے جان سی آواز نکالی اور اسٹارٹ نہ ہوئی۔اس نے بار بار کوشش کی،مگر انجن مکمل طور پر خاموش ہو چکا تھا۔سقراط، جو موٹر سائیکل پر بیٹھ چکا تھا، وہیں رکا یہ سارا منظر دیکھتا رہا۔پھر اس نے اسٹینڈ لگایا اور چلتا ہوا نجف کی گاڑی کے قریب آ گیا۔ گاڑی کے شیشے پر دستک دی۔اور سینے پر بازو باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"مدد چاہیے؟" وہ پرشوق نگاہوں سے اسکے تپے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔
"نہیں۔" نجف نے خفگی سے کہا اور چابی دوبارہ گھمانے لگی۔سقراط نے گاڑی کی چھت پر ہاتھ رکھا اور قدرے جھک کر کھڑکی سے اندر جھانکتے ہوئے انتہائی طنزیہ لہجے میں بولا۔

"محترمہ نجف بزدار صاحبہ! رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔آپ کے محل سے آپ کے ڈرائیور کو یہاں تک آتے آتے کم از کم پچیس منٹ لگ جائیں گے، اور آپ کا 'نامی شوہر' ہونے کے ناطے میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ میں آپ کو یہاں سڑک پر چھوڑ کر چلا جاؤں۔تو اس لیے...آیئے آپ کو آپ کے محل چھوڑ دوں۔"

اس کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا مگر وہ بات بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔نجف نے بے بسی سے ہونٹ بھینچے، گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔اس نے پارکنگ گارڈ کو گاڑی کی کچھ ہدایات دیں اور پھر نہایت بوجھل قدموں سے سقراط جانب پلٹی۔سقراط نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔
"تم مُجھے اس پر گھر چھوڑو گے؟" انجن کی بھاری گڑگڑاہٹ رات کی خاموشی میں گونجی، مگر نجف وہیں کھڑی رہی۔
"افسوس! میرے پاس تمہاری طرح مہنگی گاڑیاں نہیں ہیں۔"
وہ شدید تذبذب کا شکار تھی۔اس کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔شاید اسے آج موٹر سائیکل پہ بیٹھتے ہوئے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔
"بیٹھ جایئے...نہیں گراؤں گا۔" سقراط نے شیشہ میں اس کی جھجک دیکھتے ہوئے پورے یقین سے کہا۔نجف نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔
" گرایا تو تم نے دس سال پہلے تھا۔(وہ بھی سب کی نظروں میں!)"

سقراط کے جبڑے سختی سے بھنچ گئے۔اس کا دل تو چاہا کہ اس مطلبی عورت کو یہیں چھوڑ کر چلا جائے، مگر وہ ایسا کر نہیں سکا۔نجف

محتاط انداز میں موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ اگلے ہی پل موٹر سائیکل ایک زناٹے کے ساتھ پارکنگ سے نکل کر سڑک پر آ چکی تھی۔ رات کے اس پہر ہوا بہت ٹھنڈی اور تیز تھی۔ نجف نے خود کو سمیٹ کر فاصلہ برقرار رکھا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں موٹر سائیکل بزدار پیلس کے دروازے کے سامنے آ کر رکی۔ بائیک کے رکتے ہی نجف ایک جھٹکے سے اتری اور بنا پیچھے مڑے گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ سقراط نے بھنویں سکیڑ کر اس کی اس بے رخی کو دیکھا اور قدرے اونچی آواز میں جل کر بولا۔

" کوئی آپ کی مدد کرے...تو اسے شکریہ کہتے ہیں!"

نجف کے قدم رک گئے۔ وہ اسی تمکنت سے پیچھے پلٹی۔

"ایک نامی شوہر جب اپنی نامی غیرت کا بوجھ اٹھا کر کوئی فرض نبھاتا ہے نا مسٹر سقراط...تو اس پر شکریہ ادا کر کے میں اس کا ثواب ضائع نہیں کر سکتی۔"

وہ اسے لاجواب کر کے مڑی۔ گیٹ کھل چکا تھا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔ سقراط چند لمحے اس راستے کو دیکھتا رہا جہاں وہ غائب ہوئی تھی۔

"چولہے میں جائے شکریہ!" اس نے جھنجھلا کر موٹر سائیکل موڑی اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ مگر وہ دونوں اس بات سے یکسر بے خبر تھے کہ بزدار پیلس کی ایک اونچی، تاریک کھڑکی کے پردے کے پیچھے کھڑا ایک شخص یہ سارا منظر دیکھ چکا تھا۔ امجد بزدار... جن کی سرخ نگاہوں نے تاریکی میں موٹر سائیکل پر دور جاتے سقراط شبگیر اور اندر آتی نجف کو دیکھا تھا اور پھر کھڑکی سے ہٹ گئے۔

☆.....☆.....☆

اسی رات کی تاریکی میں بزدار پیلس کی بالائی منزل پر واقع امجد بزدار کا اسٹڈی روم معمول سے زیادہ روشن تھا۔ انہوں نے پہلی فرصت میں حق کو بلاوہ بھیجا تھا۔ چھت میں نصب ایل ای ڈی لائٹس اور ٹیبل لیمپ کی روشنی نے کمرے کے ہر گوشے کو واضح کر رکھا تھا۔ نجف کا سقراط کی موٹر سائیکل پر آنا، ان کے اعصاب پر سوار تھا۔ انہی الجھے ہوئے افکار کے دوران کمرے کے دروازے پر دو ہلکی دستکیں ابھریں۔

"آجاؤ۔" اُنہوں نے شفیق مگر سنجیدہ آواز میں کہا۔ دروازہ کھلا اور اندر داخل ہوا۔
آج وہ ایک طویل عرصے بعد غیر معمولی حد تک پرسکون لگ رہا تھا۔ رات کے اس پہر، وہ سرمئی رنگ کے شب خوابی کے لباس میں ملبوس تھا، اور اس کے بال نہایت نفاست سے سیٹ تھے۔ ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، وہ پُرسکون قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔

"السلام علیکم، داجی!"

امجد بزدار نے گہری نظروں سے اسکا جائزہ لیا۔ حق کے چہرے کی تازگی ان کے لیے خلافِ توقع تھی۔ حق کی نظریں ان کے زمانے رکھی بڑی سی میز پر جا کر رک گئیں۔ میز کے ایک کونے پر سیاہ رنگ کا ایک نیا اور پراسرار سا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ یہ ایک انسان کا آدھا چہرہ تھا، جس کے خشک اور تراشیدہ ہونٹوں پر اس کی اپنی شہادت کی انگلی جمائی گئی تھی۔ حق بیٹھنے کی بجائے سیدھا اس مجسمے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں خاموشی سے اس مورتی کے ایک ایک خدوخال کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"کیسے ہو حق؟" امجد بزدار نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں، داجی!" حق نے نظریں مورتی سے ہٹائے بغیر، نہایت دھیمے اور ہموار لہجے میں جواب دیا۔ امجد بزدار نے اپنے ہاتھ میز پر جمائے، ان کی جانچتی نگاہیں حق کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔
"تم نے سلویٰ کے بارے میں کیا سوچا؟" حق نے ایک لمبی سانس خارج کی۔
"میں اسے آزاد کر رہا ہوں۔" اس کے چہرے پر کوئی اضطراب یا جھجھک نہیں تھی۔ اس نے نہایت نرمی اور سکون سے ایک بم پھوڑا۔

ان چند الفاظ نے اسٹڈی روم کی روشن فضا میں سکتہ طاری کر دیا۔ امجد بزدار کے چہرے پر ایک ناقابلِ بیان اور ناگواری کا تاثر ابھرا۔ ان کے لب جیسے چند لمحوں کے لیے سِل گئے۔ وہ حق کو بے یقینی سے تکتے رہے جو اتنے بڑے فیصلے کا اعلان یوں کر رہا تھا جیسے چائے کا کپ پیش کر رہا ہو۔ حق نے اپنا دایاں ہاتھ ٹراؤزر کی جیب سے نکالا اور آگے جھک کر اس مجسمے کے سخت

چہرے پر اپنے انگوٹھے کو آہستگی سے مسلا۔اس کی انگلی کا لمس مورتی کی سطح پر پھسلا۔

"تم...تم بھی وہی کر رہے ہو جو تمہارے باپ نے کیا تھا؟" امجد بزدار کی آواز میں تلخی اور غصہ گھل گیا، "تم ایسا کیسے کر سکتے ہو حق؟ ہمارے خاندان میں عورتوں کو یوں چھوڑنے کا رواج نہیں ہے۔"

حق کے ہاتھ کی حرکت رکی۔اس نے اپنا ہاتھ واپس ٹراؤزر کی جیب میں اڑسا اور سر اٹھا کر ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں اپنے باپ جیسا نہیں ہوں، داجی!" اس کا لہجہ حتمی تھا، "اور میں وہی کروں گا...جو میرے لیے بہتر ہوگا۔"

امجد بزدار نے گہرا سانس لیا، اپنے اندر ابھری آگ کو ضبط کرنے کی کوشش کی، اس سے پہلے وہ کچھ کہتے، حق نے بڑی صفائی سے گفتگو کا رخ موڑ دیا۔اس نے اشارے سے اس سیاہ مجسمے کی طرف دیکھا۔

"یہ مورتی پچھلی بار یہاں نہیں تھی۔کسی نے بھیجی ہے کیا؟"

امجد بزدار نے تپتی نظروں سے حق کو دیکھا، پھر اپنی برہم سانسوں کو بحال کرتے ہوئے مجسمے کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ہاں...میرے ایک دوست نے جرمنی سے بھیجی ہے۔یہ اٹھارہویں صدی کے ایک مشہور جرمن مجسمہ ساز کی نادر تخلیق ہے۔ Der Schweigende (یعنی خاموشی)۔جرمنی کی ایک قدیم آکشن ہاؤس سے خریدی گئی اصل اور بے حد قیمتی نایاب چیز ہے اور..."

"یہ نقلی ہے!" حق نے نے انکی بات اچک لی۔امجد بزدار کے لب ساکت ہو گئے۔انہوں نے بے یقینی سے ایک نظر حق کو دیکھا اور پھر میز پر رکھی اس شاہکار مورتی کو

"تم...تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

حق کے چہرے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔وہ ایک قدم اور قریب ہوا اور اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں مجسمے کی ٹھوڑی اور انگلی کے جوڑ پر رکھیں۔

"داجی! آپ بھول رہے ہیں کہ میرے بچپن کا ایک حصہ جرمنی میں گزرا ہے۔میں برلن اور ہیمبرگ کی ان گمنام اور جرائم سے بھری گلیوں سے بہت اچھے سے واقف ہوں جہاں ایسی تاریخی نایاب اشیاء رات کے اندھیرے میں بنائی جاتی ہیں۔" حق

نے مورتی کو ذرا سا گھمایا اور اس کے نچلے حصے کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر یہ اٹھارہویں صدی کی اصل برونز یا قدرتی پتھر کی تراشیدہ مورتی ہوتی، تو اس کی بنیاد پر آکسیڈیشن (Oxidation) کے قدرتی زنگار اور سانچے کی لکیریں کبھی اتنی ہموار نہ ہوتیں۔ اس پر استعمال ہونے والا میٹریل اصل پتھر نہیں، بلکہ جدید پولیمر ریزن (Polymer Resin) اور ڈارک پاؤڈر کا کیمیائی ملاپ ہے، جسے صرف تین سال پرانا دکھانے کے لیے تیزاب سے دھویا گیا ہے۔"

حق نے اپنی انگلیوں کو انگھوٹے کی مدد سے چھوا اور دوبارہ ہاتھ جیبوں میں ڈالتے ہوئے امجد بزدار کی آنکھوں میں دیکھا، جن کا چہرہ اب سچ مچ سرخ ہو چکا تھا۔ کیا انہیں واقعی ایک نقلی مورتی بھیجی گئی تھی؟

"آپ کے دوست کو برلن کے کسی گینگسٹر نے بے وقوف بنایا ہے۔"
امجد بزدار چند لمحے مکمل خاموشی کے ساتھ اپنے سامنے کھڑے حق کو دیکھتے رہے، پھر الجھن کے عالم میں انہوں نے خود ہی بات کا رخ موڑ دیا۔
"میں نے آج رات نجف کو اس...سقراط کے ساتھ دیکھا ہے۔" امجد بزدار کا لہجہ زہر آلود ہو گیا، سقراط کا نام لینے میں انہیں باقاعدہ دقت محسوس ہو رہی تھی، "وہ ہمارے گھر کے دروازے تک آ چکا ہے۔"

حق کے چہرے پر کسی مفاہمت یا حیرت کے تاثرات نہیں ابھرے۔ وہ انتہائی سکون سے ان کے سامنے رکھی چمڑے کی بھاری کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
"یہ تو ہونا ہی تھا..." اس نے دھیمی اور ہموار آواز میں کہا۔
"وہ جان بوجھ کر یہ سب کر رہا ہے حق!" امجد بزدار نے میز پر جھکتے ہوئے کہا۔ "وہ...نجف کو...ہمارے خلاف کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہماری جڑوں پر وار کر رہا ہے۔"
"جانتا ہوں۔" حق نے میز پر رکھے پیتل کے بھاری پیپر ویٹ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اسے آہستہ سے گھماتے ہوئے بولا۔

"تو کوئی حل ڈھونڈو حق!" پیپر ویٹ کی میز سے رگڑ کھانے کی آواز ابھری۔ چند لمحوں بعد حق نے پیپر ویٹ پر سے ہاتھ ہٹایا۔
"اس شادی کا فیصلہ نجف کا اپنا ہے۔ وہ اب دس سال پہلے والی بچی نہیں ہے جو کسی کی باتوں میں آجائے۔ وہ اپنا اچھا اور برا بہت اچھے سے جانتی ہے۔ اسے کوئی مانیپولیٹ نہیں کرسکتا... لیکن..." حق رک گیا۔ اس نے اپنی گہری نگاہیں اٹھا کر امجد بزدار کو دیکھا۔

"لیکن کیا؟" امجد بزدار کا دل یکدم ہولا ہوا۔

"مُجھے لگتا ہے... صرف سقراط یہاں تک نہیں آیا بلکہ وہ وہاں جانے کی تیاری کر رہی ہے۔" اگرچہ امجد بزدار کی اپنی چھٹی حس اور ان کا ذہن انہیں مسلسل کچوکے لگا رہا تھا، مگر وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ اب جب حق نے اتنے وثوق اور حتمی انداز میں یہ بات کہی، تو ان کی رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی۔
"تو پھر... کیا کرنا ہے؟" ان کے لبوں سے بے اختیار پھسلا۔
"جانے دیں..." حق نے لاپروائی سے لہجے میں شانے اچکائے، "عورت کو قید نہیں کیا جاسکتا۔"

امجد بزدار نے بے ساختہ اپنی کنپٹی مسلی۔ ان کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اسٹڈی روم میں پھیلی خاموشی میں صرف دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز گونج رہی تھی جو ان کے بکھرتے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد، انہوں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ ان کی آنکھیں شدید ضبط اور غصے سے سرخ ہو چکی تھیں۔
"اس کی کمزوری ڈھونڈو!" انہوں نے حق پر اپنی نظریں جما دیں۔
"کس قسم کی کمزوری، داجی؟" حق نے وضاحت مانگی۔ امجد بزدار کے چہرے کے تاثرات مزید سخت اور بھیانک ہوگئے۔
"ویسی ہی... جیسی ہماری ہے اس کے پاس۔"
حق نے چند لمحے امجد بزدار کے چہرے کو بغور دیکھا۔ اس نے اس حکم کی نہ تو تائید کی اور نہ ہی انکار، بس اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔
"رات کافی ہو چکی ہے... شب بخیر!"
امجد بزدار اس کے اس ٹھنڈے اور مبہم رویے پر مزید کچھ نہ بول سکے۔ حق اپنے مضبوط اور نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا اسٹڈی روم

کا بھاری چوبی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا، اور پیچھے امجد بزدار اس نقلی مجسمے کی خاموشی اور اپنے ہی اضطراب کے ساتھ اکیلے رہ گئے۔ پھر ان کی نظر اپنے سامنے رکھی فائل پہ پڑی۔ جسکے اوپر موٹے حرفوں میں 'لیڈی ویلی' لکھا تھا۔ انکے فارما کی دنیا کا ایک اہم پروجیکٹ! ٹن...ٹن...ٹن...الٹی گنتی شروع ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

یہ اگلے دن کی بات تھی۔ حق صوفے پر بیٹھا تھا جبکہ اقبال بزدار اپنی میز کے پیچھے بیٹھا کسی فائل کے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ بزدار اسپورٹس کالج میں غیر معمولی گہما گہمی تھی۔ اگلے روز سے ہاکی ٹورنامنٹس کا آغاز ہونا تھا اور پورا کالج جیسے کسی بڑے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ دو سال پہلے تک اس کرسی پر شمس بزدار بیٹھا کرتا تھا۔ پھر امجد بزدار اختیار اپنے بیٹے سے لے کر پوتے کے حوالے کر دیا۔ اقبال کے لیے یہ صرف ایک عہدہ نہیں تھا، اپنے آپ کو ثابت کرنے کا موقع بھی تھا۔ حق نے کمرے پر ایک سرسری نظر ڈالی۔

" کرسی تو بڑی سنجیدہ لگ رہی ہے۔"

" کرسی سنجیدہ نہیں ہے، اس پر بیٹھنے والا سنجیدہ ہے۔" اقبال نے فائل سے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

"اچھا ہے۔ ترقی کر رہے ہو۔"

" تمہیں حسد ہو رہا ہے؟" اقبال نے رازدانہ انداز میں پوچھا۔

"مُجھے ترس آ رہا ہے۔" حق نے سکون سے کہا۔ اقبال ہنس دیا۔

" کبھی تو اپنی کمزوری ہاتھ آنے دیا کرو۔"

"حسد، انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ کم از کم میں اسے اپنی کمزوری نہیں بنا سکتا۔"

کمرے میں چند لمحوں کے لیے ہلکی سی خاموشی پھیل گئی۔ اقبال دوبارہ فائل کی طرف متوجہ ہوا تو حق کی نظر میز پر رکھے ٹورنامنٹ کے پمفلٹ پر پڑی۔ اس نے اسے اٹھایا، چند لمحے سرورق دیکھا اور پھر بے دھیانی سے اس کے صفحات پلٹنے لگا۔

"تیاریاں کیسی ہیں؟" اس نے نظریں پمفلٹ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

" کل سے ٹورنامنٹس ہیں۔ آج کے بعد اگر کوئی تیاری باقی رہ گئی تو پھر وہ تیاری نہیں، بدقسمتی ہوگی۔" اقبال کے جواب پر حق

نے پرسوچ انداز میں پمفلٹ کے ایک صفحے پر انگلی پھیری۔

" تمہیں کیا لگتا ہے، اس بار تمہاری ٹیم ٹرافی جیت پائے گی؟"

"پورا سال محنت کی ہے لڑکوں نے۔ضرور جیتے گی۔"

حق کے چہرے پر چند باریک لکیریں ابھریں۔" مگر مُجھے ایسا نہیں لگتا۔"

اس نے پمفلٹ بند کیا اور اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔اقبال نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔چند لمحے تک وہ خاموشی سے حق کا چہرہ پڑھتا رہا۔وہ وہاں کچھ تلاش کر رہا تھا۔حق کا آج یہاں آنا محض اتفاق نہیں تھا۔

"تم اس سے ملے ہو نا؟"

حق خاموش رہا۔

"تم سقراط سے ملے ہو نا؟"اسکی خاموش پہ اقبال نے دوبارہ پوچھا۔وہ مخالف ٹیم کا کوچ تھا۔اگر حق کو لگ رہا تھا کہ اس بار جیت مشکل ہو گی تو وجہ صرف ایک ہی تھی۔سقراط شبگیر!حق نے کرسی کی پشت سے ٹیک ہٹالی۔

" تمہیں پتا ہے اقبال...شمس چچا تمہاری غلطیاں اور کمزوریاں ڈھونڈ رہا ہے۔وہ کسی شکاری عقاب کی طرح نظریں جمائے بیٹھا ہے۔اگر اس ٹورنامنٹ میں کالج کا ڈسپلن یا ریکارڈ کسی بھی لحاظ سے نیچے گرا،تو سمجھو تمہاری یہ ڈائریکٹر کی کرسی گئی۔"

اقبال جس فائل پر دستخط کر رہا تھا،اس نے اسے ایک جھٹکے سے بند کر دیا۔فائل بند ہونے کی آواز پورے کمرے میں گونج گئی۔

وہ جانتا تھا حق غلط نہیں تھا

"تم سے سقراط نے کیا کہا ہے؟"

اقبال کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے جبکہ حق اٹھ کھڑا ہوا۔وہ اقبال کے عقب میں نصب دیوار گیر کھڑکی کی جانب بڑھا۔نیچے وسیع گراؤنڈ میں کھلاڑی پریکٹس کر رہے تھے۔سیٹی کی آواز کبھی قریب سے آتی،کبھی دور سے۔

"وہ بدلہ لے گا۔" حق نے باہر دیکھتے ہوئے کہا تو اقبال نے کرسی گھما کر اس کی جانب کی۔

"تم سے؟"

"نہیں۔تم سے۔" حق نے کھڑکی سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔اقبال کی بھنویں سکڑ گئیں۔

"تمہیں کیسے پتا؟"

حق کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ آئی۔"میرے پاس اپنے طریقے ہوتے ہیں، بات کرنے کے۔بات نکلوانے کے۔"

"تم نے اسے کیا کہا؟"

حق نے شیشے پر ابھرتے اپنے عکس کو دیکھا۔

"یہی کہ میں جینا چاہتا ہوں۔"ایک لمحے کے لیے خاموشی چھائی۔پھر اقبال کا قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا۔

"تم نے سقراط سے یہ کہا کہ تم جینا چاہتے ہو؟"اقبال ہنستے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔

"تم کھیلنے میں ماہر ہو حق!"اقبال نے شاطرانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔جبکہ حق نے کوئی جواب نہیں دیا۔اس کی نظر بے اختیار نیچے گراؤنڈ میں جا ٹھہریں۔وہاں ثالث تھا۔وہ اکیلا نہیں تھا وہاں نامرہ بھی تھی۔نامرہ نے سر پر اسپورٹس کیپ جمائی ہوئی تھی جس کے نیچے سے اس کے چھوٹے بال باہر جھانک رہے تھے۔ثالث بینچ پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ نامرہ اس کے سامنے کھڑی، اپنے ہاتھ میں پکڑی کلپ بورڈ ائل میں تیزی سے کچھ نوٹ کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ ثالث سے کچھ کہہ رہی تھی۔اقبال کے تبصرے پر حق کے چہرے پر ایک لکیر تک نہ ابھری۔اس نے نہ تو کوئی جواب دیا اور نہ ہی اپنی آنکھیں کھڑکی کے پار جمے اس نقطے سے ہٹائیں۔اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اقبال اپنی جگہ سے اٹھا۔وہ سنجیدہ قدم اٹھاتا ہوا حق کے بالکل قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔اس نے حق کی نظروں کے تعاقب میں نیچے گراؤنڈ کی طرف دیکھا۔جیسے ہی اس کی نظر کیپ اوڑھے نامرہ پر پڑی، اقبال کے چہرے پر سچ مچ حیرت کا تاثر ابھرا۔

Don't tell me you are a pedophile!

اقبال کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔حق کی گردن جھٹکے سے مڑی۔

"بکواس مت کرو، گھٹیا انسان!"وہ غرایا اور اسی لمحے کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔"جسے پیدوفائل کی ڈیفینیشن نہیں پتا، وہ ڈائریکٹر بنا پھرتا ہے۔"حق نے دانت بھینچتے ہوئے کہا اور پھر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا میز کی طرف آیا۔وہاں رکھا اپنا فون اور سن گلاسز اٹھائے۔

"ان پر نظر رکھنا۔"اس نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

"وجہ؟" اقبال نے الجھ کر بھنویں سکیڑیں۔

"میں کہہ رہا ہوں۔" اس سے پہلے کہ اقبال کوئی دوسرا سوال کرتا، حق ڈائریکٹر آفس کا بھاری دروازہ دھکیل کر باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد، وہ کالج کی نچلی کشادہ راہداری سے گزر رہا تھا، جہاں سے گراؤنڈ کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ اسی اثنا میں گراؤنڈ میں بینچ پر بیٹھے ثالث کی نظر راہداری کے شیشوں کے پار سے گزرتے ہوئے حق پر پڑی۔ حق کو دیکھتے ہی ثالث جیسے ایک جھٹکے سے بینچ سے اٹھا اور اپنے لمبے قدموں سے بھاگتا ہوا راہداری کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ نامرہ، جو ابھی تک کلپ بورڈ پر کچھ نوٹ کر رہی تھی، ثالث کو یوں اچانک بھاگتے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ اس نے ابرو اچکا کر گردن موڑی اور ثالث کے تعاقب میں دیکھا۔ اگلے ہی لمحے ثالث راہداری میں حق کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ ثالث کی پیٹھ نامرہ کی جانب تھی۔ حق نے پہلے ایک جانچتی نظر اپنے سامنے کھڑے ثالث کے چہرے پر ڈالی اور پھر اس کے پیچھے، گراؤنڈ میں کھڑی نامرہ کو دیکھا جو کیپ درست کرتی ہوئی انہی کو گھور رہی تھی۔ نامرہ نے ایک نظر راہداری نیلی جیکٹ پہنے، راہداری میں کھڑے حق کو دیکھا۔

"ہنہہ... نیلا تھوتھا!"

وہ بڑبڑائی اور جھٹکے سے رخ موڑ کر دوبارہ اپنے کلپ بورڈ میں مصروف ہو گئی۔ حق نے اس کی ناگواری کو دور سے ہی پڑھ لیا تھا۔ اس کے لبوں کے کنارے پر ایک غیر محسوس سی مسکراہٹ ابھری اور غائب ہو گئی۔ اس نے اپنی نظریں واپس ثالث پر جمائیں۔

"مُجھے امید ہے تم اچھا کھیلو گے۔"

"ان شاءاللہ!" ثالث نے مسکراتے ہوئے۔ حق نے ایک نظر پھر دور کھڑی نامرہ پر ڈالی، اور ثالث سے چند باتیں کرنے کے بعد اپنے مضبوط قدم اٹھاتا ہوا راہداری کی دوسری سمت نکلتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

یہ پہلی بار ہوا تھا جب سلال اور عالیہ ایک ہی گروپ میں تھے۔ آج ان کا عملی جائزہ تھا۔ لمبی میزوں پر طبی آلات ترتیب سے

رکھے تھے۔ایک طرف خون کے نمونوں کی شیشیاں، دوسری جانب خوردبینیں اور مختلف معائنے کے آلات۔کھڑکیوں سے آنے والی دھوپ سفید میزوں پر پھیلی ہوئی تھی، مگر کمرے میں موجود ہر طالب علم کے چہرے پر امتحان کا دباؤ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پروفیسر ہاشمی میز کے سامنے کھڑے طلبہ کی فہرست دیکھ رہے تھے۔

"اگلا گروپ۔"

سلال اور عالیہ آگے بڑھے۔دونوں نے اپنے سامنے پڑے مریض کے متعلق ابتدائی معلومات پڑھیں۔ پروفیسر نے فائل بند کر دی۔

"آپ دونوں کو دس منٹ دیے جاتے ہیں۔مریض کی موجودہ حالت کا جائزہ لے کر اپنی تشخیص اور اگلے مرحلے کا تعین کریں۔"

سلال نے سر ہلایا۔عالیہ بھی فوراً مریض کی طرف متوجہ ہوگئی۔وہ بستر کے قریب گئی، مریض کا نام اور عمر دوبارہ تصدیق کی، پھر اس کی علامات کے متعلق سوالات شروع کیے۔سلال نے ساتھ کھڑے ہو کر اس کے جوابات نوٹ کیے۔

"درد کب سے ہے؟"

"کل رات سے۔"

"مسلسل ہے یا وقفے وقفے سے؟" مریض نے جواب دیا تو عالیہ نے اس کی بات مکمل ہونے تک انتظار کیا۔پھر اس نے نبض دیکھی اور سلال کی طرف رخ کیا۔

"نبض ایک بار پھر دیکھو۔مُجھے رفتار کچھ زیادہ لگ رہی ہے۔"

سلال نے فوراً مریض کی کلائی تھامی۔چند لمحے بعد اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں، تیز ہے۔"

عالیہ نے بلڈ ٹیسٹ کی رپورٹ اٹھائی۔"یہ بھی دیکھو۔"

سلال نے رپورٹ اس کے ہاتھ سے لی۔دونوں کچھ دیر خاموشی سے نتائج کا موازنہ کرتے رہے۔پھر سلال نے دھیرے سے کہا۔

"علامات اور رپورٹ دونوں ایک ہی سمت جا رہے ہیں۔"

عالیہ نے ہولے سے سر ہلایا۔"لیکن صرف ایک نتیجے پر نہیں جائیں گے۔" وہ دوبارہ مریض کی طرف متوجہ ہوئی۔

"سانس لینے میں دشواری کب زیادہ ہوتی ہے؟"

مریض نے بتایا تو سلال نے فوراً پوچھا۔ "لیٹنے پر بھی ہوتی ہے؟" مریض نے اثبات میں سر ہلایا۔ عالیہ نے ایک لمحے کے لیے سلال کو دیکھا۔

"تو پھر اگلا معائنہ یہی ہوگا۔" دونوں نے مل کر مریض کا مزید جائزہ لیا۔ سلال نے معائنہ کیا، عالیہ نے نتائج درج کیے اور پھر دونوں نے اپنے مشاہدات ایک دوسرے سے ملائے۔ وقت ختم ہونے سے پہلے سلال نے فائل بند کی اور دونوں پروفیسر ہاشمی کی طرف متوجہ ہوئے۔

"سر، ہمارا ابتدائی خیال یہ ہے کہ..."

"نہیں۔" پروفیسر حامد صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ پھر انہوں نے دونوں کو دیکھا۔

"صرف خیال نہیں...رزلٹ بتاؤ۔"

سلال نے ایک لمحے کے لیے عالیہ کی طرف دیکھا۔ عالیہ نے بہت ہلکے سے سر ہلایا۔

"ہمیں شبہ ہے کہ مریض کو..." سلال نے دھیرے سے کہنا شروع کیا اور اپنی تشخیص مکمل کی پھر آخر میں بولا۔ "لیکن حتمی فیصلہ مزید ایک معائنے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔"

پروفیسر ہاشمی چند لمحے خاموش رہے۔ پھر انہوں نے مریض کی فائل اٹھائی، رپورٹ دیکھی اور سلال کی طرف دیکھا۔

"اچھا کام کیا ہے۔"

صرف چار الفاظ تھے۔ لیکن ان کے لہجے میں واضح اطمینان تھا۔

"تم نے علامات کو الگ الگ نہیں دیکھا، ان کے درمیان تعلق تلاش کیا ہے۔ یہی چیز ایک اچھے ڈاکٹر کو باقی لوگوں سے الگ کرتی ہے۔"

"شکریہ سر!" سلال نے سانس بحال کرتے ہوئے کہا البتہ عالیہ خاموش کھڑی رہی۔ پروفیسر نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ حالانکہ چند منٹ پہلے مریض سے بنیادی سوالات اسی نے کیے تھے۔ نبض کی بے قاعدگی اسی نے محسوس کی تھی۔ اگلے معائنے کی سمت بھی اسی نے متعین کی تھی۔ سلال نے یہ سب دیکھا تھا۔ پروفیسر نے فائل بند کر دی۔

"او کے اگلا گروپ۔"

دونوں ایک طرف ہٹ گئے۔ عالیہ نے اپنی فائل سینے سے لگا لی اور خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ اسکے چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا البتہ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سلال بھی اس کے ساتھ تھا۔ جانے کیوں اسے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ رک گیا۔

"عالیہ۔"

وہ مڑی اور رک گئی۔سلال نے کچھ کہنا چاہا، پھر ٹھہر گیا۔اس نے واپس مڑ کر پروفیسر کی طرف دیکھا۔جن کا رویہ اسے سمجھ نہیں آیا پھر عالیہ کی طرف پلٹا۔"تم نے بہت اچھا کیا تھا۔"

عالیہ کے چہرے پر ایک پھیلی سی مسکراہٹ ابھری۔ "مُجھے اچھا کرنا ہی تھا۔"

"میں واقعی سچ کہہ رہا ہوں۔"

"میں بھی۔"وہ مزید کچھ کہے سنے آگے بڑھ گئی۔

سلال چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔آج اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوا تھا۔عالیہ کو جان بوجھ کر ٹریگر کیا جاتا تھا۔اسے نیچا دکھایا جاتا تھا۔اور کبھی کبھی کسی کو کم تر ثابت کرنے کے لیے اسے ڈانٹنا ضروری نہیں ہوتا۔صرف اس کی محنت کا اعتراف نہ کرنا ہی کافی ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

یہ رات کے نو بجے کا وقت تھا۔اس پرانے سے دو منزلہ مکان کے تہہ خانے میں قائم سیو ہیومینٹی این جی او کے کمرے میں جاگتی ہوئی روشنیاں کسی اور ہی جنگ کا پتہ دے رہی تھیں۔دیواروں پر فلسطین کا بڑا سا نقشہ چسپاں تھا،جس پر مختلف رنگوں کے پن سے میڈیکل ایڈ روٹس اور ریلیف کیمپس کے نشانات لگے ہوئے تھے۔کونے میں دوائیوں اور فرسٹ ایڈ کیٹس کے گتے کے بھاری بکس قطار در قطار رکھے تھے،جبکہ میزوں پر ہائی اسپیڈ کمپیوٹرز،سیٹلائٹ لنکس اور مائیکروفونز پھیلے ہوئے تھے۔سلال میز پر جھکا ہوا تھا۔سفید لیب کوٹ کی جگہ اس نے سیاہ ہڈی پہن رکھی تھی،جس کی آستینیں کوہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔اس کی آنکھیں نیند کی کمی کی وجہ سے سرخ تھیں۔وہ ایک ہاتھ سے پیپر ورک پر قلم چلا رہا تھا اور دوسرے سے انٹرنیشنل میڈیکل آرگنائزیشنز کی لسٹیں اسکین کر رہا تھا۔

"سلال بھائی!"

ایک کونے میں بیٹھے نوعمر ہیکر اور ایکٹوسٹ حمزہ کی آواز میں شدید جھنجھلاہٹ اور غصہ تھا۔

"مین اکاؤنٹ بھی بند کر دیا گیا! ساڑھے پانچ لاکھ فالوورز والا پیج...انسٹاگرام اور ایکس دونوں ایک ساتھ پر مینٹلی سسپنڈ ہو گئے ہیں۔الگورتھم نے ہماری نئی ویڈیو ہٹا دی ہے۔"

کمرے میں موجود دیگر چار پانچ لڑکے لڑکیوں نے،جو مختلف این جی اوز کے پلیٹ فارم سے ریلیف فنڈنگ اور آگاہی مہم

میں مصروف تھے، ایک لمحے کے لیے ہاتھ روک کر سلال کو دیکھا۔ یہ پچھلے دو مہینوں میں سلال کا پانچواں بڑا اکاؤنٹ تھا جسے بلاک کیا گیا تھا۔ وہ جس شدت اور بے باکی سے غزہ اور فلسطین کی نسل کشی کے خلاف بولتا تھا، صیہونی اور مغربی میڈیا کے الگورتھمز اسے خاموش کرنے کے لیے دن رات متحرک تھے۔ یہ سن کر سلال کے چہرے پر نہ کوئی صدمہ ابھرا، نہ ہی اس نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔ اس نے نہایت سکون سے قلم نیچے رکھا، اپنی گردن کو پیچھے موڑ کر دیکھا اور ایک پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"وہ ہمارے اکاؤنٹس بلاک کر سکتے ہیں حمزہ... اس سچ کو بلاک نہیں کر سکتے جو اس وقت تاریخ کے صفحات پر لکھا جا رہا ہے۔"

وہ اپنی کرسی سے اٹھا۔ اس کا وجود اس مدھم روشنی والے روم میں ایک ڈھال کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ حمزہ کی سکرین کے پاس آ کر کھڑا ہوا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"نیا ڈومین کھولو۔ متبادل انکرپٹڈ سرور آن کرو اور بیک اپ لسٹ میں موجود تینوں نئے اکاؤنٹس پر دوبارہ مواد اپ لوڈ کرنا شروع کر دو۔ وہ ایک راستہ بند کریں گے، ہم دس نئے راستے بنائیں گے۔ ہم گن لے کر میدان میں نہیں کھڑے تو کیا ہوا؟ یہ کی بورڈ، یہ کیمرہ اور ہماری آواز بھی اس دور کا ہتھیار ہے۔ ہم اس مظلومیت کی جنگ ہر محاذ پر لڑیں گے۔"

اس کے الفاظ میں ایسی حرارت سی تھی کہ کمرے میں پھیلی مایوسی لمحوں میں کافور ہو گئی۔ وہاں بیٹھے تمام لڑکے لڑکیوں کے چہروں پر ایک نیا جوش سا دوڑ گیا۔ وہ صرف ایک این جی او کے کارکن نہیں تھے... وہ اپنے اپنے محاذ کے مجاہد تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب قلم اور حق کی بات کو قید کیا جانے لگے، تو بولنا عبادت بن جاتا ہے۔ سلال نے ایک طرف رکھا ہوا فون اٹھایا، جہاں ترکی اور مصر کی سرحد پر کام کرنے والی ایک عالمی این جی او کے نمائندے کی کال آ رہی تھی۔ اس نے فوراً ہینڈز فری کان میں لگائی اور روانی سے انگریزی میں بات کرنا شروع کی۔

"جی... میں سلال بات کر رہا ہوں۔ ہماری ٹیم کی طرف سے تیار کردہ سرجیکل کیٹس اور ایمرجنسی بلڈ پلازما کی جو لسٹ میں نے بھیجی تھی، کیا اس کا شپمنٹ کل رفح بارڈر کے لیے کلیئر ہو رہا ہے؟" دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ سلال کے چہرے پر زندگی کی لہر سی دوڑی۔

"بہترین! ہمارے پاس جو فنڈز ڈیجیٹل مہم سے اکٹھے ہوئے ہیں، میں وہ ڈائریکٹ میڈیکل ایڈ اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر رہا ہوں۔ ہمیں کسی بھی قیمت پر دواؤں کی فراہمی رکنے نہیں دینی۔"

بات ختم کر کے اس نے کال کاٹی اور ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھایا۔

"سلال بھائی... کچھ لوگ کمنٹس میں دھمکیاں دے رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ ہماری لوکیشن ٹریس کر لی جائے گی۔" ایک

لڑکی نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر فکرمندی سے کہا۔سلال نے گلاس میز پر رکھا۔

"انہیں اگنور کرو۔"

وہ نقشے کی طرف بڑھا۔اس نے غزہ کے ایک شیلٹر ہوم پر انگلی رکھی اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے بولا۔

"اگلی ویڈیو کا ڈرافٹ تیار کرتے ہیں۔آج رات ہم نے دنیا کو بتانا ہے کہ ہم فلسطین کے حریت پسندوں کی آواز بن کر گونجتے رہیں گے۔"

کمرے میں ایک بار پھر کی بورڈز کی ٹک ٹک اور عزم سے بھری آوازیں گونجنے لگیں۔رات ڈھل رہی تھی مگر اس تہہ خانے میں موجود مجاہدین کا جذبہ صبح کے سورج سے بھی زیادہ روشن اور توانا تھا۔

☆.....☆.....☆

"میں نجف کو اس گھر میں لا رہا ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے پورا ہال جیسے برف کا بن گیا۔چائے کے کپ ہونٹوں سے لگے کے لگے رہ گئے،اور ایک بوجھل سکتہ پورے کمرے میں پھیل گیا۔سقراط،اس اعلان کے ردعمل سے واقف تھا۔مگر اسے...اسے یہ کرنا تھا۔یہ ضروری تھا۔اسے اپنی جنگ لڑنی تھی۔

" کیا کہا تم نے؟" دادی کی آنکھوں میں شدید صدمہ اور بے یقینی تھی۔حالانکہ انہیں اس کے لیے پہلے سے تیار رہنا چاہیے تھا مگر اتنا کچھ ہونے کے باوجود انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

" آپ نے بالکل ٹھیک سنا،اماں!" سقراط نے اپنے لہجے کی سختی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا،" نجف بزدار اس گھر میں آ رہی ہے۔وہ خود آنا چاہتی ہے۔"

"تمہارا دماغ ٹھکانے پر ہے سقراط؟تم کیوں دشمنی کو طول دے رہے ہو؟" سرمد صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔انہیں اپنے گھر کا سکون بہت عزیز تھا۔بہت مشکل سے ان کے بچوں کی زندگی نارمل ہونے لگی تھی اور سقراط؟ آخر وہ ہر بار ایسا کیوں کرتا تھا؟ وہ اتنا خودغرض کیوں تھا؟ ان کے سینے میں جلن اٹھی۔

"وہ تمہارے خون کی پیاسی ہے سقراط!میں اس ڈائن..."

"دادی پلیز!" نیمل نے ان کی بات کاٹ دی۔ "آپ بچوں کے سامنے ایسے نہیں بول سکتیں۔" اس نے تارہ اور نوفہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" کون بچہ ہے یہاں؟" دادی نے گھور کر اسے دیکھا۔ نیمل نے گہری سانس لی۔ سلال چپ تھا جبکہ نامرہ کے چہرے پر بھی ناگواری تھی۔ وہ اس خاندان کے کسی بھی شخص کو اپنی زندگی میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ نیمل نے نوفہ اور تارہ کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تو وہ دونوں منہ بناتیں وہاں سے اٹھ کر چکی گئیں۔ پھر نیمل نے سرمد صاحب کی جانب دیکھا۔

"اماں... ذرا تحمل سے بات کر لیتے ہیں۔" انہوں نے گلہ کنکھارتے سنجیدگی سے کہا۔ جبکہ دادی کا پارہ ابھی ساتویں آسمان پر تھا۔ انہوں نے چائے کا کپ زور سے میز پر پٹخا۔

"تم نے کہا تھا کہ صرف نام کا نکاح ہے۔ تم نے زہرہ کی خوشی کے لیے کیا، اب زہرہ نہیں رہی تو اس رشتے کا کوئی بھی فایدہ نہیں ہے۔ اسے طلاق دو اور یہاں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"دادی ٹھیک کہہ رہی ہیں... امی نہیں رہیں تو انکی خواہشات کا ہم کیا کریں گے؟" نامرہ نے قدرے دادی کے قریب ہوتے کہا۔

"میرے خیال سے تم چپ رہو نامرہ!" سلال نے اسے خاموش کروانا چاہا۔

" کیوں چپ رہوں میں؟ بچی نہیں ہوں۔ اس گھر کا فرد ہوں۔ اس گھر کے معاملات میں میری بھی رائے ہونی چاہیے۔ سب کچھ امی کے ساتھ تھا۔ امی نہیں رہیں تو کچھ نہیں رہا۔" وہ سلال کو گھورتے ہوئے بولی تو نیمل اسکے لہجے اور انداز پہ پل بھر کو ساکت ہوئی۔ ایسا ہی ردعمل سلال کا بھی تھا۔ سقراط اپنے پیروں کے انگھوٹے پہ نظریں جمائے جھکا ہوا بیٹھا تھا۔ اسکے ہاتھ آپس میں بند تھے جبکہ جبڑا بھنچا ہوا تھا۔

"سقراط! میرے بچوں نے بہت مشکل سے دوبارہ مسکرانا شروع کیا ہے۔ تم اپنے ماضی کے، دفن شدہ گناہوں کو مت کھودو۔" سرمد صاحب کے الفاظ ایسے تھے کہ سقراط نے اذیت سے آنکھیں میچیں۔

"بس کریں آپ سب..." نیمل ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "خدا کا واسطہ ہے بس کریں۔" اسکا چہرہ سرخ پڑ چکا تھا جبکہ تنفس تیز ہوا۔ اس نے بے یقینی سے لاؤنج میں بیٹھے سبھی افراد کو دیکھا۔

"وہ کونسا جرم ہے جسکی سزا چاچو دس سالوں سے بھگت رہے ہیں؟ سقراط یہ، سقراط وہ، سقراط کے گناہ، سقراط کا جرم... بس

کر دیں۔ کیسے گھر والے ہیں آپ لوگ؟" اس بار واقعی اسے حیرت ہوئی اور سب سے زیادہ حیرت اسے سرمد صاحب کے رویے پر ہوتی تھی۔ وہ ایک اچھے باپ تھے مگر بھائی کے معاملے میں وہ جیسے اندھے، گونگے اور بہرے بن جاتے تھے۔ انہوں نے کبھی سقراط کا یقین نہیں کیا تھا۔ سقراط کی جھکی آنکھوں میں نمی سی ابھری۔ اسکے سینے کے مقام پر درد سا اٹھا تھا۔

"تم مت بھولو نیمل کہ تمہاری شادی بھی اسی کی وجہ سے ٹوٹی ہے۔" سرمد صاحب کو آج بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔ انہوں نے لرزتے ہاتھ سے سقراط کی جانب اشارہ کیا۔ وہ الزام دے رہے تھے، سقراط الزام لے رہا تھا۔

"میری شادی، آپ کے پسند کیے گئے لڑکے کی کم ظرفی کی وجہ سے ٹوٹی ہے ابو!" وہ اس قدر ٹھنڈے لہجے میں بولی کہ سرمد صاحب ساکت رہ گئے۔ وہ جو سقراط کو مزید کچھ کہنے والے تھے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔
"میری شادی میرے اپنے فیصلے کی وجہ سے ٹوٹی ہے۔ اس میں کسی تیسرے کا ہاتھ نہیں ہے۔" اس نے ایک طائرانہ نظر سب پر ڈالی۔ سقراط یونہی بیٹھا تھا۔
"ہم اپنے گناہوں کا بوجھ دوسروں پہ ڈالنا کب بند کریں گے؟" اس نے تاسف سے کہا اور پھر سقراط کی طرف دیکھا۔ "جتنا یہ گھر ہمارا ہے، اتنا چاچو کا بھی ہے۔ انہیں پورا حق ہے اپنی مرضی سے شادی کرنے کا اور اپنی بیوی کو اس گھر میں لانے کا۔ اس پر مزید بحث نہیں ہوگی۔" اس نے سینے پر بازو باندھتے گویا فیصلہ سنایا۔

"اگر ایسا ہوگا تو پھر ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے۔" دادی نے نخوت سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپکا سامان پیک کر دیتی ہوں۔ آپ سکندر چچا کی طرف رہ سکتی ہیں۔" اسکے پرسکون لہجے میں کہنے پر دادی ہکا بکا رہ گئیں۔ نیمل نے رخ سرمد صاحب کی طرف کیا۔
"آپ تو فیکٹری میں رہ لیں گے نا؟" سلال کے لبوں پر دھیمی سے مسکراہٹ ابھری۔ ٹیڑھے گھر والوں کو سیدھے طریقے سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔

"اور تم نامرہ! تم فیصلہ کر لو، تمہیں دادی کے ساتھ جانا ہے یا ابو کے؟" اس نے جتاتی نظر نامرہ پہ ڈالی جبکہ سقراط نے ایک گہری

سانس لی۔

"جس کو جہاں جانا ہے وہ جا سکتا ہے۔ چاچو اپنے گھر میں رہیں گے اور انکی بیوی ان کے ساتھ رہے گی۔ اور اپنا گھر چھوڑنے والے سب سے بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔ مُجھے مزید کچھ نہیں کہنا۔" اس نے گویا بحث ختم کر دی۔ سقراط اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک نظر نیمل کو دیکھا اور پھر بنا کچھ کہے اپنے پورشن کی جانب بڑھ گیا۔

"سلال! چلو آؤ ہم کل کی کچھ پلاننگ کرتے ہیں۔"

"او کے مالک!" سلال سلیوٹ مارتے ہوئے اٹھا۔ نیمل، سقراط کے پیچھے سیڑھیوں کی جانب بڑھی تھی۔ سلال نے بھی اسکی پیروی کی۔ اب لاؤنج میں تین نفوس باقی رہ گئے تھے۔ سرمد صاحب، پھیکی سی خفت زدہ مسکراہٹ لیے اٹھے اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ ان کے جاتے ہی نامرہ نے دادی کے قریب ہوتے ان کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔

"چولہے میں جائیں سب دادی! میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"ہاں کل کو تم بھی انہی کا ساتھ دو گی۔" دادی کا لہجہ بھرا گیا۔ "پتا نہیں کیا جادو کیا ہے اس نے میرے بیٹے پر... جو ابھی تک نہیں بھولا اسے۔" وہ روہانسی سی بول رہی تھیں۔ نامرہ کو ان پر ترس آیا۔

"کوئی نہیں دادی آنے دیں اسے۔ جینا حرام کر دیں گے۔" نامرہ نے انہیں ریلیکس کرنا چاہا۔

"ارے بھئی مُجھے نہیں رہنا اس گھر میں۔ جاؤ میرا سامان پیک کرو، میں اپنے نیپال واپس جاتی ہوں۔"

"دادی... اس میں تو وقت لگ جائے گا اور آپ اپنی جگہ کیوں چھوڑ رہی ہیں؟ آپ اس گھر کی مالکن ہیں۔ آپ کیوں جائیں گی؟" نامرہ بنا جھجکے بول رہی تھی جبکہ دادی نے گہرا سانس لیا۔ ان کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہرائیں۔ درست کہہ رہی تھی نامرہ۔ بھلا وہ اپنا گھر کیوں چھوڑیں؟

"آنے دو اس بزدارنی کو۔ دیکھ لوں گی۔" وہ ذرا دھیمے لہجے میں چبا چبا کر بولیں تو نامرہ مسکرا دی۔

"اب لگا نا کہ آپ میری دادی ہیں۔" نامرہ نے ہنستے ہوئے انگلا گال چوما تو دادی کے تنے ہوئے تاثرات ذرا ڈھیلے پڑ گئے۔

"لیکن تم کیوں اتنا چپک رہی ہو؟ تمہیں کیا چاہیے؟" اس بار دادی نے ذرا ٹھٹکتے ہوئے پوچھا۔ نامرہ نے بتیسی دکھائی۔

"تھوڑے سے پیسے..." وہ دادی کی جانب جھکتے ہوئے بولی۔

"تم بہت مطلبی ہو لیلی!" دادی نے خفا نظروں سے اسے گھورا۔

"پوتی کس کی ہوں؟" نامرہ چہک کر بولی۔ "اب بتائیں آپ کے پاس کتنی سیونگ ہے؟" ان کی دونوں کی بات کا رخ پلٹ چکا تھا جبکہ باقی گھر میں فی الوقت خاموشی کا راج تھا۔

☆.....☆.....☆

"میرا دم گھٹتا ہے۔ مُجھے ماحول بدلنے کی ضرورت ہے۔" جیسا ڈرامہ شبگیر ہاؤس میں ہوا تھا اس سے بڑھ کر بزدار پیلس میں لگنے والا تھا۔ نجف، وہاں موجود تھی۔ اس نے بات کا آغاز کچھ اس انداز میں کیا تھا۔

" کہاں جاؤ گی؟" امجد بزدار سنجیدہ تھے۔ اونچی چھت والے ٹی وی لاؤنج میں، امجد بزدار اور نجف، دو نفوس ہی موجود تھے۔ سوال ایسا تھا کہ نجف پل بھر کو خاموش ہوگئی۔ سمجھ نہیں آیا کیسے کہے۔ کیا کہے۔

"اگر تمہیں ماحول بدلنا ہے تو جرمنی واپس چلی جاؤ! ہیمبرگ تمہارا دوسرا گھر ہے۔ میں کل تک سارے انتظامات کر دوں..."

"میں زہرہ آپا کے گھر جانا چاہتی ہوں۔" اس نے امجد بزدار کی بات کاٹ دی۔ پس منظر میں ٹی وی کی آواز مدھم ہونے لگی۔ امجد صاحب نے ہونٹ بھینچ کر خود پر ضبط کیا۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ سقراط کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ اس نے زہرہ بیگم کا نام استعمال کیا تھا۔

"اس چھوٹے سے ڈربے میں تمہیں اپنا سکون ملے گا؟" وہ تلخی سے مسکرائے۔

نجف کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ "میں نہیں جانتی۔" اس نے چند لمحے رک کر بات جاری رکھی۔ "لیکن اتنا جانتی ہوں کہ میں کچھ وقت کے لیے یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔"

"مُجھے مزید رسوا مت کرو نجف! مُجھے کوئی سنگین قدم اٹھانے پہ مجبور مت کرو۔" انہوں نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی آواز بڑھا دی۔ نجف نے انہیں دیکھا۔ چند لمحے وہ کھڑی رہی۔ پھر اس کی آواز میں تھکن اتر آئی۔

"میں آپ سے نہیں لڑ سکتی اور نہ لڑنا چاہتی ہوں۔ آپ اپنی شادی شدہ بیٹی کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔" ٹی وی کا شور زیادہ تھا۔ نجف کی آواز اونچی ہوگئی۔ یوں تو پھر یونہی سہی۔ اسی لمحے ٹی وی لاؤنج کا دروازہ جھٹکے سے کھلا۔ دونوں نے بیک وقت دروازے کی طرف دیکھا۔ دہلیز پر نشاط کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا، مگر آنکھوں میں اس سے کہیں زیادہ دکھ۔ وہ چند لمحے نجف کو گھورتی رہی۔ پھر اس کی آواز نکلی۔

"تم ایسا کیسے کر سکتی ہو؟" وہ غرائی تھی۔ نجف خاموش رہی۔ نشاط اندر داخل ہوئی۔

"پہلے تم نے اس شخص سے نکاح کر کے مُجھے کچوکے لگائے، اور اب تم نے اس رشتے کو نبھانے کا سوچ بھی لیا ہے؟"

"نشاط..." نجف نے کچھ کہنا چاہا مگر نشاط نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"آج میری بات سنو۔" وہ قدم آگے دھرتی ہوئی نجف کے قریب آئی۔

وہ اپنے مارننگ شو کی شوٹنگ سے واپس لوٹ رہی تھی جب اسے انجان نمبر سے فون آیا تھا۔ اسکا ارادہ بزدار پیلس آنے کا ہرگز نہیں تھا مگر بار بار بجنے والے فون نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"ہیلو..." اس نے فون کان سے لگاتے کہا۔ بھورے بالوں کو اچھے سے بلو ڈرائی کیا گیا تھا۔

"نشاط بات کر رہی ہیں؟" ایک نسوانی آواز دوسری جانب سے ابھری۔

"تم کون ہو؟" نشاط نے الٹا سوال کیا۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر آواز دوبارہ سنائی دی۔

"میں نامرہ شبگیر بات کر رہی ہوں۔" یہ نام سنتے ہی نشاط کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی مُجھے فون کرنے کی؟ ہاؤ ڈیئر یو؟" شبگیر کا نام سنتے ہی نشاط کے اندر جیسے زہر پھیل گیا۔

"آپ کو فون پر پھنکارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا زہر مجھ تک نہیں پہنچے گا لیکن آپ کی بہن ضرور آپ کو ڈسنے کی تیاری کر رہی ہے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو لڑکی؟ تم ہوش میں ہو؟" نشاط کا دماغ الٹ چکا تھا۔

"میں ہوش میں ہوں لیکن آپ ہوش کے ناخن لیں۔ اپنی بہن کو ہمارے گھر آنے سے روکیں۔ آپ کی بہن، ایسے شخص کے ساتھ شادی شدہ زندگی کا آغاز کرنے جا رہی ہے جس پر آپ نے سیکسوئل اسالٹ کا کیس کیا تھا۔ جو آپ کا مجرم ہے۔ کیسی بے شرم ہیں آپ؟ آپ کو ذرا فرق نہیں پڑتا؟ اور آپ کی بہن آپ سے بھی زیادہ..."

ٹوں...ٹوں...ٹوں...نشاط نے ایک جھٹکے سے فون کاٹ دیا۔ اسکا چہرہ غصے سے سرخ ہو کر پھٹنے والا ہو چکا تھا اور اسکے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ اس نے ضبط کرنے کی کوشش کی مگر ہوا نہیں۔ اس نے ہیجانی انداز میں سامنے والی سیٹ پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی تھی۔ وہ اس وقت کہیں سے بھی نشاط صبح شو کی باوقار نشاط نہیں لگ رہی تھی۔ ڈرائیور نے گھبرا کر گاڑی روکی۔ اب وہ اپنا سر پکڑے پکڑے زور زور سے سانس لے رہی تھی۔

"بزدار پیلس چلو..." اس نے ڈرائیور کر حکم دیا اور گہری سانسیں لے کر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ اور اب وہ بزدار پیلس

میں موجود تھی۔ نجف کے عین سامنے کھڑی تھی۔

"تم اپنی بہن کے ریپسٹ کے ساتھ کیسے رہ سکتی ہو؟"

الفاظ ایسے تھے نجف کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ امجد بزدار بھی خاموش رہے۔ نشاط کی آواز میں اب غصے کے ساتھ آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"تمہیں گھِن نہیں آتی؟"

نجف نے نظریں نہیں چرائیں۔ وہ سفید چہرہ لیے کھڑی تھی۔ اندر کہیں طوفان اٹھ رہا تھا لیکن... اسے اس طوفان کو دبا کر کنویں میں چھلانگ لگانی تھی۔

"مُجھے تو کبھی کبھی تم سے بھی گھِن آنے لگتی ہے۔" نشاط ہنسی، مگر وہ ہنسی ٹوٹتی ہوئی تھی۔

"نشاط! زبان سنبھال کر بات کرو۔" امجد بزدار نے سختی سے اسے ٹوکا۔ جبکہ نشاط کی نگاہیں نجف پر جمی تھیں۔

"تمہیں یاد ہے نا وہ رات؟ تمہیں یاد ہے میری حالت؟ تم نے مُجھے دیکھا تھا۔ تم جانتی ہو میں کن حالات سے گزری ہوں۔"۔

نجف خاموش سے اسے تکے جا رہی تھی۔ اسکی آنکھوں میں کچھ تھا۔ کچھ ایسا جسے نشاط نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کی لیے منہ کھولا اور پھر ہونٹ آپس میں پیوست کر لیے۔ مٹھّیاں زور سے بھینچ لیں۔

"اور آج تم اسی آدمی کے ساتھ رہنے جا رہی ہو؟"

"میں اس کے ساتھ اس لیے نہیں جا رہی کہ تمہارے ساتھ جو ہوا وہ غلط نہیں تھا۔"

نجف کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں بہنیں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ بھورے بالوں والی اور شہد رنگ بالوں والی! دو جڑواں بہنیں۔ نجف نے مزید ایک قدم آگے بڑھایا۔ ان دونوں کے درمیان نظر آتا امجد بزدار کا عکس دھندلا گیا۔

"میں صرف اپنے لیے فیصلہ کر رہی ہوں۔"

"اپنے لیے؟" نشاط نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اسکا لہجہ استہزائیہ تھا۔ "تو میری بہن ہونے کا حق کب ادا کرو گی؟"

نجف کے ہونٹ پھر سے بھینچ گئے۔ وہ نشاط کو دیکھے گئی۔

"ہر رشتہ تمہاری تکلیف کا بوجھ اٹھا کر نہیں چل سکتا، نشاط!"

"تو میں بوجھ ہوں؟" نشاط کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔"

"لیکن مطلب یہی ہے!" نشاط کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"تم ہمیشہ سے ایسی ہی تھیں۔ جب مُجھے تمہاری ضرورت تھی، تم جرمنی بھاگ گئیں۔ اب جب میں نے سوچا تھا کہ کم از کم میری بہن میرے خلاف نہیں ہوگی، تم نے اسی آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا جس نے میری زندگی برباد کی تھی۔"

نجف نے ایک گہری سانس لی۔ "بس کرو نشاط!"

"کیوں؟ سچ سننے کی عادت نہیں ہے؟" نشاط کی آواز پھر بلند ہوئی۔ "تم جانتی ہو نا لوگ کیا کہیں گے؟ واہ ڈاکٹر نجف بزدار! تم نے تو سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔"

"جب میری زندگی بکھر رہی تھی، تب بھی لوگ باتیں کر رہے تھے۔ جب میں موت کی سیج پر تھی تب بھی لوگوں نے باتیں کی، آج میں جب کسی اور کے دل کے ساتھ جی رہی ہوں لوگ تب بھی باتیں کر رہے ہیں۔" نجف خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"اگر میری پوری زندگی لوگوں کے منہ بند کرنے میں گزر رے گی تو پھر میں اپنی زندگی کب جیوں گی؟"

نشاط نے تاسف سے سر ہلایا۔ "تم بدل گئی ہو۔"

"میرا دل پانچ سال پہلے ہی بدل گیا تھا۔"

"تم خود غرض ہو نجف! تم نے آج مُجھے بہت تکلیف دی ہے۔"

"تمہارے زخم بھرنے کے لیے میں خود کو مزید زخمی نہیں کر سکتی۔"

نشاط ساکت رہ گئی جبکہ امجد بزدار اب ٹانگ پر ٹانگ جمائے، سوچتی نگاہوں سے اپنی دونوں بیٹیوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو آج ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔

"تمہیں حق ہے کہ تم اسے معاف نہ کرو، نشاط... لیکن تمہیں یہ حق نہیں کہ میری زندگی کو سزا بنا دو۔" نجف نے دھیرے سے کہا اور وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ دروازہ بند ہو گیا اور پھر نشاط غصے سے امجد بزدار کی جانب پلٹی۔

"آپ چپ کیوں ہیں ڈیڈ!" وہ غصے سے زیادہ ان کے رویے پر حیران تھی۔ امجد بزدار نے اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ سے اتارتے ہوئے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نشاط اپنی مٹھیاں بھینچتی، چند قدم چلتے ہوئے ان کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ امجد بزدار نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

نامرہ نے اپنی دائیں بغل میں فون دبایا ہوا تھا۔ وہ چپکے سے دبے قدموں کمرے میں داخل ہوئی اور کسی کے دیکھنے سے پہلے جلدی سے پیچھے مڑ کر دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

"کام ہو گیا دادی..." نامرہ نے دادی کے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے پراسرار سرگوشی کی۔ دادی نے اپنے نظر کے چشمے کے اوپر سے اسے دیکھا اور انتہائی رازدانہ انداز میں پوچھا۔

"پکی بات ہے نا لیلیٰ؟"

"ہاں دادی... بالکل پکا!" نامرہ کے چہرے پر فاتحانہ چمک ابھری۔ اس نے فوراً جوتے اتارے اور دادی کے نرم بستر میں گھس کر بیٹھ گئی۔ دادی نے کمبل کا ایک کونہ اس کے شانوں پر درست کیا۔

"لیکن تمہارے اس چھوٹے سے دماغ میں یہ شاطرانہ خیال آیا کہاں سے؟"

نامرہ نے کمبل میں سکڑ کر، اپنے دونوں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھے اور دادی کی طرف رخ کیا۔

"دادی! میں نے ایک بار ایک قصہ پڑھا تھا... ایک دفعہ کسی نے چپکے سے ایک دیوار پر تھوڑا سا شہد لگا دیا۔ شہد کی بو سونگھ کر وہاں مکھیاں آ گئیں۔ مکھیوں کو کھانے کے لیے چھپکلی آئی، چھپکلی کو پکڑنے چوہا نکل آیا... چوہے پر جھپٹنے کے لیے بلی آ گئی اور بلی کو دیکھ کر پڑوسی کا کتا اس پر ٹوٹ پڑا۔ پھر بلی کے مالک اور کتے کے مالک کے درمیان ایسی خونریز جنگ چھڑی کہ بلی کا مالک مارا گیا اور کتے کا مالک عمر بھر کے لیے جیل چلا گیا... مگر مزے کی بات یہ ہے دادی، کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ دیوار پر شہد کس نے لگایا تھا۔"

نامرہ نے ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ دادی کے چہرے کو دیکھا۔ "میں نے بس وہی شہد لگایا ہے دادی...!" یہ کہتے ہی اس نے خوشی اور اطمینان کے مارے اپنا چہرہ کمبل میں چھپا لیا۔ دادی کے چہرے پر بھی شادمانی اور حیرت کی لہر دوڑ گئی۔

"واہ میری لیلیٰ! مُجھے تم پر ناز ہے۔"

نامرہ نے کمبل سے تھوڑا سا منہ باہر نکالا۔ اس بار اس کے تاثرات میں ہلکی سی ندامت ابھری، مگر پھر اس نے فوراً ہی ناک سکیڑ کر کہا۔

"مُجھے تھوڑا برا بھی لگ رہا ہے... لیکن سچ کہوں دادی، مُجھے اپنی یہ سوتیلی خالائیں زہر لگتی ہیں۔"

"ہاں تو مُجھے کون سا شہد لگتی ہیں؟ میرے لیے بھی زہر کا پیالہ ہی ہیں۔" دادی بھی ذرا نیچے ہو کر بستر پر لیٹتے ہوئے بولیں۔ نامرہ نے کھلکھلا کر دادی کے گرد اپنے بازو حمائل کیے۔

"اچھا چھوڑیں ان کے قصے! اب آپ مُجھے کوئی اچھی سی کہانی سنائیں... اور پلیز! اس بار وہ ماہ نور اور وحشی درندے والی کہانی

بالکل نہیں۔ میں سن سن کر پک چکی ہوں۔"

دادی نے ایک بار پھر مصنوعی خفا ہونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے برا سا منہ بنایا، اپنا چشمہ اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا، اور نامرہ کے بالوں میں شفقت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے دھیمے، سحر انگیز لہجے میں کہانی کا آغاز کیا۔

"اچھا تو سنو! ایک دفعہ کا ذکر ہے..."

کہانی کا آغاز ہو چکا تھا۔ وقت تیزی سے اڑا، پہلے دروازے کی جانب، پھر لاؤنج اور پھر سیڑھیوں کی جانب بھاگا۔ اوپری پورشن کا لاؤنج اس وقت بالکل پرسکون تھا۔ ایک طرف وہ کمرہ بند تھا جہاں نیمل کے جہیز کا سامان رکھا گیا تھا۔ فرنیچر تو واپس شوروم چلا گیا تھا جبکہ باقی تمام سامان ایک کمرے میں سمیٹ کر بند کر دیا گیا تھا۔ اس پورشن میں اس کمرے کے علاوہ ایک لائبریری، تین بڑے کمرے اور ایک ڈرائنگ روم تھا۔ ایک میں سلال رہتا تھا، ایک میں سقراط، جبکہ باقی کمرے خالی تھے۔ نیمل لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی، ہاتھ میں ڈائری تھامے کچھ نوٹ کر رہی تھی۔ سلال پاس ہی بیٹھا لاؤنج کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں کل صبح یہاں کی اچھے سے صفائی کرواتی ہوں۔" نیمل نے ڈائری پر قلم چلاتے ہوئے کہا۔ سلال نے چند لمحے سوچا اور پھر گویا ہوا۔

"میرے خیال سے میں اب نیچے شفٹ ہو جاتا ہوں۔ میں اوپر رہوں تو اچھا نہیں لگتا۔" سقراط اور نجف کی پرائیویسی کا خیال سلال کے لہجے سے عیاں تھا۔ نیمل نے اس کی بات سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"مُجھے لگتا ہے، چاچو کل شام میں لینے جائیں گے۔" نیمل نے سوال کیا۔

"ہوسکتا ہے۔" سلال نے جواب دیا۔ نیمل نے ڈائری میں کچھ مزید درج کیا۔

" کل میں یہاں نئے پردے لگوا دوں گی۔ میرا کافی سامان پڑا ضائع ہو رہا ہے۔ یہاں کافی نئی چیزوں کی ضرورت ہے تو میرے خیال سے وہی استعمال کیا جائے۔"

سلال نے لاؤنج کے در و دیوار کا جائزہ لیتے شبہ ظاہر کیا۔ "خالہ تو محل میں رہتی ہیں۔ پتا نہیں انہیں یہ سب اچھا لگے گا یا نہیں۔"

اس بات پر نیمل نے ایک گہری سانس لی۔

"انہوں نے یہ زندگی خود چنی ہے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔" پھر ذرا رک کر بولی، "میں کل کے لیے کیک کا آرڈر دیتی ہوں... انہیں ویلکم کرنے کے لیے کچھ تو ہونا چاہیے۔"

"ہمیں ایک بہت اچھی بیکری کا پتا ہے۔ وہ اچھا کیک بناتے ہیں۔ کیا ہم وہاں سے آرڈر کر سکتے ہیں؟" عقب سے آنے والی

معصومانہ آواز پر دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ سیڑھیوں کے قریب تارہ اور نوفہ کھڑی تھیں، ان کے چہروں پر خاصی دلچسپی اور جوش تھا۔

"ہاں کیوں نہیں!" انہیں دیکھ کر سلال مسکرایا۔ "آجاؤ، ابھی دیکھ لیتے ہیں۔"

سلال نے فون نکالا تو وہ دونوں فوراً بھاگتی ہوئی آئیں اور اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر وہ کیک کے ڈیزائن دیکھ رہی تھیں۔ تبھی سقراط کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ باہر نکلا، اسکے سر پہ تولیا تھا۔ وہ نہا کر آیا تھا اور اب تولیے سے اپنے بال رگڑ رہا تھا۔ ان چاروں بہن بھائیوں کو دیکھا تو ٹھٹک گیا۔

"ارے واہ! آج تو اوپر رونق لگی ہے۔" اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

"آپ خالہ کو کل کس ٹائم لینے جائیں گے؟" نیمل نے ڈائری پر نظریں جمائے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جب میڈم حکم دیں گی۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا تو نیمل کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ٹھیک ہے، کل آپ اپنا کمرہ لاک مت کیجیے گا۔ میں اچھے سے صفائی کرواؤں گی۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے صفائی کی۔ سب صاف ستھرا تو ہے۔" سقراط نے تولیہ شانے پر ڈالتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

"نئی دلہن کا استقبال اچھے سے کیا جاتا ہے۔ آپ کو کیا پتا۔" نیمل نے شستہ انداز میں جواب دیا۔ جبکہ سلال، نوفہ اور تارہ فون کی سکرین پر متعلقہ بیکری سے ایک ایک کیک کا ڈیزائن دیکھ کر آپس میں بحث کر رہے تھے۔ سقراط نے ان کی ان کوششوں کو دیکھا۔

"تم لوگ جتنی بھی محنت کر لو، اس محترمہ کو اس گھر سے بدبو ہی آئے گی۔"

"گھر سے نہ آئے، لیکن آپ کے ہر وقت بند رہنے والے کمرے سے آ سکتی ہے۔" سقراط نے جل کر نیمل کو دیکھا، ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر گہری سانس لی۔

"تم واقعی سمجھتی ہو کہ وہ اپنے محل شاہانہ ماحول چھوڑ کر یہاں اس پورشن میں ہمارے ساتھ خوش رہے گی؟"

"وہ خوش رہنے آ بھی نہیں رہی ہیں چاچو! باقی رہی ان کی پسند یا ناپسند... تو اس کا جواب وقت خود دے گا۔"

"چاچو! اور ہم نے چاکلیٹ کرنچ کیک چنا ہے... وہ سب سے بہترین ہے۔" تارہ نے موبائل کی اسکرین باری باری، نیمل اور سقراط کی جانب کی۔ سقراط نے بچوں کا جوش اور نیمل کا پرخلوص انداز دیکھا تو اس کے چہرے کی سختی اور تلخی تھوڑی مدہم ہوئی۔ اس نے نیمل کی طرف دیکھا اور پھیکا سا مسکرایا۔

"تمہیں دیکھ کر زہرہ بھابھی کی یاد آ رہی ہے۔ لیکن تم اپنی بات منوانا جانتی ہو۔"

"اگر میری بات منوانے سے اس گھر کی شان قائم رہتی ہے، تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" نیمل نے ڈائری اور قلم سمیٹتے ہوئے کہا اور صوفے سے اٹھی۔ "اب آپ جا کر آرام کریں، کل کا دن ہم سب کے لیے بہت اہم اور لمبا ہے۔"

سقراط نے ایک اور گہری سانس لی، اپنے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے دھکیلا اور کچھ کہے بغیر خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ نیمل، سلال اور بچیاں بھی کل کی آمد کی تیاریوں کو حتمی شکل دینے میں مصروف ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

بزدار اسپورٹس کالج کا کشادہ اسٹیڈیم تماشائیوں کے شور اور سیٹیوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ آج سالانہ ہاکی ٹورنامنٹ کا باقاعدہ پہلا میچ تھا۔ پہلا میچ بزدار اسپورٹس کالج بمقابلہ پنجاب اسپورٹس کالج تھا۔ گراؤنڈ کے سرسبز ایسٹروٹرف پر دونوں ٹیموں کے کھلاڑی پوری توانائی اور مستعدی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے، جبکہ باقی ٹیمیں اور ان کے کوچز بھی اسٹینڈز میں موجود میچ کا باریک بینی سے جائزہ لے رہے تھے۔

میچ کا پہلا ہاف اپنے عروج پر تھا۔ ثالث بزدار، نیلے اور سفید رنگ کی کٹ میں ملبوس، سینٹر فارورڈ پوزیشن پر زبردست فارم میں کھیل رہا تھا۔ اس کی ہاکی اسٹک کی تیز رفتار ڈربلنگ اور بال پر مکمل کنٹرول نے مخالف ٹیم کو دفاعی پوزیشن پر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گراؤنڈ کے کنارے پر کھڑا ان کا انگریز کوچ ملر، نہایت متحرک اور الرٹ انداز میں ہاتھوں سے اشارے کرتے ہوئے اونچی آواز میں مسلسل ہدایات دے رہا تھا۔

Move fast, Salis! Hold the line!

اسٹیڈیم کے درمیانی انکلوژر میں عالیہ اور اس کی بیسٹ فرینڈ زنیرہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب بھی ثالث بال کو لے کر مخالف ٹیم کے ڈی (D) کی طرف بڑھتا، عالیہ اور زنیرہ باقی تماشائیوں کے ساتھ مل کر زوردار ہوٹنگ کرتیں اور تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتیں۔ ہوٹنگ کرتے کرتے عالیہ کا ذہن ایک لمحے کے لیے بھٹک گیا۔ اس کی نظریں گراؤنڈ پر تھیں، مگر اسکا دماغ کہیں اور تھا۔ اپنے اندر اتری تلخی اور بوجھ کو دبانے کے لیے اس نے گہری سانس لی اور اپنا رخ برابر میں بیٹھی زنیرہ کی طرف موڑ دیا۔ زنیرہ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ نہ صرف عالیہ کی بہترین دوست تھی بلکہ پچھلے کچھ عرصے سے ثالث کو پسند بھی کرتی تھی۔ عالیہ یہ بات بہت اچھے سے جانتی تھی، اگرچہ اس نے پہلے کبھی اس کا ذکر زبان پر نہیں لایا تھا۔ اس وقت بھی زنیرہ چمکتی ہوئی نگاہوں سے گراؤنڈ میں دوڑتے ہوئے ثالث کو تک رہی تھی، اس کا پورا دھیان صرف ثالث کی ایک

ایک حرکت پر تھا۔ عالیہ نے ہلکا سا گلا کھنکارا۔

"میرا بھائی ہینڈسم ہے نا...؟"

اس غیر متوقع اور اچانک سوال پر زنیرہ شدید حیران ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں تھما پمفلٹ رک گیا اور اس نے گھبرا کر عالیہ کو دیکھا۔ اسٹیڈیم کا شور جیسے ساکت ہو گیا۔

"میں جانتی ہوں تم اسے پسند کرتی ہو۔" عالیہ نے نہایت بے نیازی اور سکون سے کہتے ہوئے سامنے گراؤنڈ کی طرف دیکھا۔ زنیرہ کا چہرہ لمحوں میں سرخ پڑ گیا۔ اس کی نظریں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں اور اس نے بے ساختہ اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔

"عالیہ...تم یہ..."

"مُجھے تم پسند ہو زونی! میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی ہوں...لیکن بدلے میں تمہیں بھی میرے لیے کچھ کرنا ہوگا۔"

اس بار زنیرہ نے رخ موڑ کر حیرت اور تذبذب سے اپنی دوست کو دیکھا۔ عالیہ کی گردن سیدھی تھی اور وہ سامنے گراؤنڈ پر جمے کھلاڑیوں کو دیکھ رہی تھی، مگر اس کے تاثرات بالکل سرد تھے۔ زنیرہ نے ایک نظر گراؤنڈ میں ہاکی اسٹک سنبھالے ثالث کو دیکھا، اور پھر دوبارہ عالیہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"مُجھے ...مُجھے کیا کرنا ہوگا؟"

عالیہ کے لبوں پر ایک نہایت مدہم، پراسرار مسکراہٹ ابھری۔ اس نے ایک لمحے کے لیے رخ موڑ کر زنیرہ کی آنکھوں میں دیکھا۔

"جلد بتاؤں گی۔"

اور پھر بغیر کسی مزید وضاحت کے، اس نے اپنا رخ دوبارہ اسٹیڈیم اور شور مچاتے گراؤنڈ کی جانب کر لیا، جہاں ثالث نے ابھی ابھی پہلا گول داغ کر پورا اسٹیڈیم سر پر اٹھا لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

کرسٹل کے فانوس کی روشنی میں دو سیاہ سوٹ کیس بالکل تیار رکھے تھے۔ ملازم سامان اٹھانے کے لیے آگے بڑھے، مگر نجف نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں وہیں روک دیا۔ اس کے چہرے پر خاموشی تھی اور الجھن بھی۔ اگر وہ نہ آیا تو؟ پھر اس کی انگلیاں اسکرین پر تیزی سے پھسلنے لگی۔

"تم آ رہے ہو؟" اس نے سقراط کو میسج ارسال کیا۔ چند ہی لمحوں بعد میسج ٹون بجی۔

"میں بس پہنچ گیا ہوں۔" نجف نے ایک گہری سانس خارج کی اور ملازم کو اشارہ کیا۔ ملازم سوٹ کیس گھسیٹتے ہوئے ڈریسنگ روم سے متصل راہداری کی طرف بڑھ گئے۔ نجف نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔ وہ قدرے اونچائی والے لاؤنج کی سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اس کے قدم اچانک ٹھٹک گئے۔ نیچے لاؤنج کے وسط میں اس کے دونوں سوٹ کیس رکھے تھے اور نیلوفر بیگم کا غصے سے پھٹتا ہوا چہرہ ملازموں پر برس رہا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے بغیر پوچھے یہ سامان یہاں سے لے جانے کی؟"

نجف نے ایک لمحہ رک کر اس منظر کو دیکھا، پھر بوجھل قدم اٹھاتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

"میرا سامان باہر لے جائیں۔" اس نے ملازم کی جانب اشارہ کیا، جو نیلوفر بیگم کے خوف سے شدید تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا اور باری باری دونوں کو تک رہا تھا۔

"اگر تم اس گھر سے جا رہی ہو نجف... تو پھر یہاں کا سامان یہیں چھوڑ کر جاؤ۔ میں بھی دیکھتی ہوں ان سب کے بنا تم جیسے جی پاتی ہو۔" نیلوفر بیگم کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا اور پھنکارتا ہوا تھا۔ نجف کے قدم رک گئے۔

"آپ کو غلط فہمی ہے کہ میں یہاں کا کوئی سامان ساتھ لے جا رہی ہوں۔ ان سوٹ کیسز میں جو کچھ بھی ہے، وہ میری اپنی محنت اور میری اپنی کمائی کا ہے۔ آپ نے جو کچھ مجھے دیا تھا... مجھے اس کی نہ پہلے ضرورت تھی، نہ اب ہے۔"

اس کا ایک ایک لفظ اتنا نپا تلا تھا کہ نیلوفر بیگم کے لب سختی سے بھنچ گئے۔ نجف نے ملازم کو دوبارہ اشارہ کیا اور اس بار ملازم بنا کسی ہچکچاہٹ کے سوٹ کیس اٹھا کر باہر کی جانب بڑھ گیا۔ نیلوفر بیگم اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں شدید طیش اور تاسف کا ملا جلا تاثر تھا۔

"تم بہت بڑی غلطی کر رہی ہو نجف!" انہوں نے اس بار حتمی اور بوجھل آواز میں کہا۔

"جانتی ہوں..." نجف کے سفید چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری، "لیکن اگر میں یہاں ٹھہری رہی، تو اس سے بھی بڑی غلطی ہو جائے گی۔"

"وہ شخص تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔" ان کا لہجہ مزید تلخ ہوا۔

"میں اپنا حساب کتاب خود کر لوں گی۔" نجف نے اپنا بیگ شانے پر درست کیا، "خدا حافظ مام!" وہ اس محل کی دم گھوٹتی فضا کو پیچھے چھوڑتی ہوئی مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

جبکہ پیلس کے باہر اپنی موٹر سائیکل سے ٹیک لگائے سقراط کھڑا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی موٹر سائیکل کی چابی انگلی پر گھما رہا تھا کہ تبھی دور سے ایک چمکتی ہوئی سیاہ گاڑی تیز رفتاری سے آئی اور ٹھیک اس کے قریب آ کر رکی۔ گاڑی میں حق بزدار تھا۔ وہ

سقراط کو دیکھ چکا تھا اور اندر جانے کے بجائے وہ باہر نکلا، اور قدم اٹھاتا سقراط کی جانب بڑھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" حق کی آواز سرد تھی۔ اس کی آنکھیں سقراط کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"اپنی بیوی کو لینے آیا ہوں۔" اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ اس کے اس ایک جملے میں ایسا کچھ تھا کہ حق کے جبڑے سختی سے بھنچ گئے۔ اس کی گردن کی رگیں تن گئیں۔

"تم غلطی کر رہے ہو سقراط!" حق نے ایک قدم اور قریب ہوتے ہوئے دھیمی آواز میں خبردار کیا، "یہ سب مت کرو۔"

"محبت اور جنگ میں... سب جائز ہوتا ہے۔" سقراط نے اسی بے نیازی سے جواب دیا۔

"یہ نہ محبت ہے اور نہ ہی کوئی مساوی جنگ۔" حق نے آنکھیں سکیڑیں، "یہ ایک ایسا دلدل ہے جس میں تم سب غرق ہو جاؤ گے۔"

"دلدل سے نکلنا سقراط کا پرانا مشغلہ ہے۔" سقراط نے ابرو اچکائے۔ وہ اسے جلانے، تپانے کا پورا انتظام کر کے آیا تھا۔ اس سے پہلے حق کچھ کہتا تبھی بزدار پیلس کا خودکار گیٹ کھلا اور اندر سے ایک بڑی گاڑی باہر نکل آئی۔ وہ گاڑی سرکتی ہوئی سیدھی انہی کے قریب آ کر رکی۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور بیٹھا تھا، جبکہ پچھلی سیٹ پر نجف تھی۔ نجف نے شیشہ نیچے گرایا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس نے حق کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے سیدھا سقراط کو دیکھا۔

"تم آ رہے ہو؟"

سقراط نے ایک نظر گاڑی کو دیکھا، اور پھر اپنی موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کیا۔

"اور میری بلو (Billo)؟"

"تمہاری بلو میرے ملازم کچھ دیر میں گھر چھوڑ جائیں گے۔" نجف نے خود پر ضبط کرتے ہوئے گہری سانس خارج کی۔ حق کے چہرے پر ایک واضح استہزاء ابھرا۔ اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

"مُجھے تم لوگوں پر بالکل بھروسہ نہیں ہے۔ میری بلو میرے ساتھ ہی جائے گی۔"

وہ سقراط شبگیر، بزداروں کے علاقے میں، ان کے ہی محل کے سامنے کھڑا ان کے صبر کا امتحان لے رہا تھا۔ نجف نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر کے خود کو پرسکون کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت سقراط سے الجھنا فضول تھا۔ پھر اس نے ڈرائیور کو چند حتمی ہدایات دیں۔ چند منٹ بعد، ایک بڑا سیاہ وگو ڈالا وہاں آ کر رکا۔ بزدار پیلس کے دو ملازموں نے سقراط کی موٹر سائیکل کو احتیاط سے ڈالے میں چڑھایا۔ اب منظر یہ تھا کہ سقراط، نجف کے ساتھ لگژری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر براجمان تھا، جبکہ ان کی گاڑی کے بالکل پیچھے وگو ڈالے میں اس کی بلو آ رہی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سقراط نے رخ موڑ کر سائیڈ

میرر میں دیکھا... بزدار پیلس کے گیٹ پر کھڑا حق بزدار، بازو پر کوٹ ڈالے، اب فاصلے کے ساتھ ساتھ دور اور دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ البتہ روشنیوں سے نہایا بزدار پیلس اژدھے کی مانند سر اٹھائے کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

شبگیر ہاؤس کا گیٹ برقی قمقموں کی پیلی اور زرد روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ رات کے اس خنک پہر، وگوڈالا سقراط کی موٹر سائیکل اتار کر واپس مڑ چکا تھا، مگر نجف کی گاڑی گیٹ کے باہر ہی کھڑی رہی۔ نجف اور سقراط دونوں ایک ساتھ گاڑی سے باہر نکلے تھے۔ نجف سرخ رنگ کے نفیس سوٹ میں ملبوس تھی۔ نفاست سے کیا ہوا میک اپ اور بالوں میں کیا گیا تازہ بلو ڈرائی... وہ توقع سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ گیٹ کے بالکل پاس نیمل کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سرخ اور سفید گلاب کے پھولوں کا ایک خوبصورت بکے تھا، جو اس نے آگے بڑھ کر نجف کی طرف پیش کیا۔

"شبگیر ہاؤس میں خوش آمدید، نجف خالہ!" نیمل کا لہجہ سنجیدہ مگر گرم جوش تھا نجف نے پھولوں کا گلدستہ تھاما اور اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی۔

"شکریہ نیمل..."

دوسری طرف، ڈرائنگ روم کی بڑی کھڑکی کے شیشے سے اپنی ناک چپکائے نامرہ باہر کا ایک ایک منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے پردہ ذرا سا سرکا رکھا تھا۔ یہ گھر کا وہ کمرہ تھا جو خاص مہمانوں کے آنے پر ہی کھلتا تھا ورنہ عموماً بند ہی رہتا تھا اور یہاں سے باہر صحن اور گیٹ کا منظر واضح نظر آتا تھا۔

"دادی! آ گئی بزداروں کی شہزادی!" نامرہ نے گردن موڑ کر صوفے پر بیٹھی دادی کو رازدانہ انداز میں آواز دی۔

"آنے دو... اس گھر بھی ملکہ بھی میں ہوں۔" دادی نے ناک سکیڑ کر ناگواری سے کہا۔

"دادی! سچ کہوں تو لگ کافی اچھی رہی ہیں۔ پورا پرائم منسٹر والا پروٹوکول ہے۔" نامرہ نے بے ساختہ تعریف کی۔ اسکا بس نہیں چل رہا تھا شیشہ توڑ کر باہر گردن نکال لے۔

"تو جا کر اس کے پاؤں دھو کر پی لے۔" دادی نے جھنجھلا کر اسے گھورا تو نامرہ نے کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ دوبارہ کھڑکی سے منہ چپکا لیا۔ نجف نے جیسے ہی گیٹ سے اندر قدم رکھا، گیراج میں سرمد صاحب کھڑے تھے۔ انہوں نے جب سامنے کھڑی نجف کو دیکھا، تو ان کی آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لیے زہرہ بیگم کا عکس لہرایا۔ وہی شائستگی اور وہی تمکنت۔ سرمد

صاحب کا دل پل بھر میں پگھل گیا۔ نجف، زہرہ بیگم کو ہمیشہ سے پیاری تھی، وہ تمام خاندانی تلخیوں اور پرانی رنجشوں سے بالاتر ہوکر آگے بڑھے اور نہایت شفقت سے نجف کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"جیتی رہو بیٹا...خوش رہو۔"

نجف کے چہرے کے تاثرات میں سرمد صاحب کے اس لمس سے ذرا سی نرمی آئی۔ "شکریہ!" اس نے احترام سے سر جھکایا۔ لاؤنج میں قدم رکھتے ہی نجف کے قدم ذرا دیر کو ٹھٹھکے۔ لاؤنج کو ایک ہی دن کی مختصر تیاری میں بھی نہایت اچھے انداز میں سجایا گیا تھا۔ درمیانی شیشے کی میز پر ایک خوبصورت کیک رکھا تھا جس پر جلی حروف میں Sajaf اور اس کے نیچے Home Sweet Home لکھا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک چھوٹا سا ویلکم کارڈ پڑا تھا جس پر Made for Each Other لکھا تھا۔

"ہم ایک دن میں بس یہی کچھ کر سکتے تھے۔" نیمل نے نجف کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے قدرے نرمی سے کہا۔ نجف نے کیک پر لکھے اس غیر معمولی نام Sajaf کو دیکھا تو وہ چونک کر کیک کو تکنے لگی۔ دس سال پہلے کی کچھ یادیں ذہن میں ابھریں۔

"سقراط چاچو کا S اور آپ کا ajaf دونوں کو ملا کر Sajaf بنتا ہے۔ بچوں نے، آئی مین ہم نے یہ نام سوچا تھا۔"

نجف کے چہرے پر ناگزیر جھوٹی مسکراہٹ ابھر آئی، مگر اس کے برعکس اس کے برابر میں کھڑے سقراط نے چہرے پر کسی مصنوعی مسکراہٹ کو لانے کا تکلف بھی نہیں کیا۔

"تارہ! دادی کو لے کر آؤ۔" نیمل نے اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد دادی، نامرہ کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ دادی کے چہرے پر باقاعدہ بارہ بجے ہوئے تھے اور ان کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں، مگر مجبوری کے تحت وہ چپ چاپ آ کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔

"السلام علیکم!" نجف نے جھجکتے ہوئے سلام کیا۔ جبکہ نامرہ نے کوئی تکلف نہیں کیا تھا البتہ اسکی نظریں کیک پر ضرور تھیں۔ تارہ نے اپنا کیمرہ آن کر رکھا تھا اور وہ اس پورے منظر کو ریکارڈ کر رہی تھی۔ چغلی خان بھی نجف کو دیکھ کر پرجوش ہو چکا تھا۔

"دلہن...دلہن..." وہ اپنی باریک آواز میں سب کے سروں پہ منڈلانے لگا۔

"چلیں، کیک کاٹیں..." سلال نے کیک کاٹنے والی چھری سقراط اور نجف کے سامنے کی۔ سقراط اور نجف، دونوں نے ایک

ساتھ چھری کے دستے پر اپنی انگلیاں جمائیں۔ چھری جیسے ہی کیک کے اندر اتری، نجف نے بالکل دھیمی، صرف سقراط کے کانوں تک پہنچنے والی سرگوشی کی۔

"گھر کے لیے..."

سقراط کی بھنویں سکڑ گئیں، اس نے اپنی زہریلی نگاہیں نجف کے چہرے پر جمائیں لیکن نگاہوں میں زہر زیادہ دیر نہ ٹک سکا۔ نجف کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے ہموار لہجے میں دہرایا۔ "گھر کے لیے!"

☆.....☆.....☆

اوپری پورشن کا لاؤنج اب پہلے سے کہیں زیادہ سلیقہ مند لگ رہا تھا۔ نئے پردے، شیشے کی میز پر رکھا نیا میٹ، کونوں میں رکھے لیمپوں کی مدھم روشنی اور زرد رنگ کا نیا کارپٹ...اس پورے پورشن کی فضا کو ایک بدلی ہوئی شکل دے چکے تھے۔ سقراط آگے بڑھا اور اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر قدم رکھتے ہی وہ ایک پل کے لیے ٹھٹک گیا۔ اس کا وہ عام سا، بے ترتیب کمرہ اب بالکل بدل چکا تھا۔ بیڈ پر نفیس سی بیڈ شیٹ بچھی تھی، کھڑکیوں پر گہرے رنگ کے پردے لٹک رہے تھے، فرنیچر چمک رہا تھا اور نائٹ اسٹینڈ پر نیا لیمپ رکھا تھا۔ نیمل نے بڑی خاموشی اور نفاست سے اس بکھرے ہوئے کمرے کو ایک نیا روپ دے دیا تھا۔ سقراط نے ایک گہری، بوجھل سانس خارج کی۔ نجف اپنے نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے دل میں تذبذب اور ہچکچاہٹ کی ایک لہر ضرور تھی، مگر اب اسے ہر حال میں یہی رہنا تھا اور اس حقیقت کا سامنا کرنا تھا۔ اس وقت اوپری پورشن میں وہ دونوں بالکل اکیلے تھے۔

"یہ میرا کمرہ ہے..." سقراط نے اس کی طرف دیکھے بغیر روکھے لہجے میں کہا۔ دس سال پہلے بھی اسکا یہی کمرہ تھا۔

"تم چاہو تو الگ کمرے میں بھی رہ سکتی ہو۔ اس الماری میں میرا سامان ہے...تم دوسرے کمرے کی الماری استعمال کر سکتی ہو۔" وہ اپنے الفاظ کی سرد مہری وہیں چھوڑتا واپس پلٹ گیا۔ نجف نے خاموشی سے اس کے جاتے ہوئے وجود کو دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لی۔ یہ کمرہ اس کے شاہانہ بیڈ روم کے مقابل کچھ بھی نہیں تھا...مگر اب یہی اس کی نئی حقیقت تھی۔ اس نے سب سے پہلے اپنے پاؤں سے اونچی ہیلز اتاریں اور انہیں ایک طرف رکھا۔ اپنا دوپٹہ سنبھال کر بیڈ پر پھیلایا اور پھر نیچے جھک کر اپنے دونوں وزنی سوٹ کیس کھول لیے۔ اس کے پاس سامان کافی مقدار میں تھا۔ اس نے الماری کے پٹ کھولے اور سقراط کا سامان دیکھا اور پھر لب بھینچ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ نیمل سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، نجف بیڈ کے کنارے بیٹھی اپنے کچھ مخملی ڈبوں کو کھول کر دیکھ رہی تھی، جہاں ہیرا جڑے قیمتی

زیورات تھے۔جیسے نیمل کی نظر جیسے ہی بیڈ پر کھلے ان ڈائمنڈز کے وزنی زیورات پر پڑی،اس کے چہرے پر تعجب کا تاثر ابھرا۔

"آپ اتنے قیمتی زیور یہاں رکھیں گی؟...گھر پر؟"اس نے بے ساختہ پوچھا۔

نجف نے اپنے بکھرے ہوئے زیورات سے نظریں ہٹا کر نیمل کو دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔"تو اور کہاں رکھوں گی؟"

"ویسے...آپ کو ڈائمنڈز کافی پسند ہیں؟"نیمل نے تھوڑا قریب آتے ہوئے کہا،"آپ نے مُجھے بھی یہی گفٹ کیے تھے۔"

نجف نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہیرے کے برسلٹ کو دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ ابھری۔

Diamonds are a girl's best friend!

"کبھی مت بھولنا۔"

نجف نے یہ جملہ اتنے الگ اور گہرے لہجے میں کہا کہ نیمل چند لمحے ٹھٹک کر اسے دیکھتی رہ گئی۔یہ فقرہ اس نے پہلے بھی کہیں پڑھا تھا...مگر اس وقت یاد نہیں آیا،تو اس نے ہلکے سے سر جھٹکا اور اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"کھانا لگ چکا ہے...آپ آجائیں۔"

"لیکن...تم لوگ تو کافی جلدی کھانا کھاتے ہو نا؟ آج اتنی دیر کیوں؟"نجف نے قدرے حیرانی سے نیمل کے چہرے کو دیکھا۔

"آج ہم سب آپ کے ساتھ کھانا چاہتے تھے...اس لیے آپ کا انتظار کیا۔"

نجف مسکرائی۔سچ تو یہ تھا کہ اس وقت اسے ذرا برابر بھی بھوک نہیں تھی،مگر جس خلوص اور احترام سے وہ سب نیچے اس کا انتظار کر رہے تھے،اسے منع کرنا مناسب نہ لگا۔

"ٹھیک ہے...میں آتی ہوں۔"

"آپ کو کوئی مدد چاہیے؟"نیمل نے پلٹنے سے پہلے آخری سوال کیا۔

"نہیں۔..میں کرلوں گی۔"نیمل نے ایک نظر بیڈ پر سقراط کے بکھرے ہوئے کچھ سامان پر ڈالی،مگر اس نے اس بارے میں کوئی سوال نہ کیا،اور خاموشی سے واپس پلٹ کر نیچے کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کی بھاپ کے درمیان ایک عجیب سی سنجیدگی تھی۔دادی کھانے پر موجود نہیں تھیں۔نجف بہت دل مار کر،پلیٹ میں چمچ چلا رہی تھی۔

البتہ سرمد صاحب خلافِ توقع نہایت خوش دلی اور شفقت سے نجف کا حال احوال اور اس کے گھر والوں کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ان کا رویئے میں وہ کل والی تلخی نہیں تھی۔سقراط،سرمد صاحب کے اس بدلے ہوئے اور نرم رویے کو دیکھ کر قدرے حیران تھا۔

"ان کا بھی کوئی دن ایمان نہیں۔" وہ ہولے سے بڑبڑایا۔ کھانے کے دوران نجف نے ماحول کا بوجھل پن کم کرنے کے لیے خود ہی باقیوں سے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا۔اس نے تارہ اور نوفہ سے ان کے اسکول، پڑھائی اور ٹائم ٹیبل کے بارے میں پوچھا، پھر سلال کی طرف متوجہ ہو کر اس کی میڈیکل کی روٹین کے بارے میں معلومات لیں۔وہ بڑی نفاست سے ایک ایک کر کے سب کی مصروفیت جان رہی تھی کہ پھر اس کی نظریں نیمل پر جا ٹھہریں۔

"تم پریکٹس کب شروع کر رہی ہو نیمل؟" یہ سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ سالن کا ڈونگا سقراط کی طرف بڑھاتی، نیمل کا ہاتھ وہیں ہوا میں رک گیا۔اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے اضطراب کا رنگ ابھرا، جسے اس نے فوراً ضبط کرنے کی کوشش کی۔

"ابھی...ابھی کچھ حتمی پتا نہیں۔" نیمل نے اپنے لہجے کو بمشکل نارمل بناتے ہوئے کہا اور ڈونگا میز پر رکھ دیا۔نجف نے اپنے ہاتھ میں تھاما چمچ پلیٹ میں رکھا اور نیمل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے بولی۔

"میرے کچھ جاننے والے ہیں...بزنس سرکل میں۔انہیں ایک بے حد قابل اور بااعتماد لائیر کی ضرورت تھی۔میں نے تمہارا کارڈ اور ریفرنس انہیں دے دیا تھا۔مُجھے امید ہے وہ تم سے بہت جلد رابطہ کریں گے۔" نجف کا انداز اس قدر خلوص سے بھرا ہوا تھا کہ نیمل چاہ کر بھی کچھ بول نہ سکی۔اس نے کچھ کہے بغیر بس آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔سقراط نے نیمل کے خاموش اقرار اور نجف کے اس تعاون کو دیکھا تو اس کے تنے ہوئے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑ گئے۔اگرچہ یہ بنیادیں دشمنی کی زمین پر رکھی گئی تھیں مگر اب چیزیں آہستہ آہستہ بہتری کی طرف آ رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

کھانے سے فارغ ہو کر دونوں باری باری اوپر آ گئے۔ سقراط لمبے نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا پہلے اپنے کمرے میں داخل ہوا اور جیسے ہی اس کی نظر اپنے بیڈ پر پڑی، اس کے قدم وہیں جم گئے۔اس کے تمام کپڑے، کوٹ، اور استری شدہ شرٹس بستر پر بدترین طریقے سے بکھری پڑی تھیں، جبکہ مرکزی الماری کے دونوں پٹ کھلے تھے اور اس میں نجف کے شاہانہ ملبوسات سلیقے

سے سج چکے تھے۔سقراط کے چہرے کی رنگت لمحوں میں بدلی،اس نے گردن موڑ کر سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی نجف کو دیکھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"اس کی آواز میں دبا ہوا شدید غصہ تھا۔

نجف نے بڑی نفاست سے اپنے بال پیچھے کیے اور آئینے میں ہی اپنے پیچھے نظر آتے سقراط کو دیکھا۔

"تم نے ہی تو کہا تھا کہ میں دوسرے کمرے کی الماری استعمال کر سکتی ہوں۔وہ الماری کافی چھوٹی ہے،میرا سامان اس میں فٹ نہیں ہو رہا تھا۔اس لیے وہ تم لے لو...اور ہاں!اس کمرے میں اب میں رہوں گی،تم چاہو تو دوسرے میں شفٹ ہو سکتے ہو۔"

سقراط چند پل کے لیے بالکل ساکت ہو گیا۔اس نے ایک نظر بیڈ پر پڑے اپنے کپڑوں کی میت کو دیکھا اور پھر نجف کے چہرے پر جمے ناٹک کو۔

"مُجھے اس کمرے میں رہنے کی عادت ہے۔"اس نے جبڑے بھینچ کر چبا چبا کر کہا۔نجف نے اپنی کلائی سے بریسلٹ اتارتے ہوئے،ٹھنڈی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"میں بھی اپنا محل،اپنا کمرہ اور اپنی ہر عادت چھوڑ کر یہاں آئی ہوں۔کچھ تم ایڈجسٹ کرو...کچھ میں کر رہی ہوں۔"

آئینے میں اسکا سراپا واضح ہو رہا تھا۔وہ سرخ جوڑے میں تھی،جس کے گلے اور آستینوں پر سفید موتیوں کا باریک کام کیا گیا تھا۔اس سرخ جوڑے میں اس کا چہرہ اور آنکھیں عجیب طرح سے چمک رہی تھیں۔سقراط نے گہری سانس لی اور بیڈ کے قریب آ کر اپنی ایک شرٹ اٹھائی۔

"یہ میرا گھر ہے،میرا کمرہ ہے اور میری الماری ہے!تم پہلے ہی دن سے قبضہ گروپ کی طرح رویہ اختیار نہیں کر سکتیں۔"

"قابض میں نہیں،تم ہوئے تھے...جب تم نے میرے گھر کے باہر کھڑے ہو کر میری گاڑی کے پیچھے اپنا ڈالا لگوایا تھا۔"نجف نے اپنا ایک اور جیولری باکس اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ترت جواب دیا۔

"وہ میرا حق تھا۔"سقراط کراہا۔

"تو اس کمرے پر قبضہ کرنا میرا حق ہے۔"نجف نے ابرو اچکا کر کہا اور بیڈ کی طرف بڑھی تا کہ اپنا باقی سامان سمیٹ سکے۔

وہ جوں جوں بیڈ کے قریب آ رہی تھی،اس کے سرخ لباس کی سرسراہٹ اور پرفیوم کی ہلکی سی مہک کمرے کی فضا پر چھانے لگی۔

سقراط کپڑے اٹھاتے اٹھاتے رک گیا۔اس کی نگاہیں بے ساختہ نجف کے چہرے پر جا ٹھہریں۔وہ گہرا سرخ رنگ اور نجف کی بے نیازی اس کے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔

"تمہیں بحث کرنے کی عادت ہے۔" سقراط نے اس کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر، اپنی آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"طنز کا جواب طنز سے اور حق کا جواب حقیقت سے دیا جاتا ہے۔" وہ دوبدو بولی۔ سقراط کا ضبط اب جواب دے رہا تھا۔ اس کی نظریں نجف کے چہرے اور پھر اس کے سرخ جوڑے پر جم گئیں۔ یہ رنگ اس کے ذہن میں عجیب سی بے چینی پیدا کر رہا تھا۔

"پہلے تم اپنا یہ لباس تبدیل کرو۔" نجف کے قدم رک گئے۔ اس نے حیرانی سے سقراط کو دیکھا۔

"کیوں؟ اس لباس سے کیا تکلیف ہے؟" سقراط نے اپنا رخ موڑا اور ہینگر میں لٹکے اپنے کپڑے اٹھا کر کمرے باہر نکلا۔

"مُجھے یہ رنگ نہیں پسند! یہ سرخ جوڑا... میرا دماغ خراب کر رہا ہے۔" نجف کے لبوں کے کنارے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔

"یہ تو شروعات ہے، سقراط شبگیر ...ابھی تو اس گھر میں میری موجودگی تمہارا بہت کچھ خراب کرے گی۔"

دوسرے کمرے سے اب کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جبکہ نجف تکان سے چور ہو کر بیڈ پر گر گئی۔

☆.....☆.....☆

صبح کا کوئی وقت تھا۔ نجف کی آنکھ کسی ہلکی سی آہٹ پر اچانک کھلی۔ رات نہ جانے کس پہر، سوچوں کے الجھے ہوئے تانے بانے بنتے اور اپنے ہی فیصلوں کی سنگینی سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس کی آنکھ لگی تھی۔ جاگتے ہی اس کی کنپٹیوں میں درد کی ایک شدید ٹیس اٹھی۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے دیکھا تو کمرے کے مدہم اندھیرے میں کوئی سایہ سا متحرک نظر آیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور فوراً سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ آن کیا۔ روشنی پھیلتے ہی اس کی نظر باتھ روم کا دروازہ ہولے سے بند کرتے ہوئے سقراط پر پڑی۔

"تت...تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

نجف نے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بدحواسی اور خوف کے ملے جلے تاثر کے ساتھ پوچھا۔ سقراط نے ایک نظر بدحواس سی نجف کو دیکھا اور پھر پرسکون انداز میں اپنے ہاتھ میں تھامی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔

"اپنا شیمپو لینے آیا تھا۔"

مہارانی اسکے کمرے پر قبضہ جو کر کے بیٹھ گئی تھی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا کمرے کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔

"تم اندر کیسے آئے؟ میں نے تو رات کو دروازہ لاک کیا تھا۔" نجف اب بستر پر اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کی جگہ برہمی نے لے لی تھی۔ سقراط دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے چند لمحے کے لیے رکا۔ اس نے ایک گہری لی اور پلٹ کر نجف کے چہرے کو دیکھا۔

"محترمہ! یہ میرا کمرہ ہے...اور میرے پاس اس کی چابی موجود ہے۔"

"تم یہ رات کو بھی لے جا سکتے تھے۔" وہ برہم تھی۔

"رات میرا دماغ کام کرنا چھوڑ گیا تھا پھر کیسے لے جاتا؟"
وہ کاٹ دار انداز میں کہتا ہوا باہر نکل گیا اور اس کے پیچھے دروازہ ایک شدید ٹھاہ کی آواز کے ساتھ بند ہوا۔ نہ صرف بند ہوا تھا بلکہ نجف کے سر پہ لگا تھا۔ وہ نڈھال ہو کر واپس بستر پر گر گئی۔ جانے کتنی دیر وہ یونہی تھکن اور سر درد کے عالم میں بستر پر لیٹی رہی۔ جب اس نے بمشکل اپنا ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کی اسکرین پر وقت دیکھا تو آٹھ بج رہے تھے۔ اسے آج دوپہر دو بجے ہسپتال جانا تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی، مگر سر کی شریانوں میں اٹھتی مسلسل ٹیسوں اور ذہن کے اضطراب نے اسے سونے نہ دیا۔ بالآخر وہ ایک گہری سانس لے کر اٹھ بیٹھی۔ بیڈ سے نیچے اتری اور کھڑکی کے بھاری پردے ایک طرف سرکائے تو نیچے شبگیر ہاؤس کا صحن نظر آنے لگا، جہاں ہلکی اور سنہری دھوپ پھیل رہی تھی۔ اس کا لمبا شب خوابی کا لباس فرش کو چھو رہا تھا۔ وہ اس پورشن کا نقشہ دس سال پہلے سے ہی اچھی طرح جانتی تھی...مگر ان دس سالوں کے طویل عرصے میں یہاں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئی اور اس پورشن کے ایک ایک کمرے، لائبریری، بند دروازوں اور لاؤنج کی ساخت کا گہری نظروں سے جائزہ لینے لگی۔ اسی اثنا میں دوسرے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور سقراط باہر نکل آیا۔ وہ ٹریک سوٹ میں ملبوس تھا، جوگرز پہنے ہوئے، اور بظاہر کالج جانے کے لیے تیار نظر آ رہا تھا۔ اس نے

نجف کو یوں راہداری میں کھڑے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ یوں جیسے اسکی موجودگی وہاں بھول گیا ہو۔ نجف کی نظریں اس سے ملیں۔ سقراط کو اسکی آنکھوں سوجھن واضح نظر آئی۔

"تم ناشتہ نہیں کرو گی؟" اس بار قدرے نرم لہجے میں اس کے بکھرے ہوئے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ نجف نے اپنے شانے پر گرتے بالوں کو پیچھے سنبھالا اور نہایت تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں...ابھی بھوک نہیں ہے۔"

سقراط نے بے نیازی سے کندھے اچکائے اور مزید کوئی سوال کیے بنا سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے چلا گیا۔ نجف نے اس کے جاتے ہوئے وجود کو دیکھا۔ اس کے سر کی ٹیسیں اب بڑھ رہی تھیں اور اس وقت اسے صرف ایک ہی چیز کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی...ایک کپ کڑک، گرم چائے! اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنے کمرے کی جانب واپس پلٹ گئی۔

صبح کے تقریباً نو بج چکے تھے۔ گھر کا نچلا پورشن اس وقت بالکل خاموش اور ویران سا لگ رہا تھا۔ سرمد صاحب، سقراط، سلال اور بچیاں اپنے اپنے کاموں، اسکول اور کالج کے لیے جا چکے تھے۔ نجف جب سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو اس کے سر میں درد کی وہی تیز ٹیسیں اب بھی اٹھ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ اس وقت ذرا زرد اور نڈھال لگ رہا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر دادی بیٹھی تھیں، جبکہ نیمل چائے کا مگ تھامے ان کے سامنے والی کرسی پر براجمان تھی۔ وہ دونوں آپس میں دھیمی آواز میں کچھ بات چیت کر رہی تھیں کہ نجف کے قدموں کی آہٹ پر نیمل نے گردن موڑ کر دیکھا۔

"دلہن...دلہن..." نجف کو دیکھتے کی ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھا چغلی خان پھڑ پھڑا کر اڑا۔ نجف نیچے اتر آئی۔

"السلام علیکم..." اس نے مدھم آواز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام، خالہ! آئیں، بیٹھیں۔" نیمل نے اپنے چہرے پر خوشگواری لاتے ہوئے فوراً کہا۔ "آپ ناشتہ کیا لیں گی؟"

نجف ابھی جھجکتے ہوئے کرسی سرکا کر بیٹھنے ہی والی تھی کہ دادی نے اپنے ہاتھ میں تھاما چائے کا کپ زور سے میز پر رکھا۔ان کے چہرے پر نجف کو دیکھ کر ناگواری اور زہر پھیل چکا تھا۔

"یہ ناشتے کا کونسا ٹائم ہے؟ ناشتہ سب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔" دادی نے نجف کو سر سے پاؤں تک تحقیر آمیز نظروں سے گھورتے ہوئے طنز کا تیر چلایا، "دشمن کی بیٹی ہمارے گھر پر قبضہ جما کر بیٹھ گئی ہے اور اب ملکہ وکٹوریہ کی طرح نو بجے سو کر اٹھ رہی ہے۔ذرا سی بھی حیا یا شرم باقی ہوتی تو اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے سو بار سوچتی۔"

دادی کے ان زہریلے اور کاٹ دار الفاظ پر نجف کا چہرہ لمحوں میں مزید زرد اور بے رنگ ہو گیا۔وہ ششدر سی انہیں دیکھ کر رہ گئی۔جیسے یقین نہ آیا ہو۔وہ دادی کی طرف سے پھولوں کے ہار کی توقع کر کے نہیں آئی تھی لیکن اس نے اتنے زہریلے الفاظ کی توقع بھی نہیں کی تھی۔یوں تو اس کے پاس ہر طنز کا جواب تھا،مگر اس گھر کے پہلے ہی دن وہ ایک بوڑھی عورت سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔

"دادی!بس کریں۔" نیمل نے شرمندگی اور برہمی کے ملے جلے تاثر کے ساتھ دادی کو ٹوکا۔وہ خود ساکت تھی۔دادی کا غصہ نیمل کے ٹوکنے پر اور بھڑک اٹھا۔وہ اپنی جگہ سے جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔جب ان کا غصہ حد سے بڑھ جاتا تو ان کی زبان بدل جاتی تھی۔

(یہ منحوس عورت ہمارے گھر کو برباد کر کے چھوڑے گی!زہر گھولنے آئی ہے یہاں...!)

وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے نیپالی میں بڑبڑائیں۔

(ہمارے خاندان کے لیے بدنامی لے کر آئی ہے... پاپن!) وہ چند مزید کاٹ دار جملے بولتے ہوئے اپنے کمرے میں گھس گئیں۔

لاؤنج میں اب صرف نجف اور نیمل رہ گئی تھیں۔فضا میں ایک بوجھل اور شرمندہ کر دینے والی خاموشی چھا چکی تھی۔نیمل نے

ایک گہری سانس لی اور نجف کی طرف دیکھا۔

"مُجھے دادی کے رویئے پر بے حد افسوس ہے، خالہ... میں آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔"

نجف نے اپنی بوجھل آنکھیں اٹھائیں اور ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"اِٹس اوکے، نیمل... معذرت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ راستہ اور یہ زندگی میں نے خود چنی ہے، اس لیے مُجھے کسی کے رویئے سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" اس کا لہجہ اس قدر پرسکون مگر اندر سے ٹوٹا ہوا تھا۔ نیمل کو سمجھ ہی نہیں آیا کیا بولے۔ یہ بالکل غیر متوقع تھا۔

"دراصل میرے سر میں صبح سے شدید درد ہے۔" نجف نے اپنی کنپٹی کو انگلیوں سے چھوتے ہوئے اعتراف کیا۔ "مُجھے بس ایک کپ کڑک چائے کی ضرورت ہے۔"
"آپ بیٹھیں، میں بنا کر لاتی ہوں۔" نیمل نے فوراً کہا۔

"نہیں... میں اپنے ہاتھ سے بناؤں گی۔ مُجھے اپنی چائے کا اندازہ ہے۔" نجف نے نفاست سے منع کیا۔ نیمل اسے لے کر کچن میں آ گئی۔ کچن کشادہ تھا مگر ابھی بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

"صفائی والی آپا ابھی آئی نہیں ہیں۔ وہ دس بجے تک آتی ہیں۔"

نیمل نے آگاہ کرتے ہوئے، پین نجف کے سامنے رکھا اور پھر فریزر سے دودھ نکالا۔ جبکہ نجف نے سر ہلاتے ہوئے پین میں پانی، چائے کی پتی اور دودھ ڈالا۔ چولہے کی آنچ تیز کرتے ہوئے اس کی انگلیاں بالکل پرسکون تھیں، مگر اس کے تاثرات گم صم تھے۔ نیمل نے خاموشی کو توڑنے کے لیے ٹوسٹر آن کیا۔
"میں تب تک آپ کے لیے سلائس گرم کر دیتی ہوں۔"

"شکریہ نیمل..." نجف نے مدہم آواز میں کہا۔ چائے چولہے پر پک رہی تھی اور نیمل سلائس پر مکھن لگا رہی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک آدھ عام سی بات بھی ہوئی، مگر نجف کا ذہن اس وقت کچن میں موجود نہیں تھا۔ اس کے سائیں سائیں کرتے ذہن میں، اور سر کی تیز ٹیسوں کے درمیان، دادی کے وہ زہریلے الفاظ مسلسل گونج رہے تھے۔

"دشمن کی بیٹی ہمارے گھر پر قبضہ جما کر بیٹھ گئی ہے۔"

نجف نے ابال آتی چائے کو دیکھا اور چولہا دھیما کر دیا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس گھر کا ہر ایک کونا، اور یہاں کی ہوا کا ہر ایک جھونکا اسے یاد دلاتا رہے گا کہ وہ کون ہے؟ ماضی میں کیا ہوا تھا اور وہ کس مقصد کے تحت اس آگ کے سمندر میں اتری تھی۔ یہ گھر اسے اتنی جلدی قبول نہیں کرے گا۔

☆.....☆.....☆

کالج کے کشادہ اسٹیڈیم کے اسٹینڈز میں اس وقت خاصی خاموشی تھی۔ آج ثالث کی ٹیم کا کوئی میچ نہیں تھا، اس لیے گراؤنڈ میں صرف کچھ ٹیموں کی پریکٹس جاری تھی۔ سنہری دھوپ اسٹینڈز کی کنکریٹ کی نشستوں پر بکھری ہوئی تھی اور ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ نامرہ اسٹینڈز کی ایک اوپری نشست پر اکیلی بیٹھی، فون ہاتھ میں لیے اسکی اسکرین گھور رہی تھی کہ ثالث ہاکی اسٹک تھامے، سیڑھیاں چڑھتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی ہلکی سی بوندیں چمک رہی تھیں اور چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ وہ نامرہ کے کچھ فاصلے پر آ کر رکا۔

"تم نے مجھ سے نشاط پھوپھو کا نمبر کیوں مانگا تھا؟"

نامرہ نے اپنی نظریں فون سے ہٹا کر ثالث کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر نہ کوئی گھبراہٹ تھی اور نہ ہی کوئی چوری پکڑے جانے کا خوف۔ اس نے نہایت بے نیازی سے شانے اچکائے۔ "ضرورت تھی۔"

"کیا ضرورت تھی؟" ثالث نے الٹا سوال کیا۔ اسکا سایہ کنکریٹ کی نشستوں پر لمبا ہو رہا تھا۔ نامرہ خاموش رہی۔ ثالث نے ہاکی اسٹک زمین پر ٹکائی اور ذرا سا آگے جھک کر، دھیمی آواز میں پوچھا۔

"تم نے انہیں نجف پھوپھو کے خلاف بھڑکایا ہے... ہے نا؟" نامرہ کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔ اس نے اپنی گردن

اٹھائی اور ثالث کی آنکھوں میں دیکھا۔

"تم جانتے ہو تو پوچھ کیوں رہے ہو؟"

ثالث نے چند لمحے خاموشی سے اس کے تیکھے تاثرات کا جائزہ لیا۔ پھر اس کے چہرے پر مدہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اسٹینڈ کے جنگلے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

" کچھ لوگ خود غرض ہوتے ہیں...لیکن پھر بھی اچھے لگتے ہیں۔"

"خود غرض میں نہیں، تمہارے گھر والے ہیں! میں نے جو کچھ بھی کیا، اپنے گھر اور اپنے لوگوں کو بچانے کے لیے کیا۔ تمہاری پھوپھو، میری امی کا فائدہ اٹھا کر ہمارے گھر میں گھس چکی ہیں۔"

"اور تمہیں لگا کہ نشاط پھوپھو کو فون کر کے تم انہیں روک لو گی؟" ثالث نے ابرو اچکائے، "تم اپنی اس بچکانہ چال سے نجف پھوپھو کو تو نہیں روک سکیں نامرہ...البتہ تم نے نشاط پھوپھو کا وہ زخم دوبارہ ہرا کر دیا جو بمشکل بھر رہا تھا۔"

نامرہ کا چہرہ اس بات پر ذرا سا زرد پڑا، مگر اسکی ہٹ دھرمی قائم رہی۔

" کبھی کبھی بڑی آفت کو روکنے کے لیے چھوٹا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ میں نے صرف دیوار پر شہد لگایا تھا...مکھیاں خود آئیں تو اس میں میرا کیا قصور؟"

ثالث نے ہلکی سی نفی میں سر ہلایا۔

"تم بہت خطرناک کھیل کھیل رہی ہو نامرہ...یہ آگ کا سمندر ہے۔ اس میں شہد لگانے والے کا اپنا ہاتھ بھی جل جاتا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے، تم اس سب سے محفوظ رہو گی؟" اس کا لہجہ طنز سے پاک اور سنجیدہ ہو گیا۔

"مُجھے اپنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" نامرہ نے رخ موڑ کر گراؤنڈ میں دوڑتے کھلاڑیوں کی طرف دیکھا، "میں اپنے

خاندان کی ڈھال ہوں...اور ڈھال کو اپنے جلنے کی پروا نہیں ہوتی۔"

ثالث نے ایک گہری سانس لی۔اس نے اپنی ہاکی اسٹک شانے پر رکھی اور جانے کے لیے پلٹا،مگر رک کر ایک آخری نظر نامرہ کے ضدی چہرے پر ڈالی۔

"ڈھال بننا اچھی بات ہے نامرہ...لیکن یاد رکھنا،دشمن کے علاقے میں کھڑے انہیں للکارنا دانشمندی نہیں ہوتی۔" ثالث سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے چلا گیا،جبکہ نامرہ خاموشی سے اسے دور جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔گراؤنڈ پر چھائی دھوپ میں اب اسے ایک عجیب سے بوجھل پن کا احساس ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

آج بزدار میڈیکل کالج کا مرکزی آڈیٹوریم معمول سے کہیں زیادہ پُرہجوم تھا۔اسٹیج کے عقب میں نصب بڑی اسکرین پر کالج کا لوگو نمایاں تھا،جبکہ ہال میں موجود طلبہ کی سرگوشیاں اس وقت مدھم پڑنے لگیں جب مائیک پر ایک مختصر اعلان گونجا۔
"تمام طلبہ سے گزارش ہے کہ اپنی نشستوں پر تشریف رکھیں۔ایمرجنسی سیمینار چند لمحوں میں شروع ہونے والا ہے۔"

آخری سال کے طلبہ کی قطاروں میں بیٹھے چہروں پر تجسس نمایاں تھا۔انہیں صبح ہی اطلاع دی گئی تھی کہ کالج انتظامیہ نے ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا ہے،جس میں شمالی پاکستان کے ایک دور افتادہ علاقے میں پھیلنے والی نامعلوم بیماری پر گفتگو کی جائے گی۔
کچھ ہی دیر بعد سفید کوٹ میں ملبوس ایک سینئر پروفیسر اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ان کے ہاتھ میں چند فائلیں تھیں اور چہرے پر سنجیدگی۔انہوں نے مائیک درست کیا۔

"السلام علیکم،اسٹوڈنٹس۔" چند لمحوں کے لیے ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔
"آج آپ سب کو یہاں کسی امتحان کی تیاری کے لیے جمع نہیں کیا گیا۔اس وقت ہمارے ملک کے ایک دور افتادہ پہاڑی علاقے میں ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہو چکی ہے جس پر فوری طبی توجہ کی ضرورت ہے۔"

اسکرین روشن ہوئی۔ پہلی تصویر میں بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان آباد ایک چھوٹی سی وادی دکھائی دی۔ پتھریلے پہاڑوں کے دامن میں مٹی اور پتھر سے بنے مکانات بکھرے ہوئے تھے۔ وادی کے وسط سے گزرتی ایک تنگ سڑک دور پہاڑوں کے درمیان گم ہو رہی تھی۔ پروفیسر نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ لیڈی ویلی ہے۔ جہاں تک پہنچنے کے لیے مرکزی شاہراہ سے کئی گھنٹوں کا دشوار گزار سفر کرنا پڑتا ہے۔"

اگلی تصویر سامنے آئی۔ ایک چھوٹی سی سرکاری ڈسپنسری۔ پرانی عمارت، اکھڑا ہوا پلستر، زنگ آلود گیٹ اور باہر چند لوگوں کا ہجوم۔

"علاقے میں طبی سہولتیں محدود ہیں۔ یہاں ایک چھوٹی سرکاری ڈسپنسری ہے، جہاں عملہ پہلے ہی وسائل کی کمی کا سامنا کر رہا ہے۔ گزشتہ چند دنوں کے دوران بیماری کے متعدد کیسز رپورٹ ہوئے ہیں، اور مریضوں کی تعداد میں اضافے نے صورتِ حال کو تشویش ناک بنا دیا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا یہ بیماری وبا کی طرح پھیل رہی ہے۔"

اسکرین پر اب چند طبی اعداد و شمار اور مریضوں کی تعداد سے متعلق ایک چارٹ دکھائی دینے لگا۔ ہال میں بیٹھے طلبہ کی توجہ مکمل طور پر اسٹیج کی جانب مرکوز ہو چکی تھی۔

"تا حال بیماری کی نوعیت اور اس کے پھیلاؤ سے متعلق تمام سوالات کے جواب ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ اسی لیے بزدار ہسپتال کے سینئر ڈاکٹرز، طبی عملے اور متعلقہ فارماسیوٹیکل ریسرچ ٹیم کو علاقے میں بھیجا جا رہا ہے۔ وہاں مریضوں کا معائنہ کیا جائے گا، ضروری سیمپلز حاصل کیے جائیں گے اور بیماری کی نوعیت سمجھنے کے لیے تحقیق کی جائے گی۔"

انہوں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا، پھر اپنی فائل بند کر دی۔

"اس ٹیم کے ساتھ آخری سال کے وہ طلبہ بھی جا سکتے ہیں جو اس مشن میں رضا کارانہ طور پر حصہ لینے کے خواہش مند ہوں۔ یقیناً آپ کی ذمہ داریاں آپ کی تربیت اور سینئر ڈاکٹرز کی نگرانی کے مطابق طے کی جائیں گی۔"

اسٹیج کے سامنے رکھی میز پر موجود رجسٹریشن شیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے مزید کہا۔

"یہ کوئی تفریحی دورہ نہیں ہے۔ آپ کو دشوار گزار راستوں، محدود سہولتوں اور ایک غیر یقینی طبی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا

ہے۔اس لیے فیصلہ کرنے سے پہلے اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ لیجیے گا۔"

ہال میں خاموشی چھا گئی۔ چند طلبہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کچھ کے چہروں پر جوش تھا، کچھ ابھی صورتِ حال کی سنگینی سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پروفیسر نے آخری بار اسکرین کی طرف دیکھا، جہاں پہاڑوں کے درمیان واقع وہ چھوٹا سا گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔

"ہم وہاں صرف مریضوں کا علاج کرنے نہیں جا رہے۔ ہم وہاں یہ جاننے جا رہے ہیں کہ آخر اس علاقے میں ہو کیا رہا ہے؟ اور جو ہو رہا ہے وہ وہاں، آپ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیں۔"

ان کے الفاظ کے بعد ہال میں دوبارہ سرگوشیاں ابھریں۔ اور اسٹیج کے سامنے رکھی رجسٹریشن شیٹ پر پہلا نام لکھے جانے کا انتظار ہونے لگا۔

☆.....☆.....☆

شام کا سایہ وومن کلب کی پرسکون عمارت پر گہرا ہو رہا تھا۔ سامنے پارکنگ کے ایک محفوظ کونے میں اشعر عامر کی سیاہ گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے اندر خاموشی اور خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ سلویٰ کا یہ دن اشعر کے ساتھ بہت اچھا گزرا تھا ایک ایسا وقت جہاں وہ دنیا کی تمام الجھنوں، میڈیا کی نظروں اور خاندانی کھینچ تان سے دور پرسکون سانس لے سکی تھی۔ لیکن دونوں ہی ایک دوسرے سے ملنے جلنے کے معاملے میں حد درجے محتاط تھے۔ سلویٰ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ ان کا یہ تعلق وقت سے پہلے پبلک ہو یا اس کے کردار پر کسی قسم کا ایکسٹرا میریٹل افیئر کا لیبل لگایا جائے۔ وہ طلاق کے قانونی مراحل مکمل ہونے تک ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہتی تھی۔ اشعر نے اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ جمائے رخ موڑ کر سلویٰ کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں ہلکا سا گلہ تھا۔

"تم مجھ سے کھل کر ملتی کیوں نہیں ہو، سلویٰ؟ یوں چھپ چھپ کر ملنا مُجھے بہت عجیب لگتا ہے۔" اشعر عامر، سلویٰ خان کا دور کا کزن تھا۔ وہ شادی سے پہلے ہی سلویٰ کو پسند کرتا تھا مگر اس وقت سلویٰ پر حق کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ اب بھوت اترا تو اسے اشعر نظر آنے لگا تھا۔ پچھلے ایک سال سے وہ دونوں رابطے میں تھے۔ اشعر آج بھی اسکا انتظار کر رہا تھا۔ اسی لیے سلویٰ

نے اپنی زندگی اشعر کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سلویٰ نے اپنی لپ اسٹک درست کرتے ہوئے ایک ہلکی اور اطمینان بخش سانس لی۔

"بس کچھ دن اور، اشعر...کل طلاق کے کاغذات مُجھے باقاعدہ مل جائیں گے، اور پھر ہمارے لیے سب کچھ آسان ہو جائے گا۔" اشعر نے اس کے ضبط کو سراہتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا، پھر ذرا رک کر پوچھا۔

"وعدہ کرو؟" اسکے یوں پوچھنے پر سلویٰ مسکرا دی۔

"تمہیں ابھی بھی مجھ پر شک ہے؟" وہ نرم نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ اشعر نے گہری سانس لی۔

"بس ڈر لگتا ہے۔" وہ یاسیت سے بولا۔

"کس سے؟" سلویٰ نے اسکی جانب رخ کرتے پوچھا۔

"حق بزدار سے..." وہ دو بدو بولا تو سلویٰ نے گہری سانس لی۔

"وہ کچھ نہیں کرے گا اشعر! اسے اپنے بیٹے کے لیے اسکی ماں یعنی میری ضرورت ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو اپنے جیسی زندگی نہیں دینا چاہتا۔ اس لیے بے فکر رہو۔" اسکی بات میں منطق تھی۔ اشعر نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

"اور کامل کہاں ہے؟"

"وہ حق کے ساتھ ہے۔" سلویٰ نے ہینڈ بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے بتایا، "حق آج شام اسے واپس گھر چھوڑ کر جائے گا، اس لیے مُجھے کامل کی طرف سے بالکل پریشانی نہیں ہے۔" بات مکمل کرتے ہی سلویٰ نے اپنی گاڑی سے نکلنے کی تیاری شروع کی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر سن گلاسز چڑھائے اور چہرے پر ماسک اچھے سے جما لیا۔ وہ سیاہ پینٹ اور گہرے رنگ کی جرسی شرٹ میں ملبوس تھی۔

"خدا حافظ!" اس نے اشعر کو دیکھا۔

"اپنا خیال رکھنا۔" اشعر نے نرمی سے کہا۔

سلویٰ نہایت احتیاط سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور بنا پیچھے مڑے، تیز قدم اٹھاتی ہوئی وومن کلب کے مرکزی شیشے والے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔کلب کی دہلیز پار کرتے ہی، اندر کی محفوظ اور عورتوں تک محدود فضا کا احساس ہوتے ہی اس نے سکون کا سانس لیا اور اپنے چہرے سے ماسک اتار کر بیگ میں ڈال دیا۔ یہاں اسے کسی کا خوف نہیں تھا۔نائٹ کلب کا لابی ایریا پرسکون تھا اور ہلکی موسیقی گونج رہی تھی۔سامنے سے گزرتی ہوئی ایک واقف کار لڑکی نے اسے دیکھا تو شائستگی سے مسکرا کر اسے 'ہائے' کہا۔سلویٰ نے سر ہلایا اور سیدھا ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔

ڈریسنگ روم کی کشادہ فضا میں پہنچ کر اس نے اپنا بیگ بینچ پر رکھا۔سلویٰ کو پچھلے سات سالوں سے شدید اعصابی تناؤ کا عارضہ لاحق تھا، جس کی وجہ سے اس کی گردن اور کمر کے اعصاب میں شدید کھنچاؤ رہتا تھا۔اس کے تھراپسٹ نے اسے دوا سے زیادہ سوئمنگ (تیراکی) کی تجویز دی تھی، کیونکہ پانی کا دباؤ اس کے مفلوج ہوتے اعصاب کو سکون بخشتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ وہ ہفتے میں کم از کم چار دن اس کلب کے پرائیویٹ سوئمنگ پول میں ضرور پائی جاتی تھی۔اس نے اپنے کپڑے تبدیل کیے، سوئمنگ سوٹ پہنا اور شیشے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔اعصابی تھکن اس کے چہرے سے عیاں تھی، مگر پانی میں اترنے کا خیال ہی اس کے وجود کو ایک عجیب سا آرام دے رہا تھا۔اس نے اپنا ہینڈ بیگ اور باقی سامان اپنے مخصوص لاکر میں رکھا۔الماری کا پٹ جیسے ہی دھپ کی آواز کے ساتھ بند ہوا، سلویٰ کی ریڑھ کی ہڈی میں اچانک ایک سنسناہٹ دوڑ گئی۔اسے لگا جیسے اس کے عین پیچھے کوئی کھڑا تھا، کوئی انتہائی زہریلی نظروں سے اس کی گردن کو گھور رہا تھا۔یہ احساس اتنا حقیقی تھا کہ وہ ایک پل کو ساکت رہ گئی۔اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔اس نے بدحواسی اور گھبراہٹ کے عالم میں جھٹکے سے گھوم کر پیچھے دیکھا مگر ڈریسنگ روم کی پالش شدہ خالی بینچیں اور دیواروں پر لٹکے ہوئے تولیے بالکل خاموش تھے۔وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔اپنا وہم سمجھتے ہوئے اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور خود کو سنبھالا۔اعصابی بیماری اس کے حواس پر اب اس حد تک غالب آ رہی تھی کہ اسے اپنے ہی سائے سے ڈر لگنے لگا تھا۔پھر اس نے اپنے لاکر سے پانی کی بوتل نکالی، چند گھونٹ حلق میں اتارے، اور الماری کو چابی سے مقفل کر دیا۔ڈریسنگ روم کی ناہموار روشنیوں سے نکل کر وہ اپنے پرائیویٹ سوئمنگ پول کے شفاف اور نیلی روشنی میں نہائے ہوئے ہال میں داخل ہوئی۔ پول کا پانی شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔اس وقت وہاں کوئی دوسری خاتون موجود نہیں تھی۔ یہ پول، سلویٰ اور اسکی دوست مرینہ نے بک کر رکھا تھا۔سلویٰ نے اپنا تولیہ شانے سے اتار کر کنارے رکھی کرسی پر دھرا، ایک گہری سانس لی اور پول کی نیلی سطح پر اتر گئی۔ پانی کی خنکی نے جیسے ہی اس کے تپتے ہوئے جسم کو چھوا، اس کے کھچے ہوئے اعصاب کو ایک تسلی بخش راحت کا احساس ہوا۔وہ پانی میں اتری اور مہارت کے ساتھ تیرنے لگی۔اس کے بازو اور سڈول جسم پانی کی دھار کو کاٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔اس نے اپنا سر پانی کے اندر ڈبویا اور

ایک طویل غوطہ لگاتے ہوئے پول کے وسط کی طرف بڑھی...اور پھر...اچانک وہ ہوا جس کا تصور اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ پانی کی گہرائی میں، بالکل وسط میں جب وہ اگلا اسٹروک لینے کے لیے اپنے بازو پھیلانے والی تھی...اس کی گردن کے عقبی حصے سے درد کی ایک نوکیلی لہر اٹھی اور پل کے سوویں حصے میں اس کے پورے حرام مغز اور مرکزی اعصابی نظام کو اپنے لپیٹ میں لے گئی۔ جیسے ایک نادیدہ قوت نے اس کے پورے وجود کو یکلخت فریز کر دیا۔ اس کے پھیپھڑوں میں قید ہوا کا آخری بلبلا اس کے ہونٹوں سے نکل کر پانی کی سطح کی طرف بھاگا۔ سلویٰ نے تڑپ کر اپنا دایاں بازو اوپر اٹھانے کی کوشش کی، مگر اس کا جسم کسی بھاری سیپ کی طرح جامد ہو چکا تھا۔ اس کے دماغ نے شدید ہیجان کے عالم میں ٹانگوں کو حرکت دینے کا حکم بھیجا، مگر اس کی ٹانگیں، اس کا دھڑ، اس کے ہاتھ...سب کے سب جیسے لوہے کے بے حس سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ ایک انچ بھی حرکت ممکن نہ رہی۔ اس کا گلا بند ہو گیا۔ وہ پانی کے اندر سے چیخنا چاہتی تھی، پکارنا چاہتی تھی...مگر اس کا نچلا جبڑا اتنی سختی سے لاک ہو چکا تھا جیسے کنپٹیوں کی رگیں اکڑ گئی ہوں۔ اس کے چہرے کی رنگت لمحوں میں سرخ سے گہری نیلی پڑنے لگی۔ پانی کے اوپر سب نارمل تھا جبکہ پانی کے اندر، سلویٰ کی کھلی، خوف سے پھٹی ہوئی آنکھیں پانی کی سطح پر نظر آتی زرد روشنیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کا دماغ چیخ رہا تھا، اس کی روح اپنے ہی جسم کے قید خانے میں تڑپ رہی تھی، مگر کاٹھ کا پتلا بن چکا اسکا وجود بالکل بے بس تھا۔ دم گھٹنے کا ہولناک احساس اس کے وجود میں زہر بن کر سرائیت کرنے لگا۔ وہ آکسیجن کے لیے ترس رہی تھی۔ آہستہ آہستہ، اس کے دماغ کے سامنے سیاہ اور گاڑھا دھندلاہٹ کا پردہ گرنے لگا...اندر کی تمام چیخیں ایک ایک کر کے دم توڑ گئیں، اور آنکھوں کے سامنے چمکتی روشنی مٹتی چلی گئی۔ اور پھر...سب کچھ ساکت ہو گیا۔ اس کا بے حس و حرکت وجود آہستہ آہستہ پانی کی گہرائی سے اوپر کی طرف ابھرا...اور سوئمنگ پول کی نیلی سطح پر سلویٰ کا بے جان جسم ایک سرخ کپڑے کی طرح تیرنے لگا۔ پانی پر ایک آخری ہلکی سی لہر ابھری...اور پھر پورے ہال پر خاموشی چھا گئی۔

☆.....☆.....☆

آپریشن تھیٹر کی سٹرلائزڈ فضا میں مانیٹرز کی مدھم بیپ گونج رہی تھی۔ حق کی انگلیاں انتہائی مہارت سے آخری ٹانکے لگا رہی تھیں۔ سرجری کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے سرجیکل گلوز اتارے، بیسن میں پھینک کر ہاتھ دھوئے اور سکرب روم کا دروازہ دھکیل کر باہر راہداری میں قدم رکھا۔ دروازے کے باہر اس کی اسسٹنٹ جویریہ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ چکی تھی، آنکھوں میں ایک ہولناک خوف تھا اور ہاتھ میں تھاما ہوا موبائل فون باقاعدہ لرز رہا تھا۔

"سر...سر وہ..." جویریہ کی آواز حلق میں خشک ہو کر اٹک گئی، الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

"کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے؟...کامل ٹھیک ہے؟" حق کے لہجے کی نرمی ایک پل میں سختی میں بدل گئی۔اس نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے ایک جھٹکے سے جویریہ کے کانپتے ہاتھوں سے فون جھپٹ لیا۔اسکرین ان لاک کی...اور سامنے جو تصویر اور سرخی چمک رہی تھی، اس نے حق بزدار کی دنیا کو پل کے ہزارویں حصے میں الٹ کر رکھ دیا۔اسکرین پر وومن کلب کے سوئمنگ پول کے نیلے، شفاف پانی پر تیرتی ہوئی سلویٰ کی بے جان لاش کی تصویر تھی۔

"شی از نو مور! (وہ اب نہیں رہی)" حق کی نظریں اسکرین پر جم کر رہ گئیں۔اس کی بصارت کے سامنے زرد اور سیاہ دھبے تیرنے لگے۔پاؤں تلے سے زمین جیسے جھٹکے سے سرک گئی۔گرد و پیش کی تمام آوازیں ہسپتال کا شور، مانیٹرز کی بیپ، ڈاکٹرز کی قدموں کی چاپ سب ایک دم خاموش ہو گئیں، جیسے کسی نے گہرے پانی میں ڈبو دیا ہو۔

"نہیں...نہیں...نہیں..." اس نے ایک جھٹکے سے اپنے سر سے سرجیکل کیپ نوچ کر نیچے پھینکی، اور اوپری گرین سرجیکل گاؤن کو بے دردی سے جسم سے الگ کیا۔اندر وہ اپنے ڈاکٹر والے عام سکرب سوٹ میں تھا۔وہ راہداری میں کھڑے نرسنگ اسٹاف اور حیران ہوتے ڈاکٹروں کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے باہر کی طرف بھاگا۔اس کے ہاتھ اس قدر کانپ رہے تھے کہ چابی اسٹارٹنگ سوئچ میں لگاتے ہوئے دو بار اس کی انگلیوں سے چھوٹی۔اس نے گہری سانس لیتے ہوئے گاڑی کو ریورس کیا اور ٹائروں کی چرچراہٹ کے ساتھ ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکال لیا۔گاڑی اب رات کی شاہراہ پر تمام حدیں توڑتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔اسٹیئرنگ وہیل پر جمے اس کے دونوں ہاتھوں کی رگیں تنی ہوئی تھیں اور انگلیاں اتنی سختی سے جم چکی تھیں جیسے ہڈیاں سفید پڑ گئی ہوں۔ سڑک کے ٹریفک سگنلز سرخ تھے، مگر اس کا پیر ایکسلریٹر سے نیچے نہیں ہٹ رہا تھا۔گاڑی ہوا کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، اور حق کے دماغ کے اندر ایک ہی نام ہتھوڑے کی طرح مسلسل بج رہا تھا...کامل!

"کامل...میرا بچہ..."

اس کے سینے میں سانسیں جکڑی جا رہی تھیں۔وہ اپنے معصوم بیٹے کو کبھی ایسی زندگی نہیں دینا چاہتا تھا جس میں اس کی ماں نہ

ہو! وہ خود اس درد سے گزرا تھا، وہ جانتا تھا کہ ماں کے بغیر جینا انسان کے وجود میں کیسا ویران خلا پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اپنی تمام تر دولت، طاقت اور نام و نہاد نفوذ کے باوجود کامل کے سامنے بے بس نہیں ہونا چاہتا تھا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے گاڑی کا شیشہ تھوڑا نیچے کیا، مگر رات کی ٹھنڈی ہوا بھی اس کے اندر لگی آگ کو بجھا نہ سکی۔ ایک ایسی بھیانک سچائی کی طرف بھاگا جا رہا تھا جہاں اب واپس پلٹنے کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

☆.....☆.....☆

وومن کلب کے باہر سرخ اور نیلی اَپ اینڈ ڈاؤن ہوتی ہوئی ایمرجنسی لائٹس کا ایک شور مچا ہوا تھا۔ پوری عمارت کو کرائم سین ٹیپ سے سیل کر دیا گیا تھا۔ اندر موجود تمام ممبرز اور اسٹاف کو باہر نکلنے سے روک دیا گیا تھا۔ گاڑیوں کا ہجوم، روڈ پر ناکہ بندی، میڈیا کے رپورٹرز، کیمروں کی فلش لائٹس اور پولیس کی متعدد گاڑیاں اس پہر کو ایک بھیانک خواب میں بدل چکی تھیں۔ حق کی رفتار اتنی تیز تھی کہ مرکزی دروازے پر موجود دو پولیس کانسٹیبلز نے فوراً آگے بڑھ کر اسے روکا۔

"سر! آگے جانا منع ہے، یہ کرائم سین ہے۔ جگہ سیل کر دی گئی ہے۔"

"ہٹو راستے سے!" حق کی آواز اتنی ہولناک تھی کہ کانسٹیبلز ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئے۔ اسی اثنا میں اندر سے نکلتے ہوئے ایک سینئر انسپکٹر نے حق کو پہچان لیا اور سپاہیوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ حق اندر داخل ہوا۔ کچھ ہی فاصلے پر اسٹریچر پر سفید چادر میں لپٹی ایک باڈی رکھی تھی جسے فورنزک ٹیم اور پولیس کے افراد پوسٹ مارٹم کے لیے ریسکیو ایمبولینس کی طرف منتقل کرنے والے تھے۔ چادر کے کنارے سے سلویٰ کے بالوں کی ایک لٹ باہر لٹک رہی تھی۔ حق کی بصارت دھندلا گئی۔ وہ ساکت ہو گیا۔ تھوڑے فاصلے پر، ڈریسنگ روم کی راہداری کے پاس وومن کلب کے مالک اور سلویٰ کے والد، مسٹر خان ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کا چہرہ زرد، آنکھیں پتھرائی ہوئی اور وجود لرز رہا تھا۔ ان کے اپنے ہی قائم کردہ شاہانہ کلب میں ان کی اکلوتی بیٹی موت کی گہری نیند سو چکی تھی۔ حق کے قدم جیسے ہی مسٹر خان کی طرف بڑھے، مسٹر خان نے اپنی پتھرائی ہوئی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ چند لمحے وہ بالکل بے حس و حرکت رہے... اور پھر اچانک ان کے اندر جیسے غم اور طیش کا لاوا پھٹ پڑا۔ وہ ایک دم

اپنی جگہ سے اٹھے، حق کی طرف لپکے اور اپنے کانپتے ہاتھوں سے حق کا گریبان دبوچ لیا۔

"تم نے کیا ہے یہ سب...! تم نے میری بیٹی کو مارا ہے۔ تم قاتل ہو۔" مسٹر خان کی آواز بیٹھ چکی تھی، مگر ان کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ آس پاس کھڑے پولیس افسران اور اسٹاف چونک پڑے۔ حق نے ایک لمحے کے لیے مسٹر خان کے ہاتھوں کو اپنے گریبان پر محسوس کیا۔ اس کی اپنی آنکھوں میں شدید صدمے کا عکس ابھرا۔ مگر اس کا چہرہ سپاٹ رہا۔ اس نے چند لمحے مسٹر خان کا طنز، الزام اور غصہ خاموشی سے سہا... پھر اپنی انگلیوں سے مسٹر خان کے ہاتھوں کو اپنے گریبان سے جھٹک کر الگ کیا۔

"سوچ سمجھ کر بولیں، مسٹر خان!" حق کی آواز برف کی طرح ٹھنڈی تھی۔ "یہ جگہ آپ کی ہے، اور آپ کی بیٹی یہاں اکیلی آئی تھی۔ مُجھے اپنے دکھ میں آلہ کار بنانے کی کوشش مت کیجیے۔"
"یو مونسٹر!" مسٹر خان کے چہرے کی رگیں تن گئیں، "میری بیٹی تم سے آزادی چاہتی تھی۔ اور تم نے اسے مار ڈالا۔"
حق نے گہری سانس لیتے ہوئے، اپنے گریبان کی سلوٹیں درست کیں اور اپنی سرد، بوجھل آنکھیں مسٹر خان کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔
"اپنے ہوش سنبھالیں، مسٹر خان!" قبل اس کے کہ بحث مزید بڑھتی، انویسٹی گیشن آفیسر (Senior SSP) دو دیگر اہلکاروں کے ساتھ ان کے قریب آ گیا۔

"بس کیجیے مسٹر خان اور بزدار صاحب!" آفیسر نے آگے بڑھ کر دونوں کو الگ کیا، "ہمیں آپ دونوں کے بیانات درکار ہیں۔ یہ ایک کرائم سین ہے اور ابتدائی کارروائی کے لیے آپ دونوں کو ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔"

پورا اسٹاف تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ڈریسنگ روم کی سی سی ٹی وی کیمرہ ریکارڈنگز پہلے ہی حاصل کی جا چکی تھیں۔ فوٹیج میں واضح تھا کہ سلویٰ بالکل اکیلی ڈریسنگ روم سے سوئمنگ پول کی طرف گئی تھی، پانی میں اتری تھی اور پھر اعصابی شٹ ڈاؤن یا سانس کے بلاکیج کے باعث اس کا جسم ساکت ہو گیا تھا۔ بظاہر یہ ایک طبعی، ناگہانی موت معلوم ہوتی تھی... مگر مسٹر خان کی نفرت نے اس معاملے کو زہریلا بنا دیا تھا۔ کلب منیجر کے پرائیویٹ آفس میں انویسٹی گیشن آفیسر نے حق اور مسٹر خان کو آمنے سامنے بٹھا دیا۔ میز پر سلویٰ کا بندلا کر کا سامان، اس کی گاڑی کی چابیاں اور اس کا فون رکھا تھا۔

"ڈاکٹر حق!" آفیسر نے نوٹ پیڈ سنبھالتے ہوئے حق کو دیکھا، "آپ کو آخری بار سلویٰ سے بات کیے کتنا وقت ہوا تھا؟"

"چار دن!" حق نے اپنے ہاتھوں کی پشت کو دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں بتایا۔

"اور آخری بار کیا ہوئی تھی؟"

"ہماری ڈائیوارس کے حوالے سے۔"

"جھوٹ بول رہا ہے یہ!" مسٹر خان نے فوراً میز پر ہاتھ مارا، "یہ اسے مسلسل ہراسانی کا شکار بنا رہا تھا۔ اسے ڈرا رہا تھا کہ اسکی جان کو خطرہ ہے۔ میری بیٹی پچھلے چند ہفتوں سے شدید اعصابی تناؤ میں تھی۔ یہ اس کی ذہنی حالت کا ذمہ دار ہے۔"

حق نے مسٹر خان کو نظر انداز کرتے ہوئے آفیسر کی طرف دیکھا۔

"سلویٰ کو کلینکل ڈیپریشن اور نروس بریک ڈاؤن کا عارضہ تھا۔ اس کا کئی سالوں سے علاج چل رہا تھا اور اس کے تھراپسٹ نے ہی اسے سوئمنگ ایڈوائز کی تھی۔ مسٹر خان یہ بات مجھ سے بہتر جانتے ہیں، مگر اس وقت یہ صدمے کی وجہ سے حواس کھو چکے ہیں۔" حق نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

"میرے حواس ٹھکانے پر ہیں، حق بزدار!" مسٹر خان نے انگلیاں اٹھا کر حق کو ہولناک انداز میں پوائنٹ کیا، "اگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں ذرا سا بھی زہریلا غلط عنصر سامنے آیا.. تو میں تمہیں پھانسی پہ لٹکاؤں گا۔"

آفیسر نے دونوں کے درمیان بڑھتی ہوئی اس ہولناک کشیدگی کو دیکھا اور فائل بند کر دی۔

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے تک کوئی بھی شہر سے باہر نہیں جائے گا۔ باڈی کو فورنزک لیب بھیج دیا گیا ہے، رپورٹ جلد از جلد مل جائے گی۔"

حق خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور بنا مسٹر خان کو دیکھے، نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا اس سیل شدہ، کرائم سین سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

خان ہاؤس اس وقت ایک نوحہ کدہ بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف بوجھل خاموشی، سسکیوں کی مدہم آوازیں اور خوف کا سایہ پھیلا

ہوا تھا۔ ہال کے وسط میں پھولوں سے سجی ہوئی چارپائی پر سلویٰ کا بے جان جسدِ خاکی رکھا تھا، جس پر سفید چادر پڑی تھی۔ گھر کے اس تعزیت والے ماحول میں بزدار خاندان کے تقریباً سبھی افراد موجود تھے۔ مسٹر خان کا برا حال تھا۔ ان کی آنکھیں رو رو کر سوج چکی تھیں اور وہ ایک کونے میں پتھر بنے بیٹھے تھے۔ کچھ فاصلے پر اشعر عامر بھی موجود تھا، جس کا چہرہ زرد اور حالت انتہائی غیر یقینی تھی۔ وہ بار بار اپنی انگلیاں مروڑ رہا تھا اور اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس اندرونی مجمعے میں حق موجود نہیں تھا... وہ اس وقت گھر باغیچے میں، سفید شلوار قمیص میں ملبوس، اپنے بیٹے کامل کو گود میں اٹھائے کھڑا تھا۔ کامل اتنے سارے انجانے چہروں، لوگوں کے ہجوم اور فضا میں چھائے ہوئے سوگ کو دیکھ کر بری طرح گھبرا چکا تھا۔ وہ ننھا سا بچہ شاید الفاظ سے تو کچھ بیان نہیں کر سکتا تھا، مگر اس کے معصوم دل نے ماں کے بچھڑنے کا یہ صدمہ محسوس کر لیا تھا۔ وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے حق کے گلے میں بانہیں ڈال کر سسکنے لگا۔ حق نے کامل کو اور مضبوطی سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ اس کی اپنی آنکھیں خشک تھیں، مگر اس کے اندر کا سمندر طوفان کی زد میں تھا۔

اسی لمحے، پولیس کے دو اہلکار اور ایک انویسٹی گیشن آفیسر باضابطہ کارروائی کے لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں وہ رپورٹس تھیں جن کے انتظار میں سب کی سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ مسٹر خان اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ آفیسر نے آگے بڑھ کر مسٹر خان کو رپورٹ کی کاپی تھمائی اور دھیمی آواز میں بولا۔

"مسٹر خان... سلویٰ کی باڈی کا مکمل پوسٹ مارٹم اور فرانزک رپورٹ آ چکی ہے۔ رپورٹ کے مطابق... سلویٰ کے جسم میں نہ تو زہر کا کوئی اثر ملا ہے اور نہ ہی کسی قسم کے بیرونی تشدد کے نشانات ہیں۔ موت کی وجہ واضح طور پر شدید اعصابی شٹ ڈاؤن، دورانِ سوئمنگ پینک اٹیک اور سانس کی نالی کا بلاکیج بنی ہے۔ یہ... ایک طبعی موت تھی۔"

(نام: سلویٰ خان
موت کی وجہ: سوئمنگ پول میں ڈوبنا)

مسٹر خان نے لڑکھڑاتے ہاتھوں سے وہ کاغذ پکڑا۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس رپورٹ کو پھاڑ دیں، کیونکہ وہ اس موت کا ذمہ دار صرف اور صرف حق کو ماننا چاہتے تھے، مگر سائنسی حقائق ان کے ہاتھ باندھ چکے تھے۔ پر کہانی اتنی سادہ نہیں تھی۔ پولیس نے جب سلویٰ کے موبائل فون کی کال ہسٹری، واٹس ایپ چیٹس اور ڈیلیٹڈ میسجز کا فرانزک ڈیٹا نکالا تھا، تو ایک اور

خوفناک سچائی باہر آ چکی تھی۔ پولیس کو واضح ثبوت مل چکے تھے کہ سلویٰ کا پچھلے کچھ عرصے سے اشعر عامر کے ساتھ گہرا افیئر چل رہا تھا۔ وہ دونوں مسلسل رابطے میں تھے اور ان کے درمیان طلاق کے بعد کی زندگی کے منصوبے ڈسکس ہو رہے تھے۔ اس لیے اشعر اب قانون کی نظر میں بھی باقاعدہ انویسٹی گیشن کے دائرے میں آ چکا تھا۔ اور پھر رات کے ٹھیک گیارہ بج رہے تھے۔ شہر کے مرکزی قبرستان کی خاموش اور اداس فضا میں، فلڈ لائٹس کی روشنی کے نیچے، سلویٰ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ مٹی کی آخری پرت ڈلنے کے بعد، تمام رشتہ دار اور تعزیت کرنے والے واپس لوٹ چکے تھے مگر مسٹر خان کا دل اب بھی انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اگرچہ پوسٹ مارٹم رپورٹ طبعی موت کی گواہی دے رہی تھی، مگر مسٹر خان نے اپنے غصے اور ضد میں حق بزدار کے خلاف باقاعدہ ایک قانونی مقدمہ درج کروا دیا تھا۔ صرف اس مقصد کے لیے کہ حق کو پولیس کی تفتیش اور ذلت کا سامنا کرنا پڑے۔ قبرستان کے ویران دروازے کے پاس کھڑے ہو کر، حق نے اپنے ہاتھ جھاڑے، اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی بیوی کو اپنے ہاتھوں سے مٹی کے سپرد کر کے جا رہا تھا۔ اسکی آنکھیں سرد تھیں۔ اور اس کے سینے میں پلنے والا درد اب نفرت میں بدل چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کے بارہ بجے کے قریب شبگیر ہاؤس کے لاؤنج کی روشنیاں مدھم تھیں۔ سنسان سڑک سے ایک گاڑی گلی کے اندر داخل ہوئی اور پھر شبگیر ہاؤس کے سامنے رکی۔ کچھ دیر گھر کی بیل بجی۔

"میں دیکھتا ہوں۔" صوفے پہ بیٹھا سلال اٹھا اور باہر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد نجف اسکے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ وہ اسی کریم رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھی جس میں وہ صبح ہسپتال ڈیوٹی کے لیے نکلی تھی اور پھر وہاں سے سیدھی خان ہاؤس پہنچ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہسپتال اور تعزیتی ماحول کی تھکن اور کرب کے تاثرات عیاں تھے۔ لاؤنج میں سرمد صاحب، نیمل اور سلال موجود تھے۔ ٹی وی کی اسکرین میوٹ پر تھی مگر اس پر نیوز چینلز کی بریکنگ نیوز کی پٹیاں مسلسل چل رہی تھیں جس میں سلویٰ کی پراسرار موت، حق بزدار کے خلاف اڑنے والی افواہیں اور ان کے گھریلو اختلاف کی خبروں کو حواسی انداز میں مرچ مصالحہ لگا کر دکھایا جا رہا تھا۔ سقراط اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا اور دادی کافی دیر پہلے اپنے کمرے میں سونے جا چکی تھیں۔ نجف نے خاموشی سے اپنا بیگ میز پر رکھا اور نڈھال سی ہو کر صوفے پر آ بیٹھی۔

"خان ہاؤس میں حالات کیسے ہیں؟" سرمد صاحب نے شفقت اور تشویش سے پوچھا۔
نجف نے اپنے ماتھے کو مسلا اور ایک بوجھل سانس لی۔
"حالات بہت خراب ہیں، مسٹر خان کا صدمہ بڑا ہے۔ وہ حق کو قاتل مان رہے ہیں۔ میڈیا نے الگ تماشا بنا رکھا ہے، کوئی اسے ہارٹ اٹیک کہہ رہا ہے، کوئی قتل، اور کچھ تو ریٹنگز بڑھانے کے لیے طلاق کی خبروں کو من گھڑت کہانیوں کو سنہرا رنگ دے رہے ہیں۔"

نیمل ٹی وی کی اسکرین پر حق بزدار کی تصویر دیکھ رہی تھی، جس پر 'ملزم یا مظلوم؟' کی سرخ سرخی چمک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ اور پریشانی واضح تھی۔
"سب سے زیادہ نقصان تو اس معصوم بچے کا ہوا ہے۔" نجف کے لہجے میں کڑھن تھی، "وہ بہت چھوٹا ہے... اس عمر میں اسے اپنی ماں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔"

نیمل کچھ دیر خاموش رہی، پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے نجف کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن میں ایک سوال مسلسل ابھر رہا تھا جسے وہ روک نہ سکی۔

"کک... کیا حق؟... کیا حق واقعی اپنی بیوی کا قتل کر سکتے ہیں؟ یعنی مسٹر خان نے جو مقدمہ دائر..."
نجف نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور نیمل کو دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں... حق اس عورت کا قتل کبھی نہیں کر سکتا جو کامل کی ماں ہے۔" نیمل کے چہرے پر اطمینان سا ابھرا۔

"میں حق کو جانتی ہوں۔ وہ سرد مزاج ہو سکتا ہے، ضدی اور انا پرست ہو سکتا ہے مگر وہ ایک انتہائی مخلص باپ ہے۔ وہ خود بچپن میں ماں کی محبت سے محروم رہا ہے، اس لیے وہ اپنے بچے کو کبھی بن ماں کے نہیں پالنا چاہتا تھا۔ وہ سلویٰ سے ہزار اختلافات کے باوجود اسے اپنی زندگی میں رکھنا چاہتا تھا صرف اس لیے کہ وہ کامل کی ماں تھی۔ اگر یہ قتل ہے بھی، تو پھر اسکا قاتل کوئی بھی ہو سکتا ہے... مگر حق نہیں۔"

"اگر طبعی موت کی رپورٹ آچکی ہے تو پھر یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟" سلال نے جلی کٹی آواز میں پوچھا۔ آخر کو حق بزدار اسکا فیورٹ سرجن تھا اور وہ ایک ڈاکٹر کو ایک قاتل کے فریم میں نہیں دیکھا چاہتا تھا۔

" کیونکہ فی الوقت مسٹر خان اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کر رہے ہیں اور حق خاموش ہے۔" نجف نے کڑوا سچ بیان کیا۔

" کیا واقعی حق کی وائف کا کوئی افیئر تھا؟" نیمل نے نپے تلے لہجے میں پوچھا۔ کیا واقعی اسکی بیوی اسے دھوکہ دے رہی تھی؟ اسے یہ سن کر ہی عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ سرمد صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔

"افواہوں کی دنیا بہت زہریلی ہوتی ہے۔ جب خاندانی وقار اور رشتوں پر بات آئے تو انسان اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔"

"ایسا ہی ہے۔" نجف نے اٹھتے ہوئے کہا، "اور سب سے زیادہ خوفناک بات یہ ہے کہ اس تمام تماشے میں وہ معصوم بچہ پس رہا ہے۔"

نیمل نے ایک سرد آہ بھری۔ نجف کے اس حقیقت پسندانہ تجزیے نے نیمل کے دل میں حق کے لیے پھیلی کچھ دھند صاف کر دی تھی۔ نجف نے سب کو شب بخیر کہا اور تکان زدہ قدموں کے ساتھ اوپری پورشن کی طرف بڑھ گئی، جہاں خاموش راہداری اور ایک نیا ویران کمرہ اس کا منتظر تھا۔

☆.....☆.....☆

نام: میری ولسن

موت کی وجہ: دریا میں ڈوبنا۔

پولیس اسٹیشن کے اندرونی حصے میں سینئر آفیسر رچرڈ کا کیبن ایک الگ ہی دنیا معلوم ہوتا تھا۔ میری ولسن کی موت کی وجہ خودکشی سے بدل کر 'دریا میں ڈوبنا' لکھ دی گئی تھی۔ آفیسر کیتھرین گرے پرانی کیس فائل کے پہلے صفحے پر لکھی اس ایک سطر پر انگلی جمائے بیٹھی تھی، جس کے اوپر بڑے بڑے حروف میں درج تھا۔

MERY WILSON - CASE CLOSED (5 YEARS AGO)

رچرڈ نے کافی کے مگ سے ایک گھونٹ بھرا، اپنی عینک کو ناک پر درست کیا اور کیتھرین کو دیکھا۔ اس کے لہجے میں ایک روایتی بے زاری اور تھکن صاف جھلک رہی تھی۔

" کیتھرین...تم پانچ سال پرانے بند کیس کو دوبارہ کھولنا چاہتی ہو؟ وہ بھی صرف ایک پاگل ماں کے کہے ہوئے چند جذباتی الفاظ اور ایک مبہم سے ٹیٹو کی بنیاد پر؟"

کیتھرین نے ذرا برابر بھی گھبرائے بغیر، اپنی گہری اور نپی تلی نظریں رچرڈ پر گاڑ دیں۔
"وہ عورت پاگل نہیں ہے، رچرڈ! میری ولسن کی گاڑی پانچ سال پہلے دریا سے ملی تھی...لاش پانی کی سطح پر تیر رہی تھی، اور پوسٹ مارٹم نے اسے خودکشی قرار دے کر فائل بند کر دی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے کئی اور مشکوک اموات کو آسانی سے دبا دیا جاتا ہے۔"

رچرڈ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور نفی میں سر ہلایا۔

" مگر اس پرانے کیس میں تھا کیا؟ میری ولسن کا اسٹوڈنٹ اور پروفیشنل ریکارڈ دیکھو، اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی، کوئی پختہ ثبوت نہیں ملا۔ اس وقت کے تفتیش کاروں نے ہر ممکن زاویے سے جانچ کی تھی اور نتیجہ یہی تھا کہ وہ حادثہ تھا یا پھر خودکشی۔ کیونکہ میری ولسن ان دنوں ڈپریشن کا شکار تھی۔"

"جانچ؟" کیتھرین کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ اور تیز مسکراہٹ ابھری، اس نے فائل کا ایک ورق پلٹا اور انگلی ایک مخصوص رپورٹ پر رکھ دی، "اگر جانچ اتنی ہی مکمل تھی، تو یہ تفصیل کیوں نظر انداز کر دی گئی کہ میری ولسن نے اپنی موت سے ٹھیک چند دن پہلے کس کا آپریشن کیا تھا؟"

رچرڈ کی پیشانی پر شکنیں ابھریں۔ اس نے آگے جھک کر پوچھا۔

" کون سا آپریشن؟ میری ولسن ایک سرجن تھی، اس نے اپنے کیریئر میں درجنوں سرجریاں کی ہوں گی۔ اس میں اتنی حیرت کی کون سی بات ہے؟"

"بات عام نہیں ہے، رچرڈ!" کیتھرین کی آواز میں متجسس سنجیدگی آ گئی، "میری ولسن نے اپنی موت سے محض چند دن قبل ایک انتہائی پیچیدہ اور نایاب ہارٹ ٹرانسپلانٹ سرجری کی تھی۔ اور اس کے چند دن بعد وہ اس پراسرار حادثے کا شکار ہو گئی۔ جبکہ اس سرجری کے بعد وہ ڈپریشن کا شکار تھی۔ مُجھے لگتا ہے اس کی موت کہیں نہ کہیں اس سرجری اور اس لڑکی سے جڑی ہوئی ہے۔"

اس نے فائل کا وہ صفحہ بالکل کھول کر رچرڈ کی طرف سرکا دیا جس پر ایک لڑکی کی خوبصورت مگر سنجیدہ تصویر چسپاں تھی۔

نام: نجف بزدار

عمر: اکتیس سال

رچرڈ نے جھک کر اس تصویر اور نام کو دیکھا۔ اس کے چہرے کی بے زاری اب قدرے گہری سوچ میں بدل رہی تھی۔

"میری ولسن نے یقیناً اور بھی کئی آپریشنز کیے ہوں گے، کیتھرین... صرف اس ایک بنیاد پر تم اتنے بڑے طوفان میں ہاتھ ڈالنا چاہتی ہو؟"

"ہاں، اس نے کئی آپریشنز کیے ہوں گے..." کیتھرین نے رچرڈ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، "لیکن یہ کیس عام نہیں ہے۔ اس لڑکی کا تعلق ایک بااثر اور بین الاقوامی سطح پر پھیلے ہوئی میڈیکل فیملی سے ہے۔ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ اتنی بڑی اور نایاب سرجری کے بعد ڈاکٹر کا دریا میں ڈوب کر مر جانا... یقیناً یہاں کچھ ہے جسے چھپایا گیا ہے۔"

رچرڈ نے چند لمحوں تک کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میز پر رکھی اس تصویر اور کیتھرین کے پرعزم چہرے کو باری باری دیکھتا رہا۔ کیبن میں صرف گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز گونج رہی تھی۔ آخرکار، رچرڈ نے گہری سانس لی، عینک اتاری اور ایک نیم رضامندانہ انداز میں بولا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی بڑی سازش ہے؟"

"مُجھے پورا یقین ہے۔" کیتھرین نے پر اعتماد لہجے میں کہا، "مُجھے صرف اس کیس کو ری اوپن کرنے کی باضابطہ اجازت چاہیے تاکہ میں یہ دیکھ سکوں کہ پانچ سال پہلے اس سرجری کے ریکارڈز میں کیا چھپایا گیا تھا اور اس کا میری ولسن کی موت سے کیا تعلق ہے۔"

رچرڈ نے اپنی میز کی دراز سے ایک مہر اٹھائی، اسے پیڈ پر رکھا اور پھر کیتھرین کی طرف دیکھ کر گہری سانس چھوڑی۔
"ٹھیک ہے، کیتھرین... تمہیں میری ولسن کا کیس ری اوپن کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن یاد رکھنا، اگر یہ صرف تمہارا وہم نکلا، تو محکمہ کے سامنے تم خود جواب دہ ہوگی۔"
کیتھرین کے چہرے پر ایک فاتحانہ اور سنجیدہ چمک ابھری۔ اس نے وہ فائل بند کی، اسے اپنے سینے سے لگایا، اور سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"مایوسی نہیں ہوگی، رچرڈ! اب اس بند کہانی کے راز کھلنا شروع ہوں گے۔"

☆.....☆.....☆

نیمل کا کمرہ اس وقت باہر چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کے شور اور اندر جلی ہوئی روشنی کی وجہ سے ایک عجیب پر سکون حصار میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ اپنے مطالعہ کی میز پر بیٹھی تھی، اور اس کے ہاتھ میں آصفہ پھوپھو کی دی ہوئی وہ پرانی ڈائری تھی۔ اس نے ڈائری کا ایک زرد پڑ چکا صفحہ کھولا۔ اس پر ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر پرانی یادوں کی خوشبو بکھیر رہی تھی۔

"یہ لباس بہت خوبصورت ہے۔ میں نہیں جانتی، امام نے اسے کہاں سے بنوایا ہے لیکن یہ سرخ لباس خاص میرے لیے بنایا گیا ہے اور یہ اتنا خوبصورت ہے کہ اسے پہن کر مُجھے کسی ملکہ کا احساس ہوتا ہے۔"

نیمل کی انگلیاں اس سطر پر پھسلیں۔ صفحے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا لفافہ چسپاں تھا، جسے کھول کر اس نے باہر نکالا تو اندر ایک

پرانی تصویر تھی۔تصویر میں امام بزدار کے ساتھ ایک دوشیزہ کھڑی تھی۔نیمل،آصفہ پھوپھو کی جوانی کے دور کی تصویر کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔وہ بے پناہ خوبصورت تھیں،اور وہی سرخ لباس پہنے،فخر سے امام بزدار کا بازو تھامے کھڑی تھیں۔ اور ڈائری کے حاشیے پر، بالکل نیچے آصفہ پھوپھو نے وہ الفاظ لکھ رکھے تھے جو حق نے اس روز کہے تھے۔

"تمامِ زیبایی ہای این دنیا،سایہ ای از نورِ تو ست، مادر۔

ترجمہ:اس دنیا کی تمام خوبصورتی،تمہارے نور کا ایک پرتو ہے، ماں!"

حق کے منہ سے ادا ہونے والا یہ جملہ، جو اس نے اپنی ماں کی تعریف میں کہا تھا،آصفہ پھوپھو نے امانت سمجھ کر اس ڈائری میں محفوظ کر لیا تھا۔نیمل اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس جملے کو چھو رہی تھی۔کتنی محبت کرتا ہوگا وہ لڑکا اپنی ماں سے؟ وہ سحر زدہ سی بار بار اس جملے کو دہرا رہی تھی کہ اچانک...دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

اس کا تسلسل ٹوٹا۔اس نے ڈائری پر نگاہ ڈالی، پھر دروازے کی طرف دیکھا۔دروازہ ہلکا سا کھلا،اور سلال اندر داخل ہوا۔اس کے ہاتھ میں ایک پارسل تھا۔

"یہ آپ کے لیے ہے۔"سلال نے ہلکی سی مسکان کے ساتھ کہا۔نیمل نے حیرت سے پارسل کو دیکھا۔

"لیکن میں نے تو کچھ آرڈر نہیں کیا..."

" کسی نے بھیجا ہوگا۔"سلال نے کندھے اچکائے،آگے بڑھ کر وہ پارسل میز پر رکھا،اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔نیمل نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر ڈائری کو بند کر کے سائیڈ پر رکھا اور اپنی توجہ اس پارسل کی طرف مبذول کی۔اس نے احتیاط سے اس کا ریپنگ پیپر کاٹا اور اندر موجود چیز باہر نکالی۔وہ ایک فائل تھی۔جیسے ہی اس نے اس فائل کا کور کھولا،اس کی بھنویں ناگواری اور حیرت سے سکڑ گئیں۔فائل کے سرورق پر بڑے بڑے حروف میں درج تھا۔

" گوہر علی عرف گوگا کیس فائل!"

اس نے ایک لمحے کے لیے بھی فائل کو کھولنا گوارا نہیں کیا۔اس نے فوری طور پر فائل بند کر کے اٹھائی اور میز کے سب سے نیچے والی دراز میں رکھ دیا۔ کمرے میں دوبارہ وہی گہری خاموشی چھا گئی۔باہر چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کھڑکی کے شیشوں کو چھوتی

ہوئی گزر رہی تھی۔ نیمل کافی دیر تک کرسی پر گم صم بیٹھی رہی، اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کچھ تھا جو اس کے اندر مسلسل کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ ایک ایسا سوال جس کا جواب اسے خود تلاش کرنا تھا۔ وہ اٹھی، الماری کی طرف گئی، اور وہاں سے ایک خالی کارک بورڈ نکالا۔ اس نے میز پر آ کر اسے دیوار کے سہارے اچھے سے ایڈجسٹ کیا۔ پھر اس نے اپنی نوٹ بک کھولی اور اس پر موٹے مارکر سے چند الفاظ لکھے، اور پن اٹھا کر اسے اس بورڈ کے عین درمیان میں چسپاں کر دیا۔

"سلویٰ خان قتل کیس!"

وہ چند قدم پیچھے ہٹی اور اس خالی بورڈ کے مرکز میں لگے اس واحد نوٹ کو گھورنے لگی۔ اس کی پیشانی پر گہری لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔ سلویٰ کی موت حادثہ تھی یا ایک سوچی سمجھی سازش؟ اور اس سب میں حق کا کیا کردار تھا؟ کیا وہ گنہگار تھا یا بے گناہ؟ جب تک وہ خود اس سچ تک نہیں پہنچ جاتی، اسے چین نہیں آنے والا تھا۔

اس نے اپنی دراز سے تصاویر کا ایک پرانا البم نکالا۔ ورق گردانی کرتے کرتے اس کی انگلیاں ایک تصویر پر رک گئیں۔ وہ حق کی ایک دس سال پرانی تصویر تھی۔ جب اسکی آنکھوں میں ایک الگ سی چمک ہوا کرتی تھی۔ نیمل نے وہ تصویر نکالی اور بورڈ پر سلویٰ کے نام والے نوٹ کے بالکل برابر میں پن سے ٹانک دی۔ اس نے حق کی اس تصویر کو دیکھا، اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی تلخ مسکراہٹ اور گہرا تاسف ابھرا، اور وہ دھیمی آواز میں بڑبڑائی۔

"کاش تم بے گناہ نکلو... ہینری!"

پھر اس نے اپنا فون اٹھایا۔ اب وہ چیمبر میں اپنے سینئر سے رابطہ کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

خان ہاؤس کا ماحول تعزیت کرنے والوں کے شور سے بوجھل تھا۔ لاؤنج میں اب تک آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، مگر ڈرائنگ روم میں سنگین خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس پرائیویٹ ڈرائنگ روم میں اس وقت تین افراد موجود تھے۔ امجد بزدار، مسٹر خان، اور حق بزدار۔ امجد بزدار خود حق کو ساتھ لے کر یہاں آئے تھے تاکہ اس طوفان کو عدالتوں کی دہلیز تک جانے سے پہلے یہیں دبا دیا جائے۔ امجد بزدار نے نہایت نرمی مگر مضبوطی سے مسٹر خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"خان صاحب! ہماری دوستی دہائیوں پر محیط ہے۔ بچوں کی علیحدگی یا ان کے ذاتی اختلافات نے کبھی ہمارے رشتے میں دراڑ نہیں ڈالی۔ اب اس دکھ کی گھڑی میں اس رشتے کو مزید تار تار مت کیجیے۔ حق پر کسی بھی قسم کا مقدمہ دائر کرنا اس معاملے کو مزید زہریلا کر دے گا، جو کسی کے حق میں بہتر نہیں ہے۔"

مسٹر خان، جن کے چہرے پر بیٹی کے غم کی سیاہی اور غصے کی لکیریں نمایاں تھیں، امجد بزدار کی بات سن کر ایک دم پھٹ پڑے۔

"امجد صاحب! آپ اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر آپ نہیں جانتے۔ میری بیٹی کو پہلے سے خطرہ تھا... وہ ڈری ہوئی تھی۔ اور حق... حق جانتا تھا یہ سب۔ آخر یہ کیسے جانتا تھا؟ یہ میری بیٹی کو طلاق دینا نہیں چاہتا تھا، یہ اس پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ یہ اسے ڈرا رہا تھا۔ یہ اسے ذہنی اذیت دے رہا تھا۔"

حق ایک جانب صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر تاثرات پتھر کی طرح سخت تھے اور جبڑے اتنی بری طرح بھنچے ہوئے تھے کہ اس کے گالوں ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ وہ خاموشی سے سارا زہر پی رہا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سامنے بیٹھا شخص ایک باپ تھا، جس نے اپنی اکلوتی اولاد کھوئی تھی مگر اب بات اس کی اپنی عزت اور حد سے بڑھتی ہوئی الزام تراشی تک آ چکی تھی۔ مسٹر خان نے غصے سے کانپتی ہوئی انگلی حق کی طرف اٹھائی۔

"میں نے تم پر سب سے زیادہ بھروسہ کیا تھا، حق! جب سب لوگ تمہاری خاندانی روایات اور مزاج پر انگلی اٹھاتے تھے، میں اکیلا شخص تھا جو تمہاری سائیڈ لیتا رہا... اور بدلے میں تم نے میری بیٹی کی جان لے لی۔" انکا گلہ رندھ گیا۔ حق کا ضبط اب ٹوٹنے کے قریب تھا۔ اس کے اندر کا لاوا کھولنے لگا تھا۔ اس نے اچانک سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

"اگر مجھے سلویٰ کو مارنا ہوتا، مسٹر خان... تو میں اسے اسی دن مار دیتا، جس دن مجھے اس کے اور اشعر کے افیئر کا پتا چلا تھا۔"

ڈرائنگ روم میں ایک لمحے کے لیے ایسی موت کی سی خاموشی چھا گئی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دیتی۔ مسٹر خان کے اٹھائے ہوئے ہاتھ وہیں ہوا میں جم گئے۔ ان کا چہرہ جو ایک لمحے پہلے غصے سے سرخ تھا، اب زرد پڑ گیا۔ حق اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا قد اس وقت مسٹر خان کے سامنے بہت اونچا لگا۔

"میرے پاس اس کے ناجائز تعلقات کے سارے ثبوت موجود تھے...کال ریکارڈز، چیٹس، ویڈیوز، ہر ایک ثبوت! میں چاہتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا۔ مگر پھر بھی...میں نے اسے موقع دیا۔ میں نے اپنی انا، اپنی غیرت اور اپنے غصے کو مار کر سب کچھ بھلا دینے کا فیصلہ کیا...میں ایک نئی شروعات کرنا چاہتا تھا۔ صرف اپنے بچے کے لیے۔"

مسٹر خان چند پل کے لیے بالکل ساکت ہو گئے۔ یہ بات وہ بھی جان گئے تھے کہ سلویٰ حق سے خلع کے بعد اشعر کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی تھی۔

"اگر یہ سچ ہے تو تمہیں کیسے پتا کہ میری بیٹی کی جان کو خطرہ تھا؟ تمہیں کس نے بتایا تھا؟" انہوں نے کپکپاتے لبوں سے آخری سوال کیا اور حق نے اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ نکالا۔

"یہ مُجھے کچھ دن پہلے موصول ہوا تھا۔" حق نے وہ لفافہ میز پر رکھ دیا۔ مسٹر خان نے کپکپاتے ہاتھوں سے وہ لفافہ اٹھایا اور اندر ایک خط تھا۔ انہوں نے اسے کھولا اور اس پر چند سطریں تھیں۔ مسٹر خان کی نگاہیں ایک سطر پہ جم گئیں۔

"تمہاری بیوی کی جان کو خطرہ ہے بزدار صاحب!" مسٹر خان کے ہاتھوں سے وہ کاغذ چھوڑ کر نیچے گر گیا۔

"آج میں، یہ خط اور سلویٰ کے افیئر کے سارے ثبوت پولیس کو جمع کروانے والا ہوں۔" وہ اب ٹھنڈی نگاہوں سے مسٹر خان کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی مرحومہ بیٹی کی عزت اور اس کے اسکینڈلز کی دھجیاں کھلے عام کورٹ اور میڈیا میں اڑیں؟ آپ شوق سے مجھ پر مقدمہ کیجیے، کیس چلایئے! لیکن اس کے بعد جو میں آپ کے خاندان اور اس مرد (اشعر) کے ساتھ کروں گا...وہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"حق...زبان سنبھالو اپنی!" امجد بزدار نے فوراً سختی سے اسے ٹوکا۔

"آج نہیں۔" حق نے تنفر سے ان کی بات کاٹی۔ "یہ مُجھے کورٹ لے جانا چاہتے ہیں...اپنی اس بیٹی کے لیے جس نے میرے گھر، میرے اعتماد اور میرے بچے کی پیٹھ میں خنجر گھونپا؟ وہ اپنے معصوم بچے کو چھوڑ کر، جب اسے ماں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی...ایک غیر مرد سے ملتی رہی۔ میں نے اس سب کے باوجود اسے معاف کرنے کا سوچا...مُجھے بتائیں اس دنیا میں مجھ سے بڑا بے غیرت اور کون ہوگا؟" اسکی آواز میں غراہٹ تھی۔

"اور میں نے تین دن پہلے...طلاق کے کاغذات دستخط کر دیے تھے۔ میں نے اسے جانے دیا۔ اس سب کے باوجود میں نے اسے جانے دیا۔" حق نے تاسف سے سر ہلایا۔ "اور آپ میری طرف داری اس لیے کرتے تھے کیونکہ آپ جانتے تھے آپ کی بیٹی ایک نفسیاتی مریضہ ہے۔ جس نے مجھ سے شادی کرنے کے لیے خودکشی کر لی تھی وہ کیا کچھ نہیں کر سکتی تھی؟" وہ اب نہ صرف گڑے مردے اکھاڑ رہا تھا بلکہ اس نے مسٹر خان کے بھی بخیے ادھیڑ دیے تھے۔ مسٹر خان کے سامنے حقیقت ظاہر ہو چکی تھی جسے وہ اتنی دیر سے جھٹلا رہے تھے۔ حق کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا تھا بلکہ یہ تو موت ہی طبعی تھی۔ قتل کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اگر یہ کیس عدالت میں جاتا، تو سلویٰ کا افیئر اور اس کی نجی زندگی کے تمام پردے چاک ہو جاتے۔ وہ اپنی بیٹی کی لاش کو یوں سرِ عام رسوا ہوتے، اور اس کی یادوں کو کیچڑ میں اچھلتے کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مسٹر خان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ انہوں نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ لیے اور ان کے اندر دبا ہوا باپ کا سارا غرور، غصہ اور ضد ایک سسکی کے ساتھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔

"میں مقدمہ...مقدمہ واپس لے لوں گا..."

حق نے ایک سرد نظر مسٹر خان پر ڈالی۔ اپنی شرٹ کے کف درست کیے، اور مزید ایک لمحہ بھی وہاں رکنا گوارہ نہیں کیا۔ وہ بنا پیچھے مڑے، لمبے اور بھاری قدم اٹھاتا ہوا اس کمرے اور اس زہریلی فضا سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

دوپہر کا وقت تھا۔ سلال الماری سے اپنی ضروری چیزیں نکال رہا تھا جبکہ اس کے سامنے بیڈ پر تارہ اور نوفہ موجود تھیں۔ دونوں

کے میٹرک کے امتحانات قریب تھے اور بائیولوجی کا ایک موضوع ان کے لیے خاصا دردِ سر بنا ہوا تھا۔ تارہ نے اپنی کتاب کھولی اور ایک لمبی سانس لی۔

''سلال بھائی، ایک بات بتائیں؟'' نوفہ نے کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"پوچھو۔" سلال نے بیڈ پر رکھے اپنے بیگ میں کپڑے ڈالتے ہوئے کہا۔

''یہ میوٹیشن کیا ہوتی ہے؟''

''کتاب کھولو، سمجھا دیتا ہوں۔''

''نہیں!'' نوفہ نے فوراً احتجاج کیا۔ ''کتاب والا سبق نہیں پڑھنا۔ وہ تو میں خود بھی پڑھ سکتی ہوں۔ آپ ہمیں عام سائنسی انداز میں مت سمجھایئے گا۔ کچھ ایسا بتائیں جو دماغ میں بیٹھ جائے۔''

تارہ نے پنسل رکھ دی۔

''اسے کوئی کہانی سننی ہے، بھائی۔ آپ بس کوئی کہانی سنا دیں، یہ خود ہی میوٹیشن کو اپنی زندگی میں فٹ کر لے گی۔''

''تم چپ رہو!'' نوفہ نے اسے گھورا۔ ''ہر بات میں ٹانگ اڑانا ضروری ہے؟''

سلال ان کی بحث پہ ہنس دیا۔ حالانکہ یہی ٹاپک وہ کل نیمل سے سمجھ رہی تھیں اور آج سلال کے سر پہ سوار تھیں۔ ان دونوں میں سے جو اچھا سمجھا دیتا پھر اسے بیسٹ ٹیچر کا ایوارڈ ملتا۔ وہی بہترین استاد کہلاتا۔

''اچھا، تو کہانی ہی سن لو۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ، تم دونوں نے کبھی سوچا ہے کہ ایک چھوٹی سی غلطی پوری کہانی کیسے بدل سکتی ہے؟''

اب وہ الماری کے نچلے خانے سے اپنے جوگرز نکال رہا تھا۔

''جیسے ہیرو غلطی سے، غلط لڑکی سے شادی کر لے؟'' نوفہ نے فوراً کہا۔

''تمہاری ساری مثالیں شادی پر کیوں ختم ہوتی ہیں؟'' سلال نے اسے گھورا۔

''کیونکہ کہانیاں ہی ایسی ہوتی ہیں۔'' تارہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔

''کیونکہ کہانیوں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔" نوفہ نے بھنویں سکیڑ کر تصحیح کی۔

سلال نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ایک کاپی اٹھائی اور اس پر چند سطریں لکھ دیں۔

''فرض کرو، ایک کہانی ہے جس میں سب کچھ اپنی جگہ پر ہے۔ کردار وہی کر رہے ہیں جو انہیں کرنا چاہیے، واقعات ایک ترتیب سے آگے بڑھ رہے ہیں اور کسی کو اندازہ نہیں کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ پھر ایک کردار سے غلطی ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ایسا کام کر بیٹھتا ہے جس سے اسے منع کیا گیا تھا۔ اب بتاؤ، کیا ہوگا؟''

''اسے سزا ملے گی۔'' تارہ نے کہا۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے۔'' سلال نے جواب دیا۔ ''لیکن میں تم سے کہانی کا انجام نہیں پوچھ رہا۔ میں پوچھ رہا ہوں کہ اب کہانی پہلے جیسی رہے گی؟''

نوفہ نے سر ہلایا۔ ''نہیں۔ اب سب کچھ بدل جائے گا۔''

''بالکل! ایک فیصلہ، ایک غلطی لیکن اس کے بعد آنے والے واقعات پہلے جیسے نہیں رہیں گے۔ کسی کو نقصان ہوگا، کسی کو کچھ نیا سیکھنے کو ملے گا، کوئی بچھڑ جائے گا، کوئی نیا راستہ اختیار کرے گا۔ اور وہ کردار جو کچھ دیر پہلے اپنی زندگی کے معمول میں مصروف تھا، اب ایک بالکل مختلف کہانی کا حصہ بن چکا ہوگا۔''

سلال نے کاپی اپنی جانب سرکائی۔ ''اب اسی بات کو ذرا بڑے پیمانے پر سوچو۔'' نوفہ اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''صدیوں پہلے کی بات سوچو۔ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ جنت میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خاص درخت کے قریب جانے سے منع فرمایا تھا۔ لیکن پھر وہ ممنوعہ کام ہوا، اور ان کی زندگی کا مرحلہ بدل گیا۔ وہ زمین پر آئے، جہاں انسان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔''

وہ چند لمحے رکا۔ ''اب غور کرو، نوفہ! اگر تم اسے ایک کہانی کی طرح دیکھو تو تمہیں کیا نظر آتا ہے؟''

نوفہ نے کچھ سوچا۔ ''ایک ایسا فیصلہ جس کے بعد کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا؟''

''ہاں۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ یہ مذہبی حقیقت ہے، اسے سائنسی میوٹیشن نہیں کہیں گے۔ میں تمہیں صرف ایک بات سمجھانے کے لیے دونوں کے درمیان مماثلت دکھا رہا ہوں۔ سمجھ آئی؟''

تارہ نے اپنی کاپی پر لکھتے ہوئے پوچھا، ''تو میوٹیشن ایک غلطی ہوتی ہے؟''

''سائنس میں میوٹیشن کا مطلب ڈی این اے کی ترتیب میں تبدیلی ہے۔اسے لازماً غلطی یا گناہ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ہر تبدیلی نقصان دہ نہیں ہوتی۔بعض کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہوتا،بعض نقصان پہنچاتی ہیں اور بعض فائدہ بھی دے سکتی ہیں۔''

سلال نے نوفہ کی طرف دیکھا۔

''لیکن تم نے ایک بات کہی تھی نا، کہانیوں میں ایک کردار کی غلطی سے پوری کہانی بدل جاتی ہے؟ یہی بات یاد رکھو۔تم کہانیاں پڑھتی ہو۔تم جانتی ہو کہ ایک کردار کبھی کبھی صرف ایک غلط فیصلہ کرتا ہے،مگر اس فیصلے کا اثر باقی کرداروں کی زندگیوں تک پہنچ جاتا ہے۔''

نوفہ نے آہستہ سے کہا،''اور پھر وہ سب اس غلطی کے نتائج بھگتتے ہیں۔''

''بالکل۔''سلال نے کمر سیدھی کر لی۔''فرض کرو،ایک کہانی میں کوئی شخص غصے میں آ کر ایک ایسا راز بتا دیتا ہے جسے اسے چھپانا چاہیے تھا۔وہ بس ایک جملہ تھا۔لیکن اس جملے سے دو لوگوں کے درمیان بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے۔ایک رشتہ ٹوٹ جاتا ہے،کوئی تیسرا شخص اس موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور پھر پوری کہانی ایک نئی سمت میں چلی جاتی ہے۔اب اگر وہ شخص اگلے دن اپنی بات واپس لینا بھی چاہے تو کیا سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا؟''

''نہیں۔''نوفہ نے جواب دیا۔

''کیوں؟''سلال نے دوبدو پوچھا۔

''کیونکہ بات سننے والا اسے سن چکا ہوگا۔''

''اور یہی تو بات ہے۔''سلال نے انگلی اٹھائی۔''کچھ چیزیں واپس نہیں لی جا سکتیں۔معافی مانگی جا سکتی ہے،نقصان پورا کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے،لیکن گزرے ہوئے لمحے کو مٹایا نہیں جا سکتا۔''

تارہ نے مسکراتے ہوئے کہا،''سلال بھائی،آپ تو ہمیں بائیولوجی پڑھاتے پڑھاتے زندگی کے سبق دینے لگ گئے ہیں۔''

''سبق تم نے خود مانگا تھا۔''سلال نے کندھے اچکائے۔

''ہاں لیکن اتنا سنجیدہ نہیں مانگا تھا۔'' تارہ کو اتنی گہری باتوں سے کوفت ہوتی تھی۔ سلال ہنس دیا، پھر اس کی نظر نوفہ پر پڑی جو اب خاموشی سے اپنی انگلی پر پنسل گھما رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ کوئی اور سوال ہے؟'' سلال نے سنجیدگی سے پوچھا۔ نوفہ نے سر اٹھایا۔
''ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ اگر غلطی کے بعد انسان بدل جاتا ہے تو کیا وہ ہمیشہ برا انسان بن جاتا ہے؟''
سلال کی مسکراہٹ مدھم ہوگئی۔

''نہیں۔ ایک غلطی کسی انسان کی پوری زندگی کا فیصلہ نہیں کرتی۔ لیکن اس کے بعد وہ کیا کرتا ہے، یہ ضرور اہم ہوتا ہے۔ کوئی اپنی غلطی مان کر اسے درست کرنے کی کوشش کرتا ہے، کوئی دوسروں پر الزام ڈال دیتا ہے اور کوئی جانتے بوجھتے وہی کام دوبارہ کرتا ہے۔ تینوں کے انجام ایک جیسے نہیں ہوتے۔''
''یعنی غلطی سے زیادہ اہم اس کے بعد کا فیصلہ ہے؟''
''ہاں، کئی بار۔'' نوفہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنی کاپی کھولی اور صفحے کے اوپر لکھا۔
"طَفَرَہ یعنی میوٹیشن!" اس کے نیچے سلال کی بتائی ہوئی سائنسی تعریف لکھنے کے بجائے اس نے ایک جملہ لکھا۔
" کبھی کبھی کسی کردار کی ایک چھوٹی سی غلطی پوری کہانی کا رخ بدل دیتی ہے۔" سلال نے اس کی کاپی میں جھانکا۔
''یہ امتحان میں مت لکھ دینا، ورنہ فیل ہو جاؤ گی۔''
تارہ زور سے ہنس دی۔ نوفہ بھی مسکرائی، مگر اس نے اپنا جملہ نہیں مٹایا۔ اس نے اس کے گرد ایک چھوٹا سا دائرہ بنایا اور پھر ایک اور سطر لکھ دی۔

"اور کبھی انسان کو بہت دیر بعد معلوم ہوتا ہے کہ کہانی اب واپس پہلے جیسی نہیں ہو سکتی۔"

اس بار اس نے سلال کو نہیں دکھایا۔ کیونکہ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں سمجھنے کے لیے استاد کی ضرورت نہیں رہتی۔

☆.....☆.....☆

رات کے اس پہر، کامل کے کمرے میں ایک عجیب سی گھٹن کا عالم تھا۔ بستر پر کامل نیم دراز تھا، اس کا سارا جسم شدید بخار کی وجہ سے تپ رہا تھا۔ ڈاؤن سنڈ روم کا شکار ہونے کی وجہ سے کامل پہلے ہی دنیا کو سمجھنے اور اپنی بات کہنے کے معاملے میں عام بچوں سے مختلف تھا۔ اس کی دنیا اس کی آیا اور اس کے ماں اور باپ گرد گھومتی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ اپنی ماں کو نہیں دیکھ پایا تھا اور اب وہ اسے یاد کر رہا تھا۔ شروع میں آیا نے اسے معمول کی دوا دی تھی، اس امید پر کہ بخار اتر جائے گا اور وہ سو جائے گا۔ مگر رات گہری ہونے کے ساتھ اس کی بے چینی بھی بڑھتی گئی۔ وہ کبھی بستر پر لیٹتا، کبھی اٹھ کر دروازے کی طرف جاتا اور کبھی روتے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے آیا کو پیچھے دھکیل دیتا۔

"ما...ماما...!"

آیا اسے سنبھالنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی، مگر کامل قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بار بار بستر پر ہاتھ مار رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ تبھی دروازہ کھلا اور حق اندر داخل ہوا۔ اسکے چہرے پر اضطراب تھا۔ وہ ہسپتال سے آیا تھا۔ اس نے کوٹ اتار کر کرسی پر ڈالا اور سیدھا بستر کی طرف بڑھا۔

"کامل کسی طرح چپ نہیں ہو رہا..." آیا نے پریشان ہو کر بتایا، "اور یہ کچھ کھا بھی نہیں رہا۔" حق نے خاموشی سے آگے بڑھ کر کامل کو اٹھانے کی کوشش کی۔

"کامل...ادھر دیکھو بیٹا..."

مگر کامل نے روتے ہوئے غصے سے حق کا ہاتھ جھٹک دیا اور بستر کے دوسرے کونے میں منہ چھپا کر رونے لگا۔ حق نے زبردستی کرنے کے بجائے بستر پر اس کے پاس ہی گھٹنے ٹیک دیے۔ اس نے آیا کو اشارہ کیا۔

"جاؤ، تھرمامیٹر اور تولیہ لے کر آؤ۔ اور ڈاکٹر دانیال کو فون کرو کہ وہ فوری طور پر گھر آئیں۔" آیا فوراً کمرے سے باہر چلی گئی۔ حق نے کامل کو زبردستی گود میں لینے کے بجائے اس کے بالکل قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ کامل نے پہلے ہاتھ کھینچنا چاہا، پر حق کی گرفت مضبوط مگر نرم تھی۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے پانی میں بھیگا ہوا تولیہ اٹھایا اور احتیاط

سے کامل کے ماتھے پر پھیرنا شروع کیا۔

"بس...اب ٹھیک ہو جائے گا کامل..." حق کی آواز دھیمی تھی، "بابا کے پاس آؤ... بابا یہیں ہے۔"

کامل تھوڑی دیر ضد کرتا رہا، روتا رہا، مگر مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی توانائی اب جواب دے رہی تھی۔ اس کی سسکیاں آہستہ آہستہ ہچکیوں میں بدلنے لگیں۔ حق نے اسے سہارا دے کر اپنے سینے سے لگایا۔ کامل کا سر جب حق کے کندھے پر ٹکا، تو اس کا نڈھال جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر دانیال اپنی ایمرجنسی کٹ کے ساتھ پہنچ گئے۔ انہوں نے فوری طور پر کامل کا معائنہ کیا، اس کے سینے اور گلے کو چیک کیا، اور بخار کم کرنے کے لیے ضروری دوا اور قطرے دیے جس سے اسکی کی حالت کچھ سنبھلی۔ پھر وہ حق کو چند ہدایات کر کے چلے گئے۔ دوا کے اثر سے جب بخار کا زور توڑا، تو کامل کی بوجھل پلکیں آپس میں جڑ گئیں۔ وہ اپنے باپ کے کندھے پر ہی سر ٹکائے، نیم بے ہوشی کی حالت میں گہری نیند میں سو گیا، مگر سوتے ہوئے بھی اس کا ایک چھوٹا سا ہاتھ حق کی شرٹ کے کف کو مٹھی میں جکڑے ہوئے تھا۔ حق وہیں صوفے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی گود میں اس کا بیمار بچہ سو رہا تھا، اور اس کے اپنے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔

"اس معصوم کی اس اکیلی دنیا کو وہ کیسے سنبھالے گا؟"

☆.....☆.....☆

آج اتوار کا دن تھا اور باہر کا موسم عجیب ہی روپ دھارے ہوئے تھا۔ کالی گھٹاؤں نے پورے آسمان کو گھیر رکھا تھا اور تیز بارش نے ماحول میں پھر سے خنکی گھول دی تھی۔ تقریباً دس بجے کے قریب نجف نے سقراط کے کمرے کا دروازہ ہولے سے دھکیلا تو وہ بغیر لاک کے با آسانی کھل گیا۔ اندر مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا اور پردوں کی درزوں سے آتی ہلکی سی سرمئی روشنی میں سقراط بستر پر آدھا ترچھا لیٹا، بے خبر سو رہا تھا۔ نجف دبے قدموں باتھ روم کی طرف بڑھی۔ اس کا اپنا شیمپو ختم ہو چکا تھا۔ اس نے آن لائن آرڈر تو کر دیا تھا لیکن تیز بارش کی وجہ سے ڈیلیوری فی الحال معطل تھی۔ یہاں آنے کے بعد اسے ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ بزدار پیلس میں سارے کام ملازمین خود بخود کر دیتے تھے۔ اسے ایسی چیزوں کے ختم ہونے اور پھر نئی آنے کا کبھی علم نہیں ہوا۔ وہ باتھ روم کے اندر گئی، سائیڈ ریک سے شیمپو کی بوتل اٹھائی اور جیسے ہی وہ فتح

مندانہ انداز میں واپس مڑ کر دروازے کے قریب پہنچی، عقب سے ابھرتی ہوئی ایک گہری آواز پر وہیں ساکت ہوگئی۔

"چور صاحبہ...صبح صبح کیا لے کر جا رہی ہیں؟"

نجف کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔اس کی بند آنکھوں کے سامنے اپنی ہی حماقت لہرائی۔آخر اس نے سوچا بھی کیسے کہ وہ سقراط کا شیمپو چوری کر سکتی ہے؟ کاش وہ نیچے نیمل کے پاس چلی جاتی۔مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور وہ رنگے ہاتھوں پکڑی جا چکی تھی۔اس نے چہرے پر مصنوعی ڈھٹائی سجائی، رخ موڑا اور تن کر بولی۔

"ہیرے نہیں چرائے میں نے...صرف شیمپو لیا ہے۔"

سقراط نے بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے، کشن کے سہارے سر اٹھایا اور اپنی خواب ناک آنکھوں سے اسے گھورا۔

"تو اتنا چوری چھپے آنے جانے کی ضرورت کیا ہے؟"

"تاکہ تمہاری قیمتی نیند خراب نہ ہو!" نجف دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی تھی، اس نے ابرو اچکا کر ترت جواب دیا۔سقراط کے لبوں کے کنارے پر ایک مدہم مسکراہٹ ابھری۔وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے...میری اتنی فکر؟ کہیں محبت تو نہیں ہوگئی؟" نجف کا دل چاہا کہ شیمپو کی بوتل سقراط اسکے سر میں دے مارے۔ اس کا چہرہ غصے اور خفگی سے سرخ ہو گیا۔

"انسان کچھ بھی ہو پر خوش فہم نہ ہو۔" وہ سلگ کر بولی۔سقراط نے ایک گہری سانس خارج کی، بستر سے پیر نیچے اتارے اور ایک نظر نجف کے سرخ چہرے پر ڈالنے کے بعد اس کے ہاتھ میں جکڑی شیمپو کی بوتل کو دیکھا۔

"ویسے...جانتی ہو میرا یہ شیمپو کتنا مہنگا ہے؟" یا اللہ! وہ اتنا کم ظرف کیوں تھا؟ نجف نے شدید صدمے اور تحقیر کی کیفیت میں اسے دیکھا۔اس سے مزید برداشت نہ ہوا اور اس نے پوری قوت سے وہ شیمپو کی بوتل سقراط کی طرف اچھالی، جسے سقراط نے نہایت مہارت سے ہوا میں ہی کیچ کر لیا۔وہ جھٹکے سے مڑی، اپنے کمرے میں آئی اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی بیڈ پر گر گئی اور خود پر ضبط قائم کرنے کی ناکام کوشش میں فون اٹھا کر اسکرین سکرول کرنے لگی۔مگر سقراط کے

ان جملوں نے اس کے اندر جو آگ لگائی تھی، وہ اتنی آسانی سے بجھنے والی نہیں تھی۔ ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ اس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور بغیر اجازت دروازہ کھل گیا۔ سقراط آستینیں اوپر چڑھائے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا تھا۔ اس کے گیلا چہرہ چمک رہا تھا اور بال پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر وہ شیمپو کی بوتل سائیڈ میز پر رکھی۔

"یہ لو۔"

" کوئی ضرورت نہیں ہے۔" نجف نے فوراً فون سائیڈ پر پٹخا اور تپ کر سیدھی ہو بیٹھی، "میں پہلے ہی اپنا آرڈر کر چکی ہوں۔ بس بھول گئی تھی کہ تم کتنے کم ظرف انسان ہو۔"

سقراط نے اپنے لب بھینچ کر اس کے غصے سے سرخ ہوتے چہرے کو گہری نظروں سے دیکھا۔ "ہاں جانتا ہوں...لیکن پھر بھی، تم یہ استعمال کر سکتی ہو۔ مُجھے بعد میں نیا لا دینا۔"

"تمہارا مسئلہ کیا ہے، سقراط؟" وہ اسی سرخ چہرے اور دہکتی آنکھوں سے استفسار کر رہی تھی۔ سقراط کے تاثرات یکلخت بدلے۔ اس نے اپنی گہری بوجھل نگاہوں کو نجف کے چہرے پر جمایا اور نہایت مدہم لہجے میں بولا۔

"تم...تم ہو میرا مسئلہ۔"

نجف چند پل کے لیے بالکل ساکت ہو گئی۔ سقراط کا لہجہ عام نہیں تھا۔ وہ نرم سا تاثر لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور یہی... ہاں یہی موقع تھا حساب برابر کرنے کا۔

" کہیں تم...آج بھی مجھ سے محبت تو نہیں کرتے؟" اس نے اپنے بال شانے سے پیچھے کرتے ہوئے، نہایت سلگانے اور جتانے والے انداز میں پوچھا۔ یہ سوال پتھر کی پڑا اور اسی لمحے، شیشے کا وہ نازک طلسم چھناکے سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔ سقراط کے چہرے پر تیرتی نرمی اور شائستگی پل کے سوویں حصے میں غائب ہو گئی۔

"تم پتھر ہو نجف! اور میں پتھروں کو نہیں پوجتا۔"

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ نجف کے چہرے کی وہ مغرور مسکراہٹ لمحوں میں غائب ہو گئی۔ سقراط نے مزید ایک لفظ کہے بغیر اپنا رخ موڑا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ بند ہو گیا...اور نجف بستر کے کنارے پر، اس ساکت کمرے میں، بالکل اکیلی بیٹھی رہ گئی۔ باہر بارش مسلسل برس رہی تھی مگر اندر کی فضا اب پہلے سے کہیں زیادہ خاموش

اور سنسان ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

سقراط نچلی سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو لاؤنج میں معمول سے کہیں زیادہ رونق لگی ہوئی تھی۔آج اتوار کا دن ہونے کے باعث گھر کے تقریباً تمام افراد ہی گھر میں موجود تھے۔دادی جان نے صوفے پر بیٹھے سلال کا بازو سختی سے جکڑ رکھا تھا اور ان کے چہرے پر شدید تشویش اور برہمی کے ملا جلا تاثرات تھے۔

"تم کیوں جا رہے ہو؟ اتنی دور...؟ جانے وہاں کیسی موذی وبا پھیلی ہوئی ہے۔تمہارا ہی جانا وہاں کیا اتنا ضروری ہے؟" وادیِ لیڈی میں پھیلی ناگہانی وبا کی خبریں اب میڈیا پر زور پکڑ چکی تھیں، اور سلال بطور رضا کار اپنی ٹیم کے ساتھ اس خطرے کے مرکز میں قدم رکھنے والا تھا۔سلال نے دادی کے جھریوں والے ہاتھوں کو نہایت محبت سے اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور انہیں رام کرنے والے انداز میں بولا۔

"دادی! یہ ضروری ہے۔میرے لیے، میری ڈاکٹر کی ڈگری کے لیے...اور وہاں تڑپتے ہوئے انسانوں کے لیے۔یہ ہمارا فرض ہے۔"

"بھئی اگر اتنا ہی ضروری ہے جانا تو وہ پاپن جائے نا...جس کے باپ کا ہسپتال ہے۔تم کیوں اپنے آپ کو اس آگ میں جھونک رہے ہو؟"

سیڑھیوں کے آخری پائے پر قدم رکھتے سقراط نے جیسے ہی یہ جملہ سنا، اس کے قدم وہیں جم گئے۔اس کی آنکھوں میں شدید حیرت اتر آئی۔سلال کی نظر جیسے ہی سیڑھیوں پر کھڑے سقراط پر پڑی، اس نے جلدی سے دادی کے ہاتھ پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔مگر دادی کہاں رکنے والی تھیں۔

"ارے بھئی! یہ مُجھے کیا اشارے کر رہے ہو؟ میں کیا ڈرتی ہوں اس پاپن سے؟ سچ ہی تو کہہ رہی ہوں۔" دادی کی آواز مزید اونچی ہو گئی۔

"اماں...!" سقراط کی سخت آواز لاؤنج میں گونجی، تو دادی کی مسلسل چلتی زبان کو جیسے اچانک بریک لگ گئی۔سقراط لمبے قدم

اٹھاتا ہوا آگے آیا، اس کے چہرے پر برہمی صاف عیاں تھی۔

"یہ بچوں کے سامنے کس قسم کے الفاظ استعمال کر رہی ہیں آپ؟" دادی نے تن کر سقراط کو دیکھا۔
"نہ! کیا غلط کہہ دیا میں نے؟ دشمنوں کی بیٹی کو سر پر بٹھا رکھا ہے اور اب میرے بولنے پر بھی پابندیاں لگاؤ گے؟"
سقراط نے گہری سانس لی، وہ دادی سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ان کا یہ رویہ روز روز عجیب ہوتا جا رہا تھا۔ قبل اس کے کہ سقراط اور دادی کے درمیان باقاعدہ نوک جھونک اور تلخی بڑھتی، سلال نے فوراً بیچ میں آ کر دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔
"خدا کا واسطہ ہے... بس کر دیں آپ دونوں۔ میں ایک اتنے خطرناک مشن پر جا رہا ہوں، کم از کم مجھے اس گھر سے لڑائی جھگڑا دیکھ کر تو نہ رخصت کریں۔"

سلال کے اس جملے نے فضا میں ایک لمحے کے لیے خاموشی طاری کر دی۔ تبھی کچن کے دروازے سے ہاتھ میں چپس کی پلیٹ سنبھالے نامرہ باہر نکلی۔ اس نے سلال کی بات سن کر تحقیر سے ناک سکیڑی۔
"ہاں ہاں! مہاراج تو جیسے سرحد پر جنگ لڑنے جا رہے ہیں... جو ہم سب ان کے آگے زانو ٹیک کر بیٹھ جائیں۔"
"تم کیوں ہر آگ میں کود پڑتی ہو؟" سلال نے اسے ٹوکا۔
"تصحیح کیجیے ڈاکٹر صاحب! نامرہ صرف اس آگ میں کودتی ہے جسکے شعلے اسکی دادی کمالہ بیگم کی طرف لپکتے ہیں۔" اس نے ادائے بے نیازی سے کہا اور پلیٹ تھامے، دونوں پیر اوپر چڑھائے دادی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں تو میں نے کیا غلط کہہ دیا؟ پاپن (گنہگار) ہی تو کہا ہے اسے۔" دادی کا لہجہ ذرا نہیں بدلا۔ سقراط نے شدید تاسف اور افسوس سے سر ہلایا۔ اور مزید کوئی بحث کیے، چپ چاپ پلٹ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ پیچھے لاؤنج میں سلال نے ایک طویل، ملامتی نگاہ دادی اور نامرہ کے چہروں پر ڈالی... مگر ان دونوں کی ڈھٹائی کا یہ عالم تھا کہ ان کے سر پر جوں تک نہ رینگی۔ نامرہ نے مزے سے چپس کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا اور دوسرا دادی کے۔ سلال نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

گول میز کانفرنس والے اس کشادہ کمرے میں اس وقت سلال، نامرہ، تارہ اور نوفہ موجود تھے۔ گیارہ مارچ آنے والی تھی۔ یعنی نیمل کی سالگرہ، اور اس بار کا معاملہ الگ تھا کیونکہ سلال جلد ہی وادیِ لیڈی کے خطرناک مشن پر روانہ ہونا تھا۔ جانے سے پہلے، وہ سب پلان کر کے جانا چاہتا تھا۔ وہ میز کے قریب کھڑا تھا، اس کے چہرے پر فکرمندی اور جوش کا ایک عجیب سا امتزاج تھا۔

"یہ پہلی بار ہے جب میں نیمل آپی کی سالگرہ پر ان کے ساتھ نہیں ہوں گا بلکہ امی بھی نہیں ہیں۔" سلال نے دھیمی اور کرب زدہ آواز میں کہا، "مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم اس دن کو یوں ہی جانے دیں۔ میں انہیں وہاں سے وش کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ لیکن یہاں کا سارا انتظام...تم سب کو بالکل ویسا ہی کرنا ہوگا جیسا میں کہہ رہا ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟"

تارہ نے فوری طور پر جوش سے سر ہلا دیا۔ "بالکل بھائی! آپ بےفکر رہیں، ہم سب سنبھال لیں گے..."
"اچھا...ایک بات کہوں؟ کیا ہمیں اس پلان میں خالہ (نجف) کو بھی بلا لینا چاہیے؟" نوفہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں! اس کی یہاں کیا ضرورت ہے؟ ہم خود سب کر لیں گے۔" نامرہ تڑخ کر بولی۔ نوفہ نے نامرہ کی ناگواری کو نظر انداز کرتے ہوئے دلیل دی۔

"اس دن سلال بھائی تو ہوں گے نہیں...اور ویسے بھی ہمارے ساتھ امی بھی نہیں ہیں۔ میرے خیال سے اس موقع پر خالہ کا ہونا، ان کا ساتھ دینا ہمارے لیے اچھا ہوگا۔ وہ چیزوں کو بہتر طریقے سے مینج کر سکتی ہیں۔"

نامرہ نے کچھ دیر منہ بگاڑ کر اختلاف کیا، مگر تارہ اور سلال نے بھی نوفہ کی بات کی تائید کی، تو آخر کار نامرہ کو منہ بنا کر چپ ہونا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں نجف کو اس کانفرنس روم میں بلا لیا گیا۔ جب نجف نے دروازہ کھول کر قدم رکھا اور سلال کے منہ سے یہ سنا کہ وہ سب نیمل کی سالگرہ کے لیے کوئی خفیہ سرپرائز پلان کر رہے ہیں اور اس میں نجف کی بھی شمولیت چاہتے ہیں، تو اس کے چہرے پر پہلے ہلکی سی حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ کچھ لمحے ساکت کھڑی رہی ایک ایسے گھر میں جہاں عام طور پر اس کے وجود کو ناپسند کیا جاتا تھا، وہاں بچوں کا اسے اس خاص خوشی کا حصہ بنانا اس کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ پھر اس کے دل میں ایک

خوشگوار سی حیرت اتر آئی۔اس کے چہرے کے تھکے ہوئے تاثرات ایک نرم سی مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔

"اگر ہم واقعی نیمل کو سرپرائز دینا چاہتے ہیں،تو روایتی کیک کاٹنے سے ہٹ کر کچھ مختلف کرنا ہوگا..." نجف نے دیوار پر لگی بڑی سی گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر ایک پراعتماد انداز میں اپنے آئیڈیاز دینا شروع کیے،"سلال!تم کیمپ سے ایک چھوٹا سا ویڈیو میسج ریکارڈ کر کے مجھے پہلے ہی بھیج دینا،جسے ہم اس دن پروجیکٹر چلائیں گے۔اور سجاوٹ کے لیے...گلاب کے پھولوں کے بجائے اگر ہم اس کی پسندیدہ پرانی یادوں کو فریم کر کے..."
اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی،اور اس کے بتائے ہوئے ایک ایک آئیڈیا میں اتنی پختگی اور اپنائیت تھی کہ نامرہ کی ابتدائی ناپسندیدگی بھی دھیرے دھیرے تحلیل ہونے لگی۔بارش کی بوندیں اب بھی باہر شیشوں پر تھپتھپا رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

نیمل شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی کہ اتنے میں اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔اسکرین پر ایک انجان نمبر جگمگا رہا تھا۔
نیمل نے کال رسیو کی۔وہ اسکے سکول کے زمانے کی دوست عطیہ تھی۔چند لمحوں کی عام خیریت کے بعد بات شادی کی دعوت تک جا پہنچی۔عطیہ اپنی شادی کی خوشخبری سنا رہی تھی،مگر باتوں ہی باتوں میں اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔

"نیمل!تم اس دن لازمی آ رہی ہو نا؟" عطیہ نے قدرے جذباتی ہو کر پوچھا۔نیمل سے فوری کوئی جواب نہیں بن پایا۔
"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی اور مُجھے حیرت ہو رہی ہے کہ تمہیں میں یاد ہوں۔"
"دوست بھی بھلا بولنے والی چیز ہیں؟" عطیہ اسی انداز میں بولی۔

"ہاں لیکن آج کل دوستیوں کے مطلب بدل چکے ہیں۔کچھ عرصے بعد لوگوں کو ایک دوسرے کی شکل بھی یاد نہیں رہتی۔" نیمل نے وہ حقیقت بیان کی جس سے وہ گزر چکی تھی۔
"ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن سچے دوست اور پرانے ساتھی کبھی بھی مشکل وقت میں ایک دوسرے کو تنہا نہیں چھوڑتے...چاہے ان سے کتنے ہی گلے شکوے کیوں نہ ہوں،چاہے اب وہ دوستی باقی نہ رہی ہو۔"

عطیہ کے یہ جملے ہوا میں تحلیل ہو گئے، مگر نیمل کا ذہن دوستی اور تعلق کے تقاضے میں الجھ گیا۔ بے چینی اور گھٹن محسوس کرتے ہوئے وہ کچن سے نکلی اور ٹہلتی ہوئی باہر صحن میں آ گئی۔ لیکن لان میں دھری کرسیوں میں سے ایک پہ بیٹھی نجف کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اور اس کا رخ دوسری طرف ہونے کی وجہ سے نجف، نیمل کو دیکھ نہیں پائی تھی۔

"ہاں میری بات ہوئی تھی۔ کامل کی طبیعت اب پہلے سے کچھ بہتر ہے، لیکن بچہ بار بار ماں کو ڈھونڈتا ہے۔ اور حق بالکل اکیلا پڑ چکا ہے۔"

دوسری جانب کون تھا نیمل نہیں جانتی تھی مگر وہ مزید الجھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کے وہ تمام مناظر گھوم گئے جب حق اس کے بچپن اور لڑکپن کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ شکوے کتنے ہی سہی، فاصلے کتنے ہی طویل کیوں نہ ہو گئے ہوں... مگر کیا انسانیت اور پرانے تعلق کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اس بربادی کو تماشائی بن کر دیکھتی رہے؟ لان کی اس خاموش اور ٹھنڈی فضا میں نیمل کا دل اندر سے کلس اٹھا۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ اس وقت حق کو کسی دشمن کی نہیں، بلکہ ایک ایسے انسان کی ضرورت تھی جو اس کی اس مشکل وقت میں اس کے ساتھ کھڑا ہو سکے۔ دل و دماغ کی جنگ زور پکڑ چکی اور وہ الٹے قدموں پلٹ گئی۔

☆.....☆.....☆

سلال نمازِ ظہر ادا کر کے جلدی سے واپس گھر لوٹ آیا تھا، کیونکہ اسے وادیِ لیڈی کے اس ہنگامی طبی مشن پر روانہ ہونے کے لیے کالج پہنچنا تھا۔ جیسے ہی وہ مرکزی گیٹ کے قریب پہنچا، اس کی نظر زمین پر پڑی۔ وہاں ایک سادہ سا لفافہ نما کارڈ پڑا تھا۔ عجب بات یہ تھی کہ وہ بالکل خشک تھا۔ اس پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہیں پڑا تھا، جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے کسی نے چند منٹ پہلے ہی وہاں رکھا تھا۔

سلال ماتھے پر ہلکی سی شکن ڈال کر جھکا اور وہ کارڈ اٹھا لیا۔ کارڈ کھول کر دیکھا تو اس پر ہاتھ سے لکھی ہوئی اردو کی چند سطریں درج تھیں۔

"اسے میرے خلاف ایک ثبوت چاہیے تھا،

مگر میرے پاس ایسا کوئی عمل نہ تھا جسے وہ جرم کہہ سکتا۔

پھر اس نے میرے کردار کو تخت پر رکھا۔"

اور بالکل نیچے کونے میں Be Careful انگریزی میں جلی حروف میں لکھا تھا۔ سلال چند لمحوں کے لیے جم کر رہ گیا۔ اس نے بھنویں سکیڑ کر کارڈ کو دیکھا، پھر چوکنا ہو کر دائیں بائیں گلی اور سڑک کا جائزہ لیا مگر وہاں دور دور تک کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر اس نے کندھے اچکائے، اس گہرے جملے کی تہہ تک پہنچنے کا فی الحال وقت نہیں تھا، اس لیے اس نے وہ کارڈ کوڑے والی ٹوکری میں ڈالا اور صحن سے گزرتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں شبگیر ہاؤس کے تمام افراد مرکزی گیٹ پر جمع ہو چکے تھے۔ پہلی بار سلال اتنے دنوں کے لیے کہیں جا رہا تھا اور خاندان کے ہر فرد کے دل میں ایک عجیب سی گھبراہٹ اور دعاؤں کا سمندر موجزن تھا۔ سب سے پہلے دادی آگے بڑھیں، انہوں نے سلال کے ماتھے پر پیار دیا، اس کی بلائیں لیں اور اس کے سینے پر پھونک مار کر اللہ کے سپرد کیا۔

"اللہ تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے، سلال... اپنا بہت خیال رکھنا۔" نیمل نے دعا دی۔ تارہ اور نوفہ نے آگے بڑھ کر اس کے بازو کو تھام لیا اور محبت بھرے لہجے میں بولیں۔

"بھائی... جلدی واپس آیئے گا۔"

سرمد صاحب نے آگے بڑھ کر اپنے اس ہونہار بیٹے کو مضبوطی سے اپنے گلے سے لگا لیا، ان کی آنکھوں میں فخر تھا۔ سقراط نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سلال کا چہرہ تھاما۔

" کوئی بھی مسئلہ ہو، کوئی بھی ہنگامی صورتِ حال ہو... مُجھے فوراً بتانا، سمجھ رہے ہو نا؟" سلال نے مسکرا کر سر ہلایا۔ گیٹ کے باہر نجف کی گاڑی کھڑی تھی، جس کے اندر وہ موجود تھی۔ نجف بحیثیتِ سی ایم او اس مشن پر خود روانہ نہیں ہو رہی تھی، مگر ہسپتال اور کالج جا کر ابتدائی حالات کا جائزہ لینا اس کی ذمہ داری کا حصہ تھا، اس لیے اس کا وہاں ہونا ضروری تھا۔ سلال نے مسکرا کر اپنے تمام گھر والوں کو دیکھا، ہاتھ ہلا کر سب کو خدا حافظ کہا، اور فرنٹ ڈور کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ نجف پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکی تھی۔ بارش کی بوندیں اب بھی گاڑی کی ونڈ اسکرین پر ہلکے ہلکے انداز میں گر رہی تھیں۔ نجف نے گیئر ڈالا، اور

گاڑی آہستہ آہستہ گلی سے باہر نکلتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

ثالث کی گاڑی سڑک پر رواں دواں تھی۔گاڑی کے اندر مدہم سی موسیقی بج رہی تھی،مگر فضا میں ایک سنجیدہ سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ثالث ڈرائیونگ کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً برابر والی سیٹ پر بیٹھی عالیہ پر ایک نگاہ ڈال لیتا۔عالیہ اس وقت اپنے خیالات میں گم باہر سڑک کے مناظر دیکھ رہی تھی۔ثالث کی طبیعت میں ایک فطرتی تحفظ کا احساس تھا۔وہ چاہے عمر میں چھوٹا تھا،مگر عالیہ کی ہر بات پر ایک بڑے بھائی کی طرح پرواہ کرتا تھا۔خاص طور پر جب سے،اس خطرناک طبی مشن پر جانے کا فیصلہ ہوا تھا،ثالث کے دل میں ایک بے نام سی تشویش مچل رہی تھی۔اس نے ونڈ اسکرین پر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے ہلکی آواز میں پوچھا۔

"ویسے...تم شیور ہو کہ تم یہ سب ہینڈل کر لوگی؟ وہاں حالات اتنے آسان نہیں ہوں گے۔"عالیہ نے اپنی سوچوں کے حصار سے نکل کر رخ موڑا اور ہلکا سا مسکرا دی۔

"یہ تو ضروری ہے،ثالث...زندگی ہمیشہ ہماری مرضی کے مطابق آرام دہ راستے نہیں دیتی۔"

ثالث نے گاڑی کی رفتار ذرا دھیمی کر دی۔ "اچھا یہ بتاؤ...تمہارا سلال کو لے کر نظریہ کچھ بدلا یا نہیں؟"

عالیہ کے چہرے کے تاثرات ہلکے سے سنجیدہ ہو گئے۔اس نے گہری سانس لی اور اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"کافی حد تک..."وہ کچھ لمحے رکی،پھر مزید صاف گوئی سے بولی،"میں اسے جیسا سمجھتی تھی،وہ ویسا بالکل نہیں ہے۔جتنا میں اسے انا پرست یا الگ تھلگ سمجھتی تھی،وہ حقیقت میں اس سے کہیں زیادہ سمجھدار اور ذمہ دار ہے۔"ثالث کے لبوں پر ایک مطمئن اور ہلکی سی مسکان پھیل گئی۔اس نے اسٹیئرنگ وہیل پر انگلیوں سے ہلکا سا تھپکا۔

"اور میں بھی تو تمہیں کافی عرصے سے یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا...کہ وہ لوگ ویسے نہیں ہیں جیسا ہم انہیں سمجھتے ہیں۔وہ برے نہیں ہیں۔"

عالیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔کالج کا گیٹ اب نظر آ رہا تھا۔کچھ دیر بعد گاڑی پارکنگ میں جا کر رک گئی۔عالیہ نے اپنی سیٹ

بیلٹ کھولی، دروازے کا ہینڈل دبایا اور باہر نکلنے سے پہلے مڑ کر ثالث کو دیکھا۔
"میرے آنے تک...ٹرافی ریڈی رکھنا، ثالث! تمہیں جیتنا ہے۔" ثالث کھل کر ہنس دیا۔
"پہلے تم وہاں سے خیر خیریت سے واپس آؤ، ٹرافی میری ہی ہے۔"

عالیہ ہلکا سا ہاتھ ہلا کر گاڑی سے اتری، اپنا کندھے پر لٹکا بیگ درست کیا اور پر اعتماد قدموں کے ساتھ اپنی ٹیم کی طرف بڑھ گئی، جبکہ ثالث کی دعاؤں سے بھری نظریں کافی دیر تک اسے جاتی ہوئی دیکھتی رہیں۔

☆.....☆.....☆

وادی لیڈی کی طرف روانہ ہونے والی ٹیم کو ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ سب ایڈیٹوریم میں موجود تھے۔ امجد بزدار اندر داخل ہوئے۔ سیاہ پتلون، سفید شرٹ اور گہرے رنگ کے کوٹ میں ملبوس ان کی شخصیت میں ایک ایسا ٹھہراؤ تھا جو اپنے ساتھ موجود لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بلند آواز کا محتاج نہیں تھا۔ ان کے پیچھے بزدار میڈیکل کالج کے دو سینئر پروفیسرز اور ہسپتال کے انتظامی سربراہ بھی موجود تھے۔ ان کے اسٹیج کی طرف بڑھتے ہی گفتگو کی آوازیں یکے بعد دیگرے خاموش ہوتی چلی گئیں۔ امجد نے اسٹیج پر پہنچ کر ایک نظر پورے ہال پر ڈالی۔ سفید کوٹوں سے بھرا ہوا وہ آڈیٹوریم انکی نگاہوں کو ٹھنڈک پہنچا گیا۔ انہوں نے مائیک اپنے سامنے درست کیا۔

"السلام علیکم!"

ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔ امجد بزدار نے سر ہلایا اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولنا شروع کیا۔
"میں جانتا ہوں کہ آپ سب یہاں کیوں جمع ہیں۔ آپ میں سے کچھ تجربہ کار ڈاکٹرز ہیں، کچھ ریسرچرز ہیں، کچھ نرسنگ اور لیبارٹری اسٹاف سے تعلق رکھتے ہیں، اور کچھ ایسے طلبہ ہیں جو ابھی اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے آغاز پر کھڑے ہیں۔ لیکن آج آپ سب کے درمیان ایک بات مشترک ہے۔"
انہوں نے اپنی نگاہیں حاضرین پر مرکوز رکھیں۔ "آپ سب نے سفید کوٹ پہن رکھا ہے۔"

ہال میں خاموشی چھا گئی۔انہوں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔

"لیڈی ویلی میں اس وقت ایسے لوگ ہماری مدد کے منتظر ہیں جنہیں شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔وہاں وسائل محدود ہیں،راستے دشوار ہیں اور بیماری کے بارے میں معلومات ابھی نا کافی ہیں۔ہم وہاں تمام سوالوں کے جواب لے کر نہیں جا رہے۔ہم وہاں جواب تلاش کرنے جا رہے ہیں۔"

ان کے لہجے میں اب پہلے سے زیادہ سنجیدگی تھی۔

"ہوسکتا ہے وہاں آپ کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے جن کے لیے آپ نے خود کو تیار نہ سمجھا ہو۔ہوسکتا ہے آپ کو اپنی تھکن بھول کر کام کرنا پڑے۔اور ہوسکتا ہے کہ آپ کی ایک چھوٹی سی غلطی کسی دوسرے انسان کے لیے بہت بڑی مشکل بن جائے۔"

ان کی نگاہ اس قطار کی طرف اٹھی جہاں آخری سال کے رضا کار طلبہ بیٹھے تھے۔

"آپ میں سے جو لوگ پہلی بار کسی ایسے مشن پر جا رہے ہیں،وہ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ آپ کو ہر سوال کا جواب معلوم ہونا ضروری نہیں۔لیکن جو معلوم نہیں،اسے تسلیم کرنا اور مدد طلب کرنا ضروری ہے۔"

چند ڈاکٹرز نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"ہال میں کئی چہرے ان کی طرف اٹھے۔

"جب آپ سے پوچھا جائے گا کہ آپ نے یہ سفید کوٹ کیوں پہنا تھا،تو آپ کیا جواب دیں گے؟"

چند لمحوں تک کسی نے کچھ نہیں کہا۔پھر پچھلی نشستوں سے ایک آواز ابھری۔

"انسانیت کی خدمت کے لیے،سر!"

امجد بزدار نے اس سمت دیکھا۔"اور جب راستے دشوار ہوں؟"

"تب بھی،سر!"اس بار کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ان کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔

"اور جب حالات ہمارے حوصلے کا امتحان لیں؟"

"تب بھی،سر!"

"تو پھر آج کی اس روانگی کو ہم کسی عہدے،کسی ادارے یا کسی نام کے نام نہیں کرتے۔ہم اسے اس سفید کوٹ کے نام کرتے ہیں جس کی اصل پہچان انسانیت کی خدمت ہے۔"انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ قدرے بلند کیا۔

"سفید کوٹ کے نام!"

"سفید کوٹ کے نام!"

پورا آڈیٹوریم یک زبان ہو گیا۔

"سفید کوٹ کے نام!"

"سفید کوٹ کے نام!"

آوازیں بلند ہوتی گئیں۔سفید کوٹ پہنے لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
امجد بزدار چند لمحے ان سب کو دیکھتے رہے۔پھر انہوں نے ہاتھ نیچے کر لیا۔

"اللہ آپ سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔"

ہال میں آمین کی آواز گونجی۔اور یوں،لیڈی ویلی کی طرف روانہ ہونے والی ٹیم اپنے پہلے امتحان کے لیے تیار کھڑی تھی۔ان کے سفید کوٹ ابھی بے داغ تھے۔انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس سفر کے بعد ان میں سے کتنے لوگ اپنے ساتھ صرف مریضوں کی کہانیاں واپس لائیں گے،اور کتنے ایسے سوالات بھی،جن کے جواب خود ان کی اپنی دنیا بدل دینے والے تھے۔

☆.....☆.....☆

مارچ کے ابتدائی دن تھے،مگر وادیِ لیڈی (وادی سپات) کی فضا میں موسمِ بہار کی کوئی دلکشی نہیں بلکہ ایک سرد سناٹا رکا ہوا تھا۔ پہاڑی سلسلوں پر جمی برف سے آتی ہوئی یخ بستہ ہوائیں ہڈیوں میں اتر رہی تھیں،اور آسمان پر منڈلاتے سرمئی بادل اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ کسی بھی وقت بارش یا برف باری ایک اور دور شروع ہو سکتا ہے۔بزدار فارماسیوٹیکل اور میڈیکل رضا کاروں کا قافلہ جب وادی کے مرکزی داخلی راستے پر پہنچا،تو حالات خراب تھا۔پورے علاقے کو مکمل طور پر سیل کر رکھا تھا۔وہ سب ایک لمبا سفر طے کر کے آئے تھے مگر آرام کرنے کا نہ وقت تھا اور نہ حالات۔اسی لیے سب کام پہ لگ چکے تھے۔

"سب سنیں! ٹیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔"ایک سینئر ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ میں ایک وائرلیس سیٹ سنبھالتے ہوئے

بلند آواز میں رضا کاروں سے کہا، "پہلی ٹیم فوراً مرکزی چوک پر ایمرجنسی ٹریف اینڈ کیمپ قائم کرے گی، اور دوسری ٹیم موبائل لیب اور سیمپل کلیکشن کاؤنٹر سنبھالے گی۔ کوئی بھی حفاظتی پروٹوکول کے بغیر باہر نہیں نکلے گا۔"

کچھ ہی دیر میں وادی کے اس ویران میدان میں ہنگامی بنیادوں پر خیمہ بستی آباد ہو چکی تھی۔ بڑے بڑے واٹر پروف میڈیکل ٹینٹس، جن پر ریڈ کراس اور بزدار میڈیکل کے مونوگرام چمک رہے تھے، تیزی سے نصب کیے جا رہے تھے۔ علاقے کی پرانی ڈسپنسری مریضوں کے سیلاب کے سامنے اتنی چھوٹی پڑ چکی تھی کہ باہر کے کشادہ میدان میں ہنگامی بنیادوں پر سفید میڈیکل ٹینٹس کی ایک پوری بستی آباد کر دی گئی تھی۔ ہر طرف سائرن کی مدہم آوازیں، مانیٹرز کی بیپ، اور عملے کی بھاگ دوڑ کا شور تھا۔ موبائل لیب یونٹ اس وادی تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے پوٹھوہار کا استمال کیا گیا تھا اور اب ہنگامی بنیادوں پر ان سے ڈائیگنوسٹک کٹس اور چھوٹی مشینیں باہر نکالی جا رہی تھیں۔ کیمپ کے اندر بنائی گئی لیبارٹری کا اندرونی حصہ بالکل کلین روم میں تبدیل ہو چکا تھا، جہاں ٹیکنیشنز نے پی سی آر اور وائرل ٹیسٹنگ کے لیے اپنے کاؤنٹر سجانا شروع کر دیے تھے۔ وادی کے خوفزدہ اور سہمے ہوئے لوگ دور سے اس تمام تر ہلچل کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر اس نامعلوم وبا کا خوف صاف عیاں تھا۔ عالیہ اپنی ٹیم کے ساتھ مرکزی کیمپ کے باہر کھڑی تھی، جہاں مریضوں کی طویل قطار لگنا شروع ہو چکی تھی۔

"آرام سے... ایک ایک کر کے آگے آئیں، گھبرائیں نہیں۔" عالیہ نے ماسک اور دستانے چڑھا کر ایک بوڑھے مقامی شخص کو سہارا دیتے ہوئے کہا، جو کھانسی کی شدت سے نڈھال تھا۔ رضا کاروں نے فوری طور پر مریضوں کی بنیادی ٹریج شروع کر دی۔ جن میں علامات شدید تھیں، انہیں فوری طور پر آئسولیشن ٹینٹس میں منتقل کیا جا رہا تھا، جبکہ مشتبہ کیسز کے لیے سیمپل کلیکشن کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹرز اور لیب اسٹاف انتہائی نپی تلی مہارت سے کام کر رہے تھے۔ کاٹن سواب (Nasal Swabs) کے ذریعے سیمپل لیے جا رہے تھے، جنہیں فوری طور پر بارکوڈ لگا کر لیب کے اندر روانہ کیا جا رہا تھا تاکہ وائرس کے اسٹرین کی جینیاتی نوعیت کا فوری پتا لگایا جا سکے۔ سلال ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ تک دوڑ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود فائل میں مریضوں کے بڑھتے ہوئے اعداد و شمار درج ہو رہے تھے، جو اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ یہ وبا جتنی جلدی سمجھی جا رہی تھی، اتنی آسان نہیں تھی۔

باہر سرد مارچ کی ہوا سنسناتی ہوئی گزر رہی تھی، اور خیموں کے اندر جلتی ہوئی ہنگامی لائٹوں کی روشنی میں انسانی جانوں کو بچانے

کی فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے اور بزدار کالج کا گراؤنڈ فلڈ لائٹس کی روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ موسمِ بہار کی خنک ہوا کے باوجود گراؤنڈ کا ماحول گرم تھا۔ سقراط کی ٹیم کا مقابلہ اپنے روایتی حریفوں سے تھا۔ اس ٹورنامنٹ میں اب تک سقراط کی ٹیم ایک میچ جیت چکی تھی اور ایک ہار چکی تھی۔ لہذا سیمی فائنل میں جانے کے لیے یہ میچ جیتنا ہر صورت ضروری تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ مخالف ٹیم نے شروع ہی سے شرافت کا دامن چھوڑ کر اوچھے ہتھکنڈے اور بے ایمانی کا سہارا لینا شروع کر دیا تھا۔ ان کی گندی فاؤل گیم کی وجہ سے سقراط کی ٹیم کے دو اہم کھلاڑی زخمی ہو کر سائیڈ لائن پر آ چکے تھے، اور امپائر کی مبینہ جانبداری مخالفین کی پشت پناہی کر رہی تھی۔

کوارٹر کے اختتام پر جب مختصر سا بریک ہوا، تو سقراط کے تمام کھلاڑی ہانپتے ہوئے، پسینے میں شرابور اور غصے سے کانپتے ہوئے ڈگ آؤٹ کی طرف دوڑے ان کے چہروں پر شدید فرسٹریشن عیاں تھی۔ سقراط نے سرد آنکھوں سے ٹیم کے ایک ایک کھلاڑی کا جائزہ لیا۔

"سر... یہ لوگ جان بوجھ کر ہمارے بندے گرا رہے ہیں۔" ٹیم کے ایک زخمی فارورڈ نے ہانپتے ہوئے شکایت کی، "اور ریفری اندھا بنا ہوا ہے، وہ ان کی ہر فاؤل ٹیکنیک کو نظر انداز کر رہا ہے۔"

سقراط نے گہری سانس لی۔ اس نے آگے جھک کر اپنی ٹیم کے دائرے میں موجود کھلاڑیوں کو دیکھا اور دھیمی مگر سرد آواز میں کہا۔

" کھیل کا ایک اصول ہوتا ہے۔ جب ہارنے لگو تو کھیل بگاڑ دو۔ تم لوگ بھی وہی کرو جو وہ کر رہے ہیں۔ ان کے ہتھکنڈے اپناؤ!"

ایک نوجوان کھلاڑی نے گھبرا کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا "لیکن... سر، وہ ریفری..."

"جو میں نے کہا ہے، وہ کرو۔" سقراط نے اسکی بات کاٹ دی۔

"لیکن سر، ریفری پینلٹی دے دے گا۔" دوسرے کھلاڑی نے تذبذب سے کہا۔

"ارے چولہے میں جائے ریفری! پسلیاں توڑ دو سالوں کی۔" سقراط غرایا۔

"او کے کوچ!" سب سے پہلے زاویار نے سر ہلایا۔ کھیل دوبارہ شروع ہوا۔ سقراط کی ٹیم نے جب جوابی وار کیے اور مخالف ٹیم کو ان کی ہی زبان میں جواب دینا شروع کیا، تو گراؤنڈ میں اسٹکس کے ٹکرانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ کھیل اس حد تک جنونی اور بے قابو ہو چکا تھا کہ ریفری کی سیٹیاں مسلسل بجنے کے باوجود کوئی کھلاڑی رکنے کو تیار نہیں تھا۔ جب بات ہاتھ سے نکلنے لگی اور مخالف ٹیم کو صاف شکست کا ڈر ستانے لگا، تو انہوں نے کھیل کو مکمل طور پر بگاڑ دیا۔ دھوکہ دہی اور جان بوجھ کر کیے گئے انتہائی خطرناک فاؤلز کی وجہ سے حالات اتنے بگڑے کہ ریفری کو مجبوراً میچ وہیں بیچ میں روکنا پڑا۔ اس ہنگامے اور افراتفری کے عالم میں، وی آئی پی گیلری کی سیڑھیوں پر اقبال بزدار، غرور سے بھرپور انداز میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک سرد اور حقارت آمیز مسکراہٹ تھی، گویا وہ اس بربادی اور طوفان کا بھرپور لطف اٹھا رہا ہو۔ سقراط کی نظریں اٹھیں، اور سیدھا وی آئی پی گیلری میں کھڑے اقبال بزدار کی آنکھوں سے جا ٹکرائیں۔ وہ ایک لمحہ... جیسے پوری دنیا کی رفتار کو جما دینے کے لیے کافی تھا۔ اقبال بزدار کی وہ پرانی اور مکروہ مسکراہٹ... اور اس کے چہرے کے نقوش دیکھ کر سقراط کے سامنے دس سال پہلے کا سارا منظر ایک ہولناک فلم کی طرح گھوم گیا۔ وہ خون آلود رات، وہ تباہ ہونے والی زندگیاں، وہ چیخیں، اور اس کے اپنے اندر دبی ہوئی سالوں پرانی آگ... سب کچھ ایک لمحے میں اس کی آنکھوں کے سامنے ابل پڑا۔ سقراط کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ اس کے کانوں میں سناٹا چھا گیا، اور اس کے ہاتھ میں پکڑی ہاکی کی اسٹک کی گرفت اتنی سخت ہو گئی کہ اس کی انگلیاں سفید پڑ گئیں۔ اس نے آنکھوں میں بہت کچھ تھا۔ اقبال پہلے تو اسی مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ سقراط کو دیکھتا رہا لیکن جب سقراط کے چہرے سے وہ عجیب سا تاثر نہیں ہٹا تو اسکی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ وہ گراؤنڈ پہ ایک نظر ڈال کر وہاں سے ہٹ گیا۔ جبکہ سقراط نے ایک گہری سانس لی۔ اس وقت اسکا سکون چیخ چیخ کر ایک ہی بات کہتا تھا۔

"نہ کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے! (نہ جیتیں گے اور نہ جیتنے دیں گے۔)"

☆.....☆.....☆

دیوار کے سہارے وہ کارک بورڈ چمک رہا تھا جس کے مرکز میں اب سلویٰ کی تصویر پن کی گئی تھی، اور اس کے اردگرد حق کی پرانی تصویر اور کچھ بے نام سوالات کے نوٹس لگے تھے۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر اس نے اپنا فون اٹھایا اور اپنے سینئر، پچاس سالہ تجربہ کار ڈیفنس لائیر زلفی صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ زلفی صاحب نہ صرف اس کے کام کے سرپرست تھے بلکہ قانون کے پیچیدہ راستوں پر اس کے سب سے بڑے مداح اور خیر خواہ بھی تھے۔ دوسری بیل پر ہی فون اٹھ گیا اور زلفی صاحب کی مانوس آواز ابھری۔ رسمی سلام دعا کے بعد زلفی صاحب نے قدرے سن

" کہو نیمل! اتنے دنوں بعد ہماری یاد کیسے آ گئی؟ یا عدالت کے کسی چکر میں پھنس گئی ہو؟" نیمل نے گہری سانس لی، اپنے لہجے کو سنبھالا اور سیدھے مدعے پر آئی۔

"زلفی صاحب! مُجھے سلویٰ خان کیس سے متعلق کچھ اپڈیٹس چاہئیں تھیں۔ مسٹر خان کا کیا بنا؟ کیا وہ واقعی مقدمہ آگے بڑھا رہے ہیں؟"

فون کی دوسری طرف ہلکا سا قہقہہ گونجا، جس کے بعد زلفی صاحب کے لہجے میں ایک پیشہ ورانہ سکون گھل گیا۔

" تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، نیمل۔ مسٹر خان نے خاموشی سے کیس واپس لے لیا ہے۔ لگتا ہے انہیں کسی بہت بڑی رسوائی اور سکینڈل کا ڈر تھا، جس کی وجہ سے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔"

یہ خبر سن کر نیمل کے سینے پر رکھا ایک بھاری پتھر ہٹ گیا، مگر اس کے فوراً بعد اس کا تجسس اور بڑھ گیا۔ اس نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور تیزی سے اگلا سوال داغا۔

" کیس واپس لے لیا...؟ لیکن زلفی صاحب، بات صرف مسٹر خان کے پیچھے ہٹنے کی نہیں ہے۔ آپ کو نہیں لگتا کہ سلویٰ خان کی موت کے پیچھے کچھ ایسا ہے جو سب سے چھپایا جا رہا ہے؟ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اسے محض ایک عام حادثہ یا صدمہ قرار دے کر فائل بند کر دی گئی، لیکن کیا وہ واقعی ایک طبعی موت تھی؟ کیا واقعی سلویٰ خان کو کوئی اعصابی عارضہ لاحق تھا؟"

وہ ایک کے بعد ایک چھوٹے چھوٹے، باریک اور قانونی نکتوں پر سوالات کرتی چلی گئی۔ کیس کی ٹائم لائن، فرانزک رپورٹس کی وہ درزیں جنہیں تفتیش کاروں نے نظر انداز کر دیا تھا، اور موت کے وقت کے وہ مبہم حالات۔ زلفی صاحب دوسری طرف خاموشی سے اس کی ایک ایک بات سنتے رہے۔ جو کچھ انہیں معلوم تھا وہ نیمل کے گوش گزار کیا۔ جب نیمل کا سوالوں کا تانتا کچھ تھما، تو فون پر ایک نرم سی مسکراہٹ کی گونج سنائی دی۔

"تمہیں معلوم ہے، نیمل... جب تم اس طرح ایک ایک نکتے کی کھدائی کرتی ہو، تو تم وکیل کم اور ایک کھوجی زیادہ لگتی ہو۔ اور سچ کہوں تو... تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔"

نیمل کا دل ایک لمحے کے لیے ٹھہر سا گیا۔ "کس کے بغیر؟"

"تم اپنے پیشے سے جڑ چکی ہو اور تم جانتی ہو میں کس کی بات کر رہا ہوں۔" زلفی صاحب نے ذرا سنجیدہ اور نرم لہجے میں کہا، "تم ایک اچھی وکیل ہو، نیمل... اپنے اس ٹیلنٹ کو، اس جبلت کو یوں ذاتی رنجشوں اور ہچکچاہٹ کی نذر کر کے ضائع مت کرو۔ خود کو یوں ادھورا مت چھوڑو۔"

نیمل کچھ دیر کے لیے بالکل ساکت رہ گئی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"اپنا خیال رکھنا، نیمل..." زلفی صاحب نے ہلکا سا توقف کرنے کے بعد کہا، "اور ہاں، تمہارے لیے ہمیشہ میرے دروازے کھلے ہیں۔ خدا حافظ!" فون کی لائن کٹ چکی تھی، مگر زلفی صاحب کی کہی ہوئی باتیں کمرے کی خاموشی میں دیر تک گونجتی رہیں۔ نیمل کا ہاتھ فون سمیت میز پر گر گیا۔ وہ کافی دیر تک خالی نظروں سے اس کارک بورڈ کو گھورتی رہی۔ دنیا کی نظروں میں حق گنہگار تھا یا بے گناہ... اس سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مگر اس اندھیرے کے سمندر میں سچ کیا ہے، یہ جاننا... صرف اور صرف نیمل کے لیے اس وقت زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

لیڈی ویلی کی فضا اس وقت کسی کابوس کا منظر پیش کر رہی تھی۔ مریضوں میں جو علامات ظاہر ہو رہی تھیں، وہ انتہائی ہولناک اور جان لیوا تھیں۔ بیماری کے پہلے مرحلے میں مریض شدید سر درد، تیز بخار اور جسم کے پٹھوں میں ناقابلِ برداشت کھچاؤ کا شکار ہو جاتا تھا۔ دوسرے مرحلے تک پہنچتے ہی خون کی نالیاں کمزور پڑ جاتی تھیں اور جلد پر نیلے دھبے ابھرنے لگتے تھے۔ اور جب بیماری اپنے آخری اور خطرناک ترین اسٹیج پر آتی تھی، تو مریض کو خون کی قے شروع ہو جاتی تھی اور چند ہی گھنٹوں میں اس کا اندرونی نظامِ تنفس بیٹھ جاتا تھا۔ مین آئسولیشن ٹینٹ کے اندر کا منظر تو اور بھی دل دہلا دینے والا تھا۔ سلال، عالیہ اور دیگر میڈیکل رضا کار N95 ماسک، فیس شیلڈز، ڈبل دستانے اور مکمل بائیو ہیزرڈ سوٹس میں ملبوس تھے تاکہ اس جان لیوا وائرس کے پھیلاؤ کو روک سکیں۔ عین اسی وقت، ٹینٹ کے دائیں اور بائیں کونے میں رکھے بیڈز پر موجود دو بزرگ مریض ایک ساتھ ہچکیاں لیں، ان کے منہ سے خون کا فوارہ نکلا، اور وہ ڈاکٹرز کی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ گئے۔ مشینوں پر چلتی سکرینیں سیدھی لکیر میں تبدیل ہو گئیں۔ ٹینٹ کے اندر موجود تمام رضا کاروں کے حواس سُن ہو گئے۔ موت کا یہ سلسلہ دیکھ کر عالیہ کے ہاتھ کانپ اٹھے، اور سلال کو لگا کہ اس کے سینے پر کسی نے کوئی بھاری پتھر رکھ دیا ہو۔ اس خوفناک ماحول سے ذرا ہٹ کر، ٹیسٹنگ لیب کے اندر کا منظر بالکل مختلف تناؤ میں جکڑا ہوا تھا۔ لیب کے اندر پی سی آر مشینیں مسلسل گونج رہی تھیں۔ ٹیکنیشنز خون کے نمونوں کی جینیاتی تسلسل کی جانچ کر رہے تھے۔ اسی لیب کے ایک الگ کیبن میں، جو مریض اس بیماری کے دوسرے اسٹیج پر داخل ہو چکا تھا۔ جس کے جسم پر وائرس کے اثرات تیزی سے پھیل رہے تھے۔ اس پر بزدار فارماسیوٹیکلز کی تیار کردہ نئی آزمائشی ویکسین کی پہلی خوراک رگوں کے ذریعے اتاری جا رہی تھی۔ ہر ایک کی نگاہیں مانیٹر پر جمی تھیں، جہاں وائرس اور اس ویکسین کے درمیان زندگی اور موت کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔

کچھ ہی فاصلے پر، ٹینٹ کے اس دباؤ اور مریضوں کی ہولناک سسکیوں کو مزید برداشت نہ کرتے ہوئے عالیہ سے اور نہ رہا گیا۔ اس نے تیزی سے اپنے دستانے و فیس شیلڈ اتاری، اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ ٹینٹ کا پردہ ہٹا کر باہر کھلی ہوا میں نکل گئی۔

باہر مارچ کی سخت، یخ بستہ اور ہڈیوں کو جما دینے والی سردی موجود تھی، جو پہاڑوں سے تیز ہوا کے جھونکوں کی طرح آ رہی تھی مگر اس کے باوجود عالیہ کے ماتھے پر سرد پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ اس نے اپنے گلے کے گرد لپٹا ہوا اون کا سکارف ذرا ڈھیلا کیا اور پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے اردگرد سینکڑوں کی تعداد میں لوگ بیمار پڑے تھے کوئی کراہ رہا تھا، کوئی اپنے پیاروں کے لیے رو رہا تھا، اور باہر سٹریچرز پر نئے مریض لائے جا رہے تھے۔ اس علاقے میں پھیلی ہوئی اس وبا اور سینکڑوں جانوں کو سنبھالنا بہت مشکل لگ رہا تھا، مگر اس کے باوجود پوری

میڈیکل ٹیم ڈٹی ہوئی تھی۔کسی کو ہار ماننے کی اجازت نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

شبگیر ہاؤس کے اوپری پورشن کے لاؤنج میں شام کے سائے پھیل رہے تھے اور باہر سے آتی ہوئی مدہم روشنی میں صرف لیپ ٹاپ کی اسکرین کا نیلا اجالا چمک رہا تھا۔سقراط صوفے پر نیم دراز بیٹھا تھا،اور اسکرین پر پچھلے ہاکی میچز کی ویڈیوز چل رہی تھیں۔وہ میچز جواب کھیلے جا چکے تھے،جن کی غلطیوں اور کمزوریوں کا وہ باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔اچانک اس کے سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کی اسکرین روشن ہوئی اور ایک انجان نمبر سے کال سکرین پر جھلملانے لگی۔سقراط نے ویڈیو پاز کی، ایک نظر نمبر پر ڈالی،اور فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو؟"

"میرے پاس تمہارے لیے ایک آفر ہے۔"دوسری طرف سے ایک بھاری اور سنجیدہ آواز ابھری۔سقراط کے لبوں کے کنارے دھیمی سی مسکراہٹ ابھری۔وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

" کیسی آفر؟"اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"پچھلے میچ اور اس میں ہونے والے دنگے کی وجہ سے تمہاری ٹیم ٹورنامنٹ سے باہر ہوتے ہوتے بچی ہے۔"

"اچھا تو؟"سقراط نے ٹھوڑی کھجائی۔

"تمہاری ٹیم اگلا نہیں تو اس سے اگلا میچ میں ہار جائے گی۔یہ ٹرافی تم نہیں جیت سکتے تو میری آفر یہ ہے کہ تم اگلا میچ ہار جاؤ۔" اسی سنجیدگی سے کہا گیا۔

"اور وہ کیوں؟"سقراط نے محظوظ ہوتے پوچھا۔

" کیونکہ میں تمہیں اس کی بھاری قیمت ادا کروں گا۔"

اسی لمحے سیڑھیوں کے زینو پر ہلکی سی آہٹ ہوئی،اور نجف ہاتھ میں کچھ فائلیں سنبھالے لاؤنج میں داخل ہوئی۔وہ ابھی دو قدم

ہی چلی تھی کہ فون پر ہونے والی اس گفتگو کا فقرہ اس کے کانوں میں پڑا، اور اس کے قدم وہیں جم گئے۔ سقراط نجف کو دیکھ چکا تھا مگر اس کے چہرے پر کوئی جھجھک نہیں آئی۔ اس نے جان بوجھ کر آواز تھوڑی بلند رکھی اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پوچھا۔

"کتنی قیمت؟"

"بولو... تمہیں کتنی چاہیے؟"

"تمہاری ٹیم کے لیے یہ میچ جیتنا جتنا اہم ہے، اس سے تین گناہ زیادہ قیمت لوں گا۔"

نجف کے کان کھڑے ہو چکے تھے اور یہ سن کر اسکے چہرے پر حیرت در آئی۔ وہ فوراً صوفے کے قریب آئی اور بے مقصد فائلیں الٹنے پلٹنے لگی، تاکہ اس گفتگو کا ایک ایک لفظ اس کے کانوں تک واضح پہنچ سکے۔ دوسری طرف سے حامی بھرنے والی آواز آئی۔

"ٹھیک ہے... پچاس لاکھ! بولو، کیا گارنٹی ہے کہ تمہاری ٹیم ہارے گی؟"

"مُجھے پچاس لاکھ آج شام تک کیش چاہیے، اور میری ٹیم اگلا میچ ہار جائے گی۔"

سقراط نے نظریں نجف کے چہرے پر جمائے کہا۔ نجف کے ہونٹ غصے اور صدمے سے بری طرح بھنچ گئے۔ اس کا دل چاہا کہ سقراط کا فون چھین کر زمین پر دے مارے۔ دوسری طرف سے ایک مخصوص جگہ کا نام اور وقت بتایا گیا، اور سقراط نے سرد لہجے میں 'ٹھیک ہے' کہہ کر کال کاٹ دی۔ اور نجف کا ضبط جواب دے گیا۔

"یہ... یہ تم کیا کر رہے ہو؟" اس کی آواز غصے سے پھٹ رہی تھی۔ سقراط نے اپنے لیپ ٹاپ کو بند کیا، اور پرسکون انداز میں اسے دیکھا۔

"کیا کر رہا ہوں؟"

"تم کرپشن کر رہے ہو؟" نجف کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چکا تھا، "تم اپنے ہی کھلاڑیوں کی محنت، ان کے خواب اور اس کالج کی عزت کو پیسوں کے عوض بیچ رہے ہو؟ مُجھے یقین نہیں آتا کہ تم کم ظرف کی نہیں... تم کرپٹ بھی ہو۔"

سقراط نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی، اپنے دونوں پاؤں صوفے سے نیچے زمین پر اتارے، اور بے نیازی سے بولا۔

"اگر میں ریپسٹ ہوسکتا ہوں...تو کرپٹ کیوں نہیں؟"

نجف کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ایسا تاثر ابھرا جیسے کسی نے اسے اچانک تھپڑ مار دیا ہو۔ وہ اس بے باک اعتراف پر چند لمحوں کے لیے گنگ رہ گئی، مگر اس کا اندرونی غصہ اور بھڑک اٹھا۔

''تمہیں اپنے جرم پر فخر ہے؟''

''میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ مُجھے فخر ہے۔''

''مگر تمہیں شرمندگی بھی نہیں ہے۔''

''تم میری شرمندگی کی نگران کب سے بن گئیں؟''

''جب تم نے اپنی گندگی میں دوسرے لوگوں کو گھسیٹنا شروع کیا۔'' نجف نے فوراً جواب دیا۔ ''تمہارے اپنے معاملات ہیں، تمہاری اپنی زندگی ہے۔ تم جو چاہو اپنے ساتھ کرو۔ مگر ان لڑکوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

سقراط نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نجف اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود کاغذات کب کے مڑ چکے تھے، مگر اسے ان کا احساس نہیں تھا۔

''وہ لڑکے تمہیں اپنا کوچ سمجھتے ہیں۔ وہ تمہاری بات سنتے ہیں، تمہاری ہدایات پر عمل کرتے ہیں، تمہارے لیے میدان میں اترتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ اگر وہ محنت کریں گے تو انہیں آگے بڑھنے کا موقع ملے گا۔ اور تم؟ تم نے ان کی محنت کی قیمت پچاس لاکھ لگا دی؟"

''تمہیں رقم کم لگی؟'' سقراط نے سنجیدگی سے پوچھا۔

نجف کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''کیا؟"

''میں پوچھ رہا ہوں، پچاس لاکھ کم لگے؟ تم چاہتی ہو کہ میں ان کی محنت کی قیمت زیادہ لگاتا؟''

''تم سے بات کرنا ہی بے کار ہے۔'' وہ صبر کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔

''تو بات مت کرو۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔ نجف بے اختیار تلخی سے ہنسی۔

''واہ! کیا خوب صورت حل ہے۔ جرم بھی کرو اور لوگوں کو خاموش رہنے کا مشورہ بھی دو۔''

''میں نے تمہیں خاموش رہنے کا مشورہ نہیں دیا۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ اگر میری بات پسند نہیں تو تمہیں مجھ سے بات

کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''یہ تمہاری بے ایمانی کا جواز نہیں ہے۔''

''میں نے اسے جواز کب کہا؟''

''تو پھر تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟'' وہ یہ بات قبول کرنا نہیں چاہتی تھی کہ سقراط کرپٹ تھا۔

''کیونکہ میں کر سکتا ہوں۔'' وہ اسی انداز میں بولا۔ نجف نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کے سامنے بیٹھے شخص کو پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

''یہ تمہارا جواب ہے؟''

''تمہیں کون سا جواب چاہیے؟ یہ کہ میں مجبور ہوں؟ کسی نے مُجھے دھمکایا ہے؟ میری جیب خالی ہے؟ یا یہ کہ میں نے زندگی میں اتنی ناانصافی دیکھی ہے کہ اب مُجھے کسی اور کے ساتھ ناانصافی کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا؟'' وہ ذرا سا آگے جھکا۔

''دیکھو نجف! میں تمہیں کوئی خوب صورت کہانی نہیں سناؤں گا۔ میں نے پیسوں کے بدلے میچ ہارنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ غلط ہے۔ تم جانتی ہو کہ یہ غلط ہے۔ اب تم چاہو تو مُجھے دس منٹ کا لیکچر دے دو، اس سے حقیقت نہیں بدلے گی۔''

نجف اس بات پر حیران تھی کہ سقراط اپنی غلطی چھپانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔

''کم از کم تم یہ تو مانتے ہو کہ یہ غلط ہے۔''

''میں نے کب انکار کیا؟''

''تو پھر اس سے باز آ جاؤ۔'' وہ گردن اٹھا کر بولی۔ ہاں یوں جیسے وہ اسکی بات مان ہی لے گا۔ سقراط نے اسے دیکھا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ غلط کام کو غلط مان لینے سے اسے چھوڑنا بھی ضروری ہو جاتا ہے؟''

''ہاں! یہی تو فرق ہے ایک انسان اور ایک ایسے شخص میں جسے اپنے سوا کسی کی پروا نہیں ہوتی۔''

اس بار سقراط کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

''اپنے معیار اپنے پاس رکھو۔ ہر شخص تمہاری طرح اپنی زندگی کے فیصلے تمہارے بنائے ہوئے اصولوں سے نہیں کرتا۔''

''تو تم ایک کرپٹ کوچ ہو۔'' نجف نے اسے دیکھتے ہوئے تنفر سے کہا۔

''بس یا اور کچھ؟''

''نہیں۔تم ان لڑکوں کے اعتماد کے مجرم بھی ہو۔'' سقراط چند لمحے خاموش رہا۔پھر اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔

''تمہاری تقریر ختم ہوگئی ہو تو مُجھے نیچے جانا ہے۔''

نجف کا ضبط پھر جواب دینے لگا۔

''تم ہمیشہ یہی کرتے ہو۔جب کوئی تمہیں تمہارا اصل چہرہ دکھاتا ہے۔تم یا تو مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہو یا وہاں سے اٹھ کر چلے جاتے ہو۔کبھی کسی بات کا سامنا بھی کر لیا کرو۔''

سقراط صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔''میں نے تمہاری ہر بات سنی ہے۔اب تم یہ توقع مت رکھو کہ میں تمہاری بات مان بھی لوں گا۔''

''میں تم سے اپنی بات منوانے نہیں آئی۔''

''تو پھر؟'' سقراط نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

''میں صرف یہ سمجھنا چاہتی تھی کہ تمہارے اندر کوئی اچھائی باقی بھی ہے یا نہیں۔''

سقراط نے اس کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں وہی اطمینان تھا جس نے نجف کو کئی مرتبہ مشتعل کیا تھا۔''اب سمجھ آ گئی؟''

نجف نے جواب دینے کے بجائے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا،مگر پہلے زینے پر پہنچ کر رک گیا۔

''اور ہاں...'' اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔''اگلی بار کسی کی فون کال سن کر اس کے کردار کا فیصلہ کرنے سے پہلے یہ بھی سوچ لیا کرنا کہ تمہیں اس کے بارے میں پہلے سے کیا معلوم ہے۔''

نجف کی آنکھوں میں ناگواری ابھر آئی۔

''مُجھے تمہارے کردار کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے،کسی فون کال کی ضرورت نہیں ہے،سقراط۔تم نے اپنا تعارف خود کروا دیا ہے۔''

سقراط کے ہونٹوں پر ایک مختصر سی مسکراہٹ آئی۔''خوشی ہوئی کہ میں تمہارے کسی کام تو آیا۔'' وہ نیچے اتر گیا۔

نجف چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔پھر اس نے بند لیپ ٹاپ،میز پر پڑے فون اور اس صوفے کو دیکھا جہاں بیٹھ کر سقراط نے ایک پورے میچ کا نتیجہ بیچ دیا تھا۔اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔

''کرپٹ کوچ؟'' پھر اسے خیال آیا کہ یہ لقب بھی شاید اس شخص کے لیے بہت معمولی تھا۔ اس نے سیڑھیوں کی طرف دیکھ کر قدرے بلند آواز میں کہا۔

"اگلی بار جب کسی کو کھیل کے اصول سمجھانے لگو تو پہلے خود بے ایمانی کے اصول پڑھ لینا۔''

" کچھ کہا تم نے؟'' اللہ وہ ابھی سیڑھیوں پر ہی تھا۔ نجف نے دانت بھینچ لیے۔

''نہیں۔ تمہارے لیے دعا کر رہی تھی۔ دعائے مغفرت!''

''ذرا بلند آواز میں کرنا۔ تمہاری دعاؤں کا اثر اب تک تو نظر نہیں آیا۔''

نجف نے آنکھیں بند کر کے ایک گہرا سانس لیا۔ اس آدمی سے بحث کرنا واقعی وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ اور سب سے زیادہ غصہ اسے اس بات پر آ رہا تھا کہ سقراط کو یہ بات بخوبی معلوم تھی۔

☆.....☆.....☆

جنرل اسٹور کی روشن اور شیلفوں سے بھری گیلری میں اس وقت ہلکی سی چہل پہل تھی۔ نیمل اور تارہ گروسری کرنے کے لیے وہاں آئے تھے۔ تارہ ایک ہاتھ سے بڑی سی شاپنگ ٹرالی کو آگے دھکیل رہی تھی، جبکہ شیلفوں سے اشیاء اٹھا کر ڈالنے کی ذمہ داری نیمل کی تھی۔

"تارہ، ذرا وہ دال والا پیکٹ اٹھانا... اور ہاں، وہ ڈبہ بھی رکھ لینا۔" نیمل نے شیلف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تارہ نے ٹرالی کو ایک طرف روکا اور مطلوبہ اشیاء اٹھانے لگی۔ اتنے میں نیمل کے بیگ میں رکھے فون کی اسکرین روشن ہوئی۔ نیمل نے فون نکال کر اسکرین پر نمبر دیکھا تو اس کے لب خود بخود بھنچ گئے۔ اب اسے اس نمبر کی اچھے سے پہچان ہو چکی تھی۔ یہ گوہر علی عرف گوگا کا فون تھا، جو چند دنوں کے وقفے سے اسے مسلسل فون کر رہا تھا، اور حال ہی میں اس نے اپنی کیس فائل بھی بھیج دی تھی۔ نیمل نے ٹرالی سنبھالتی تارہ کی طرف دیکھا۔

"تارہ! تم ذرا یہیں رکو، میں بس وہ کاؤنٹر کی طرف سے کچھ چیزیں دیکھ کر آتی ہوں... اور ہاں، یہ لسٹ کے مطابق باقی سامان بھی اٹھا لو۔" تارہ نے سر ہلا دیا، اور نیمل فون کان سے لگاتی ہوئی اسٹور کے ایک نسبتاً خالی کونے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے

کال رسیو کرتے ہی سرد اور نپی تلی آواز میں کہا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے گوگا کی بھاری اور دھیمی آواز ابھری

"سلام وکیل صاحبہ! پہچانا؟ گوگا بات کر رہا ہوں۔ فائل تو مل گئی ہوگی میری... دیکھ لی آپ نے؟"

نیمل نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔ "میں نے تمہاری فائل نہیں دیکھی، اور نہ ہی میرے پاس اس کام کے لیے وقت ہے۔"

یہ سنتے گوگا کی آواز میں ہلکی سی بے چینی گھل گئی۔

"وکیل صاحبہ، ایسے نہ کریں ن بڑی مہربانی ہوگی، بس ایک بار کھول کر دیکھ لیں۔ میرے پاس اب وقت کم ہے... پولیس کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہوں، اور مُجھے روز روز باہر سے فون ملنا آسان نہیں ہوتا۔"

"اور میں کیوں کروں تمہاری مدد، بھلا؟ میرا تم سے ایسا کون سا تعلق ہے کہ میں ایک مجرم کے لیے اپنی راتیں خراب کروں؟"

نیمل نے شلف پر رکھے کسٹرڈ کے ڈبے کو بے دھیانی سے چھوتے ہوئے طنزاً کہا۔ گوگا نے دوسری طرف سے قہقہہ لگایا، جس میں چالاکی صاف جھلک رہی تھی۔

"آپ میری مدد کریں، بدلے میں گوگا آپ کی مدد کرے گا۔ جہاں ہاتھ ڈالیں گے، کام ہو جائے گا۔"

نیمل نے کچھ لمحے سوچا، اس کے دماغ میں سلویٰ اور حق کی وہ الجھی ہوئی دنیا گردش کر رہی تھی۔ اسے اس گندے دلدل سے نکلنے کے لیے بعض اوقات ایسے ہی کرداروں کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس کے لہجے کا زاویہ بدلا، اور وہ زیادہ پراعتماد انداز میں بولی۔

"اچھا... تو تم میری مدد کرو گے؟ پہلے تم خود کو ثابت کرو کہ تم واقعی کسی کام کے آدمی بھی ہو یا بس ہوا میں تیر چلا رہے ہو۔ پھر میں سوچوں گی کہ تمہارا کیس لوں یا نہیں۔"

"حکم کریں وکیل صاحبہ! بس ایک اشارہ کریں... کوئی بندہ پھڑکانا ہے؟ بتائیں کس کا کام تمام کرنا ہے؟"

نیمل نے غصے سے اپنی آنکھیں سکیڑیں۔ "ہر وقت قتل و غارت، اور پھر منہ اٹھا کر کہتے ہو کہ میں بے گناہ ہوں؟ تمہارا کوئی دین ایمان نہیں ہے؟"

گوگا دوسری طرف ہنس پڑا۔ "ارے نہیں جی! وہ تو آپ کے لیے ایک آفر تھی، مذاق سمجھیں۔ آپ بتائیں، آپ کو کیا چاہیے؟"

نیمل نے گہری سانس لی، ادھر ادھر دیکھا اور پھر دھیمی مگر پکی آواز میں بولی۔

"ٹھیک ہے... میں تمہارا کیس لڑنے پر غور کر سکتی ہوں، مگر اس سے پہلے مُجھے ایک دوسرا کیس سلجھانا ہے، جس کے لیے مُجھے کچھ انتہائی خفیہ، قانونی اور غیر قانونی... ہر قسم کے ثبوت چاہئیں۔ کیا تم لا سکتے ہو؟"

گوگا چند لمحے خاموش رہا، پھر اس کی سمجھ میں بات آ گئی۔

"سمجھ گیا جی! اب فون پہ لمبی چوڑی کہانیاں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا ایک آدمی کل آپ سے ملے گا، آپ اسے بتا دیجیے گا کہ آپ کو کیا کیا مٹیریل چاہیے... بس ذرا جلدی کیجیے گا، میرے دن گنے جا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" نیمل نے نپی تلی آواز میں کہا، اور مزید کوئی بات سنے بغیر فون کی لائن کاٹ دی۔ اس نے فون واپس اپنے بیگ میں ڈالا، ایک گہری سانس لے کر اپنے اعصاب کو پرسکون کیا، اور واپس تارہ کی طرف بڑھ گئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اب ایک ایسے خطرناک کھیل میں قدم رکھنے جا رہی تھی جہاں سے واپسی کا راستہ شاید کبھی نہیں ملے گا۔ جب انہوں نے ساری گروسری کر لی اور واپسی کے لیے باہر نکلے تو تارہ نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

"گوگا نے فون کیا تھا؟"

نیمل نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تمہیں کیسے پتا؟"

"نوفہ نے بتایا تھا۔" تارہ نے بتیسی دکھائی تو نیمل نے تاسف سے سر ہلایا۔ ایک تو یہ جڑواں بہنیں ایک دوسرے سے کوئی بات چھپائے بنا رہ ہی نہیں سکتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

دن بھر کی آمد و رفت اور لوگوں کے شور سے گونجنے والی جگہ اب قدرے پُرسکون ہو چکی تھی۔ بیماری کے ممکنہ اسباب جاننے کے لیے تحقیقات جاری تھیں۔ ابھی کسی کے پاس حتمی جواب نہیں تھا، مگر کم از کم اب ان کے پاس اتنا وقت ضرور تھا کہ وہ اگلے دن کی تیاری سے پہلے چند لمحے سانس لے سکیں۔ عارضی طبی مرکز سے کچھ فاصلے پر رضا کاروں کے لیے لگائے گئے کیمپوں کے درمیان ایک الاؤ روشن تھا۔

لکڑیوں کے جلنے سے وقفے وقفے سے چٹخنے کی آوازیں ابھرتیں اور پھر سرد ہوا میں تحلیل ہو جاتیں۔ آگ کے گرد رکھے لکڑی کے تختوں پر سلال، عالیہ، زنیرہ اور دوسرے رضا کار بیٹھے تھے۔ سلال کا دوست ماحد اس مشن پر نہیں آ سکا تھا۔ ان سب نے موٹے کوٹ پہن رکھے تھے۔ بعض نے گردنوں کے گرد مفلر لپیٹے ہوئے تھے، جبکہ کچھ اپنے ہاتھ آگ کی طرف پھیلائے حرارت سمیٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہوا خاصی سرد تھی۔ کبھی کوئی تیز جھونکا آتا تو آگ کے شعلے ایک طرف جھک جاتے اور ان کے چہروں پر پڑتی روشنی لرزنے لگتی۔ زنیرہ نے اپنے کوٹ کے کالر اوپر کیے اور دونوں ہاتھ آگ کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''مُجھے لگتا تھا کہ پہاڑی علاقوں میں سردی صرف تصویروں میں اچھی لگتی ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ تصویر بناتے وقت لوگ کیمرہ بند کر کے کمبل میں گھس جاتے ہوں گے۔''

اس کے برابر بیٹھے ایک رضا کار نے ہنس کر پوچھا، ''تمہیں یہاں آنے سے پہلے کسی نے بتایا نہیں تھا کہ شمالی علاقوں میں راتیں ایسی ہوتی ہیں؟''

''بتایا تھا۔ لیکن کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہوا انسان کی ہڈیوں سے ذاتی دشمنی نکالتی ہے۔''

عالیہ ہنس دی۔ اس نے اپنی ٹانگیں سمیٹ کر تختے پر رکھ لیں اور ہاتھوں کو آپس میں رگڑنے لگی۔

''تمہیں تو پھر بھی آگ کے پاس جگہ مل گئی ہے۔ ذرا پیچھے بیٹھ کر دیکھو، وہاں سردی کے ساتھ انسان کو اپنی غلطیوں کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔''

ایک رضا کار نے لکڑی کا ایک ٹکڑا آگ میں ڈالا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

''اچھا، ایک بات بتاؤ۔ ہم سب یہاں مریضوں کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، لیکن آخر کار یہ مرحلہ بھی گزر جائے گا۔ پھر جب ہماری ایم بی بی ایس مکمل ہو جائے گی تو ہم کیا کریں گے؟''

زنیرہ نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ سوال تمہیں ابھی کیوں یاد آ گیا؟''

''کیونکہ یہاں بیٹھ کر مستقبل کے بارے میں سوچنا آسان ہے۔ کالج میں تو سوچنے کی فرصت نہیں ملتی۔''

''اور تم نے مستقبل کے بارے میں سوچ بھی لیا ہے؟'' عالیہ نے اچنبھے سے پوچھا۔

''بالکل۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ڈگری مکمل ہوتے ہی ایک سال آرام کروں گا۔''

زنیرہ نے اسے گھورا۔ ''تم ڈاکٹر بنو گے یا سیاح؟''

''ڈاکٹر بھی انسان ہوتے ہیں۔ انہیں بھی آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''ایک سال؟'' عالیہ نے حیرت سے کہا۔ ''تمہیں لگتا ہے تمہارے گھر والے تمہیں ایک سال آرام کرنے دیں گے؟''

''اسی لیے تو میں نے ابھی سے منصوبہ بندی شروع کر دی ہے۔ پہلے انہیں بتاؤں گا کہ میں ذہنی سکون کے لیے جا رہا ہوں، پھر فون بند کر دوں گا۔'' قریب بیٹھے دو رضا کار ہنس پڑے۔

''اچھا، تم بتاؤ، تم کیا کرو گی؟'' اس نے بات پلٹتے ہوئے زنیرہ سے پوچھا۔ زنیرہ نے آگ کے شعلے کو دیکھا۔ اس کے چہرے سے شوخی کچھ کم ہو گئی۔

''میں بچوں کی ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔''

''بچوں کی؟'' عالیہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

زنیرہ نے سر ہلایا۔ ''ہاں۔ مجھے لگتا ہے بچوں کی بیماری صرف ان کے جسم کو نہیں، پورے گھر کو بیمار کر دیتی ہے۔ بچہ ٹھیک سے بتا بھی نہیں سکتا کہ اسے کہاں تکلیف ہے، اور والدین اپنی گھبراہٹ میں کبھی کبھی اس کی آدھی بات سمجھتے ہیں، آدھی اپنی طرف سے بنا لیتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں ایسی ڈاکٹر بنوں جس کے پاس آنے والے والدین کو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ اپنے بچے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔''

چند لمحوں کے لیے سب خاموش ہو گئے۔ آگ کی روشنی زنیرہ کے چہرے پر ٹھہری ہوئی تھی۔ اس نے اپنی بات کے بعد دوبارہ ہاتھ آگ کی طرف پھیلا دیے، جیسے اپنے دل کی بات کہہ کر اب اسے چھپانے کے لیے کسی اور موضوع کی ضرورت ہو۔

''اور تم؟'' اس نے عالیہ سے پوچھا۔
عالیہ نے اپنی پیشانی پر گرتی ہوئی لٹ کو پیچھے کیا۔ ''میں نے ابھی حتمی فیصلہ نہیں کیا۔''

''یہ تو کوئی جواب نہیں ہوا۔''

''تو پھر یہ جواب ہے کہ میں اپنے لیے کوئی ایسی جگہ چاہتی ہوں جہاں مُجھے ہر روز یہ ثابت نہ کرنا پڑے کہ میں وہاں ہونے کے قابل ہوں یا نہیں۔''
زنیرہ نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم ڈاکٹر بننے کی بات کر رہی ہو یا گھر کی؟''
عالیہ نے ہنسنے کی کوشش کی، مگر اس کی مسکراہٹ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ ''شاید دونوں کی۔'' اس نے نظریں آگ پر جما دیں۔

''میں نے ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ لوگ لڑکیوں کے مستقبل کے بارے میں بہت پہلے فیصلے کر لیتے ہیں۔ انہیں کون سا مضمون پڑھنا چاہیے، کس سے ملنا چاہیے، کہاں جانا چاہیے، کب واپس آنا چاہیے۔ کبھی کبھی مُجھے لگتا ہے کہ ہم اپنی زندگی شروع کرنے سے پہلے ہی اس کے کئی حصوں کی اجازت مانگتے رہتے ہیں۔''

کسی نے اس کی بات کا مذاق نہیں اڑایا۔ شاید وہاں بیٹھے ہر شخص نے اپنی زندگی میں کسی نہ کسی شکل میں ایسا دباؤ محسوس کیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بعض لوگوں کے لیے وہ دباؤ معمول کی بات تھی، جبکہ دوسروں کے لیے ہر روز کی ایک خاموش لڑائی تھی۔

تو تم کیا چاہتی ہو؟'' زنیرہ نے نرمی سے پوچھا۔ عالیہ نے کچھ دیر سوچا اور پھر بولنا شروع کیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ جب میں کوئی فیصلہ کروں تو کم از کم مُجھے خود معلوم ہو کہ وہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔ چاہے بعد میں وہ غلط ہی

کیوں نہ ثابت ہو۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' ایک رضا کار نے کہا۔

''اچھی بات ہے، مگر آسان نہیں ہے۔'' عالیہ نے جواب دیا۔ اس کے بعد اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر سلال کی طرف اٹھ گئی۔ وہ آگ کے دوسری جانب بیٹھا لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو شعلوں میں دھکیل رہا تھا۔ عالیہ کو اس کا انداز ہمیشہ عجیب لگتا تھا۔ وہ محفل میں موجود ہوتا تو بھی یوں محسوس ہوتا جیسے اس کا ایک حصہ کسی اور جگہ مصروف ہے۔ وہ بات سنتا تھا، لیکن ہر بات پر اپنی رائے دینا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ اور جب بولتا تو عموماً اتنا ہی کہتا جتنا ضروری ہوتا۔

''سلال، اب تم بتاؤ۔'' کسی نے اسے مخاطب کیا۔ ''ڈگری کے بعد کیا ارادہ ہے؟''

سلال نے نگاہ اٹھائی۔ ''کام کرنا ہے۔''

''یہ تو ہم سب نے کرنا ہے۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔'' زنیرہ نے فوراً اسکی بات اچک لی۔

''سرکاری ہسپتال میں کام کرنے کا ارادہ ہے۔ اگر موقع ملا تو کسی ایسے علاقے میں تعینات ہونا چاہوں گا جہاں طبی سہولتیں کم ہیں۔''

''اور آگے اسپیشلائزیشن؟''

''ابھی طے نہیں کیا۔ پہلے اچھا ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔ پھر دیکھوں گا کہ کس شعبے میں میری ضرورت زیادہ ہے۔''

''بس؟'' عالیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اور کیا ہونا چاہیے؟'' سلال نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

کوئی بڑا منصوبہ، کوئی خواب؟ تم یوں بتا رہے ہو جیسے اگلے ہفتے کی خریداری کی فہرست ہو۔''

اس کے قریب بیٹھے ایک رضا کار نے قہقہہ لگایا۔ سلال کے چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ آئی۔

''خواب کا بڑا ہونا ضروری نہیں، اس تک پہنچنے کے لیے کام کرنا ضروری ہے۔''

''یہ بات تو بہت آسان ہے۔ اس میں ناکام ہونے کا خطرہ بھی کم ہے۔''

سلال نے عالیہ کے اس جملے کا برا نہیں مانا۔ وہ اسی سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''ناکامی کا خطرہ کم رکھنے کے لیے خواب چھوٹا نہیں ہونا چاہیے۔اپنے حصے کی ذمہ داری واضح ہونی چاہیے۔''

''اور اگر تمہیں وہ ذمہ داری پوری کرنے ہی نہ دی جائے؟''اس بار سلال نے جواب دینے سے پہلے چند لمحے توقف کیا۔
''تو آدمی کو دیکھنا پڑتا ہے کہ رکاوٹ کہاں ہے۔ ہر رکاوٹ سے لڑنا ضروری نہیں ہوتا،مگر ہر رکاوٹ کے سامنے ہتھیار ڈال دینا بھی عقل مندی نہیں۔''

عالیہ خاموش ہوگئی۔اسے سلال کی یہی بات ناگوار گزرتی تھی۔وہ کبھی کسی کو خوش کرنے کے لیے اپنی رائے تبدیل نہیں کرتا تھا،لیکن اس کے انداز میں ایسی سختی بھی نہیں ہوتی تھی جسے آسانی سے بدتمیزی کہا جاسکے۔وہ بحث جیتنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اپنی بات کہہ کر اسے وہیں چھوڑ دیتا تھا۔پھر دوسروں کو فیصلہ کرنا پڑتا تھا کہ اس بات کے ساتھ کیا کرنا ہے۔

''تم ڈاکٹر کیوں بننا چاہتے ہو؟''عالیہ نے کچھ دیر بعد پھر سے پوچھا۔اس بار اس کا لہجہ پہلے جیسا چبھتا ہوا نہیں تھا۔سلال نے آگ کی طرف دیکھا۔

''کیونکہ بیماری انسان سے بہت سی چیزیں چھین لیتی ہے۔صحت،آزادی،روزمرہ کے معمولات،کبھی کبھی اپنے فیصلے کرنے کی صلاحیت بھی۔اگر کسی کی تکلیف کم کرنے کے لیے میرے پاس علم اور اختیار ہو تو میں چاہوں گا کہ اسے استعمال کروں۔''

''اور اگر تم کسی کی تکلیف کم نہ کر سکے؟''

''تو کم از کم یہ کوشش کروں گا کہ میری وجہ سے اس کی تکلیف میں اضافہ نہ ہو۔''
آگ میں ایک لکڑی زور سے چٹخی۔عالیہ کے چہرے کا رنگ ایک پل کو بدل سا گیا۔

زنیرہ نے آہستہ سے کہا،''مُجھے لگتا ہے ہم سب کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔''کسی نے سر ہلایا۔کسی نے اپنے ہاتھ دوبارہ آگ کے سامنے پھیلا دیے۔

پھر گفتگو کا رخ بدل گیا۔ایک رضا کار نے بتایا کہ وہ مستقبل میں تحقیق کے شعبے میں جانا چاہتا ہے۔دوسرے نے کہا کہ وہ اپنے آبائی علاقے میں ایک چھوٹا سا طبی مرکز قائم کرنا چاہتا ہے، جہاں لوگوں کو معمولی بیماریوں کے لیے بھی کئی گھنٹے سفر نہ کرنا پڑے۔کسی نے بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی،تو کسی نے ہنستے ہوئے کہا کہ وہ پہلے امتحانات میں کامیاب ہونے کی فکر کرے گا، مستقبل کے فیصلے بعد میں ہوں گے۔کچھ دیر تک قہقہے گونجتے رہے۔پھر ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔زنیرہ نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کیے اور آسمان کی طرف دیکھا۔

''مُجھے لگتا ہے ہمیں واپس جانا چاہیے۔اگر میں نے مزید دس منٹ یہاں گزارے تو کل صبح میری جگہ کوئی اور حاضری لگائے گا۔''

آہستہ آہستہ لوگ اٹھنے لگے۔کسی نے آگ میں باقی لکڑیاں درست کیں،کسی نے اپنے دستانے تلاش کیے،اور کسی نے دوسرے دن کی ذمہ داریوں کے بارے میں پوچھا۔کچھ فاصلے پر طبی مرکز کے باہر ایک روشنی اب بھی روشن تھی۔وہاں چند اہلکار مریضوں کی نگرانی کر رہے تھے،اور کبھی کبھار کسی کی آواز رات کے سکوت میں ابھر آتی۔عالیہ نے اپنے کوٹ کی جیب سے دستانے نکالے اور پہنتے ہوئے سلال کی طرف دیکھا۔

''تمہیں واقعی کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ زندگی میں کام کے علاوہ بھی کچھ ہونا چاہیے؟''

سلال نے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے جواب دیا،''آتا ہے۔''

''پھر؟''

''پھر میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس وقت میرے ذمے کیا کام ہے۔''

عالیہ نے تاسف سے سر ہلایا۔''تم سے بات کرنا کبھی کبھی دیوار سے بات کرنے جیسا لگتا ہے۔''

سلال نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ ''مُجھے دیوار سے مت ملاؤ۔دیوار کم از کم ہر بات کا جواب دینے کی کوشش نہیں کرتی۔''

زنیرہ ہنسی۔عالیہ نے اسے گھورا، پھر خود بھی مسکرا دی۔پھر اس نے سر جھٹکا اور اپنے کیمپ کی طرف چل دی۔اس کے پیچھے زنیرہ کی ہنسی کچھ دیر تک سنائی دیتی رہی۔عالیہ کے کیمپ تک پہنچتے پہنچتے سردی مزید بڑھ گئی تھی۔اس نے خیمے کے سامنے لٹکے

موٹے پردے کوایک طرف کیااور اندر داخل ہوگئی۔ باہر کی ہوا سے بچاؤ کے لیے خیمے کی دیواروں پر اضافی کپڑا لگایا گیا تھا۔ ایک کونے میں اس کا بیگ رکھا تھا، دوسرے میں تہہ کیا ہوا کمبل اور بستر۔ چھوٹی سی ایمرجنسی لائٹ خیمے کے اندر مدھم اجالا پھیلا رہی تھی۔ وہ تھکی ہوئی تھی۔ پورا دن مریضوں کی مدد، ادویات کی ترتیب، اندراج اور دوسرے کاموں میں گزر گیا تھا۔ اس نے دستانے اتار کر بیگ پر رکھے اور کوٹ کے بٹن کھولنے لگی۔ تبھی اس کی نگاہ بستر پر پڑی۔ تکیے کے سرہانے ایک چھوٹا سا کارڈ رکھا تھا۔ عالیہ رک گئی۔ اسے یقین تھا کہ جاتے وقت وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس نے اپنا بستر خود درست کیا تھا، کمبل تہہ کیا تھا اور تکیہ دیوار کے ساتھ رکھ کر باہر گئی تھی۔ اس کی چیزیں بھی اپنی جگہ موجود تھیں۔ وہ چند لمحے کارڈ کو دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب گئی۔ اس نے کارڈ اٹھالیا۔

''اور جھوٹی شہادتوں سے دل پھٹ جایا کرتے ہیں۔''

اس نے عبارت دوبار پڑھی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''جھوٹی شہادتیں؟'' اس نے بے اختیار سرگوشی کی۔ یہ محض کوئی جملہ تھا یا کسی بات کی طرف اشارہ؟ کسی نے اسے یہ پیغام کیوں بھیجا تھا؟ اور اگر یہ پیغام اسی کے لیے تھا تو بھیجنے والے کو اس کے بارے میں کیا معلوم تھا؟ اس نے کارڈ پلٹ کر دیکھا۔ پچھلی طرف کچھ نہیں تھا۔ اس نے کارڈ کو روشنی کے قریب کیا، جیسے ممکن ہو کاغذ پر کوئی مدھم تحریر ہو جو پہلی نظر میں دکھائی نہ دی ہو۔ مگر وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔

عالیہ کے ذہن میں آگ کے گرد ہونے والی گفتگو کے چند جملے ابھرے۔ سلال کی آواز، اسکا انداز اور اس کا چہرہ۔ اس نے فوراً سر جھٹک دیا۔ اس گفتگو کا اس کارڈ سے کیا تعلق ہوسکتا تھا؟ پھر بھی وہ جملہ اس کے ذہن سے نکل نہیں رہا تھا۔ جھوٹی شہادتوں سے دل پھٹ جایا کرتے ہیں۔ اس نے کارڈ کو اپنے ہاتھوں میں گھمایا۔ الفاظ میں کوئی پہیلی نہیں تھی، لیکن ان کے اندر ایک ایسی تلخی تھی جس نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ یہ کسی نصیحت جیسا بھی نہیں لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے لکھنے والا کسی ایسے دکھ کے بارے میں جانتا ہو جسے عالیہ نے ابھی نام بھی نہیں دیا تھا۔ اس نے خیمے کے پردے کی طرف دیکھا۔ باہر سے قدموں کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ ہوا خیمے کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھی اور کہیں دور کسی رضا کار کے بولنے کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ عالیہ نے کارڈ دوبارہ پڑھا۔ پھر اسے تکیے کے نیچے رکھنے لگی، مگر ہاتھ روک لیا۔ کچھ سوچ کر اس نے کارڈ اپنے

بیگ کی چھوٹی جیب میں رکھ دیا۔

''یہ ایک فضول سی بات ہے۔''اس نے خود سے کہا، جیسے اپنے ذہن کو مطمئن کرنا چاہتی ہو۔اس نے کوٹ اتارا، جوتے ایک طرف رکھے اور بستر پر بیٹھ گئی۔دن بھر کی تھکن اب جسم پر پوری طرح حاوی ہو رہی تھی، مگر ذہن میں وہ ایک سطر بار بار ابھر رہی تھی۔انے کمبل اپنے اوپر کھینچا روشنی بجھا دی۔اندھیرے میں خیمے کی چھت پر پڑتی مدھم روشنی بھی غائب ہوگئی۔اس نے آنکھیں بند کرلیں۔کچھ دیر بعد اس کی سانسیں ہموار ہونے لگیں، مگر نیند آنے سے پہلے آخری خیال پھر اسی کارڈ کا تھا۔
کسی اجنبی کو اس کے دل کے بارے میں کیا معلوم ہوسکتا تھا؟

☆.....☆.....☆

حق کچھ دیر پہلے ہی کامل کو سلا کر اپنے کمرے میں آیا تھا کہ میز پر رکھا فون مسلسل لرزنے لگا۔اسکرین پر ابھرتا نام دیکھ کر اس نے ایک سرسری نگاہ ڈالی اور نظر انداز کر دیا۔فون بجتا رہا، یہاں تک کہ کال منقطع ہوگئی۔چند لمحوں بعد اسکرین دوبارہ روشن ہوئی۔

Dr. Lauren Calling...

ڈاکٹر سیرہ لارین اسکی تھراپسٹ تھی۔اس بار حق نے قدرے توقف کے بعد کال اٹھالی۔"یس لورین؟"
دوسری طرف سے ڈاکٹر لورین کی مانوس آواز ابھری۔"حق، میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟"
" کہو، خیریت؟"وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔
"خیریت ہی سمجھ لو۔دراصل، مُجھے تم سے ایک بات شیئر کرنی تھی۔آج مُجھے نیمل شبگیر کا فون آیا تھا۔"
الماری سے شب خوابی کا لباس نکالتے حق کی انگلیاں ٹھہر سی گئیں۔چہرے پر موجود بے نیازی اپنی جگہ برقرار رہی، مگر اس کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے ساکت ہوگئیں۔جیسے کسی نے اچانک اس کے ذہن میں چلتے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا ہو۔

"نیمل شبگیر؟"اس نے نام دہراتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں، تمہاری کزن ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی۔"

یہ سنتے حق کے لبوں پر ایک دھیمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اچھا؟" اس نے ایک جوڑا نکالتے ہوئے پوچھا۔ "پھر؟"

"پہلے تو اس نے مُجھے اپنی بہن کے حوالے سے فون کیا۔ کچھ باتیں ڈسکس کرنی تھیں، گفتگو بالکل معمول کے مطابق شروع ہوئی تھی۔ مُجھے لگا، شاید اسے کسی قسم کی رہنمائی چاہیے۔"

"اور پھر؟" حق کی آواز میں اب واضح دلچسپی تھی۔

"پھر آہستہ آہستہ اس نے گفتگو کا رخ تمہاری طرف موڑ دیا۔"

حق کی مسکراہٹ ذرا مزید گہری ہوگئی۔ "پھر؟"

"پہلے اس نے تمہارے بارے میں عمومی سوالات کیے، پھر بات سلویٰ کی بیماری تک لے آئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ تم اس حوالے سے کس حد تک پریشان ہو اور کیا تم نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات کی ہے۔"

حق نے پلٹ کر آئینے میں خود کو دیکھا۔ نیمل شبگیر۔ ایک وکیل، جو سوال پوچھنے سے پہلے اپنے سوال کا ممکنہ جواب بھی ذہن میں رکھتی تھی۔ اور اب وہ اس کے بارے میں جاننے کے لیے اس کی اپنی تھراپسٹ تک پہنچ گئی تھی۔

"دلچسپ! پھر تم نے کیا کہا؟" وہ دھیمے سے مسکرا رہا تھا۔

"وہی جو مُجھے کہنا چاہیے تھا۔ میں نے اسے واضح کر دیا کہ میں اپنے کسی پیشنٹ کی ذاتی معلومات یا سیشنز کی تفصیلات کسی تیسرے شخص کے ساتھ ڈسکس نہیں کر سکتی۔ چاہے وہ اس کی کزن ہی کیوں نہ ہو۔"

"گڈ!" حق نے مختصر سا جواب دیا۔

"لیکن حق!" لورین نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا، "مُجھے محسوس ہوا کہ وہ محض سلویٰ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے فون نہیں کر رہی تھی۔ وہ تمہارے ردِعمل کو سمجھنا چاہتی تھی۔ جیسے اسے تمہاری خاموشی کے پیچھے چھپی کسی بات تک پہنچنا ہو۔"

حق کے لبوں پر مسکراہٹ برقرار رہی۔ "تمہیں ایسا کیوں لگا؟"

"کیونکہ وہ بار بار تمہاری کیفیت کی طرف واپس آ رہی تھی۔ اس نے بالواسطہ طور پر یہ جاننے کی کوشش کی کہ سلویٰ کے معاملے نے تمہیں کتنا متاثر کیا ہے۔ میں نے اسے تمہاری کوئی خفیہ بات نہیں بتائی، لیکن میں نے ایک بات واضح کر دی۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ تم واقعی اپنی ڈرائیورس کو لے کر پریشان تھے۔"

اس بار حق کی مسکراہٹ کچھ لمحوں کے لیے مدھم پڑی۔ "تم نے اسے یہ بتایا؟"

"صرف اتنا کہ تم اس معاملے کو لے کر فکرمند تھے۔ میں نے تمہاری گفتگو کی تفصیلات نہیں بتائیں، نہ ہی تمہارے سیشنز میں ہونے والی کسی بات کا ذکر کیا۔ لیکن کبھی کبھی کسی کی پریشانی کو تسلیم کر دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ہر بات کو راز بنا کر رکھنے سے سامنے والے کو حقیقت سمجھنے میں مدد نہیں ملتی۔"

حق نے سر قدرے جھکا کر انگوٹھے سے اپنی انگلی پر دستک دی۔ شادی کی انگوٹھی ابھی تک اسکی انگلی میں تھی۔

"اور تمہیں لگتا ہے کہ نیمل کو حقیقت سمجھنے میں دلچسپی ہے؟"

"مُجھے نہیں معلوم کہ اسے کس چیز میں دلچسپی ہے۔" لورین کی آواز میں ہلکی سی مسکراہٹ گھل گئی۔ "لیکن وہ تمہارے بارے میں جاننا ضرور چاہتی ہے۔"

"وہ ایک وکیل ہے، لورین۔ سوال پوچھنا اس کی عادت ہوگی۔" اس نے جیسے نفی کرنا چاہی۔

"اور تمہیں ہر سوال کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد تلاش کرنے کی عادت ہے۔"

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ "(Touché) توشے!" کچھ لمحوں تک دونوں طرف خاموشی رہی۔ پھر لورین نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں اس بات سے کوئی مسئلہ ہے کہ وہ تمہارے بارے میں جاننا چاہتی ہے؟"

حق نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں میز پر رکھے لیپ ٹاپ پر مرکوز تھیں، مگر ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ نیمل نے اس سے براہِ راست سوال کرنے کے بجائے ایک ایسا راستہ چنا تھا جس پر چلتے ہوئے وہ شاید اس کے بارے میں کچھ ایسا جان سکتی تھی جو حق خود اسے کبھی نہ بتاتا۔ اور اسے اس بات پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ حیرت تو کسی اور بات پر تھی۔ اس نے آہستہ سے سانس خارج کی۔

"نہیں۔ مُجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"پھر... تم اتنا حیران کہوں ہوئے تھے؟" حق کے لبوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ پھیل گئی۔

" کیونکہ میں سوچ رہا تھا کہ نیمل شبگیر کو میری زندگی میں اتنی دلچسپی لینے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔"
"اور تمہیں اس کی وجہ جاننے میں دلچسپی ہے؟"

"اب تو ہے۔ بہرحال، مُجھے بتانے کے لیے شکریہ۔ اور اگلی بار اگر نیمل کا فون آئے تو اسے مجھ سے بات کرنے کا مشورہ دے دینا۔ دوسروں سے میرے بارے میں پوچھنے کے بجائے وہ براہِ راست مجھ سے سوال کر سکتی ہے۔"
"مُجھے یقین ہے، تم خود بھی اسے یہ بات بتا سکتے ہو۔"

"ممکن ہے۔" حق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن پھر اسے سوال کرنے کا وہ مزہ کہاں ملے گا جو میری غیر موجودگی میں ملتا ہے؟"
"تم چاہتے ہو وہ تمہارے بارے میں دنیا سے پوچھتی رہے؟"
حق نے گہری سانس لی۔ "پوچھ لینے میں کیا حرج ہے؟" (البتہ وہ یہ نہ کہہ سکا کہ "میں چاہتا ہوں وہ بھری دنیا میں صرف میرا پوچھے۔")
دونوں کے درمیان ایک مختصر سی ہنسی کا تبادلہ ہوا، پھر لورین نے اسے خدا حافظ کہا۔

"شکریہ، لورین!" حق نے خوش دلی سے کہا اور کال منقطع کر دی۔ اس نے فون میز پر رکھا، مگر اس کی نگاہیں چند لمحوں تک اسکرین پر ٹھہری رہیں۔ چہرے پر خوشگوار سی حیرت تھی۔ نیمل کے اس غیر متوقع اقدام نے اس کے اندر تجسس ضرور جگایا تھا، لیکن اس تجسس کے نیچے کوئی اور احساس بھی تھا، جسے وہ فی الحال کوئی نام نہیں دینا چاہتا تھا۔ پھر اس نے بیٹھتے ہوئے صوفے کی پشت سے سر ٹکایا اور چھت کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔

"تم آج بھی میری اتنی ہی فکر کرتی ہو، بیلا!"

اسے معلوم نہیں تھا کہ نیمل کے ذہن میں کیا چل رہا تھا، وہ اس کے بارے میں کیا جاننا چاہتی تھی، یا اس کی اس اچانک دلچسپی کے پیچھے محض تجسس تھا یا کچھ اور۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ کسی نے اس کی زندگی کے ایک ایسے گوشے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا جسے وہ

دنیا کی نظروں سے اوجھل سمجھتا آیا تھا۔اور عجیب بات یہ تھی کہ اسے اس مداخلت پر ناگواری نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ ایک مدت بعد اسے اپنے اندر اطمینان کی ایک ہلکی سی لہر محسوس ہوئی۔ جیسے کسی نے اسے خاموشی سے یقین دلایا ہو کہ کچھ رشتے فاصلے اختیار کر لینے سے ختم نہیں ہوتے۔ کچھ رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے۔

☆.....☆.....☆

وادیِ لیڈی کے اس کیمپ میں جہاں زندگی اور موت کی کشمکش روز کا معمول بن چکی تھی، آج کا دن ایک ایسے انمٹ اور گہرے غم کا بوجھ لے کر اترا تھا جس نے سب کے حوصلے توڑ کر رکھ دیے تھے۔ وہ بیماری، جس سے وہ باہر کے لوگوں کو بچانے کی جنگ لڑ رہے تھے، اب ان کے اپنے ہی حصار میں نقب لگا چکی تھی۔ ان کی میڈیکل ٹیم کا ایک نوجوان، انتہائی فرض شناس اور نڈر ڈاکٹر جو پچھلے کئی دنوں سے مسلسل بغیر آرام کیے مریضوں کی جان بچانے میں دن رات ایک کیے ہوئے تھا خود اس موذی وائرس (SPS-24) کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ اس کی حالت اتنی تیزی سے بگڑی کہ کسی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ بیماری نے اپنے آخری اسٹیج پر پہنچ کر اس کے جسم کو اندر سے توڑ دیا تھا۔ مسلسل خون کی قے اور سانس کی شدید تکلیف نے اس کی بقیہ طاقت بھی نچوڑ لی تھی۔ مرکزی آئسولیشن ٹینٹ کے اندر کا منظر انتہائی دل دہلا دینے والا تھا۔

سلال، عالیہ اور دیگر تمام قریبی ساتھی پچھلے کئی گھنٹوں سے اس کی زندگی کی ڈور تھامنے کے لیے ایک انہونی جنگ لڑ رہے تھے۔ آکسیجن ماسک، ہنگامی انجکشن اور دعاؤں کا تانتا بندھا ہوا تھا، مگر وائرس کا وار اتنا کاری تھا کہ ہر کوشش ناکام ہوتی جا رہی تھی۔ مانیٹر پر چلتی ہوئی دل کی دھڑکن کی لکیر دھیرے دھیرے سست پڑ رہی تھی۔

اور پھر...ایک طویل اور لرزتی ہوئی بیپ کے ساتھ، وہ مانیٹر کی سکرین ایک سیدھی لکیر میں تبدیل ہو گئی۔ وقت جیسے وہیں تھم گیا۔ ٹینٹ کے اندر کھڑا ہر شخص پتھر کا بت بن گیا۔ سلال کا ہاتھ اس ڈاکٹر کے بے جان بازو پر ہی رہ گیا، اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور گلے میں الفاظ پھنس کر رہ گئے تھے۔ وہ سب یہاں لوگوں کو موت کے منہ سے چھڑانے آئے تھے، مگر آج وہ اپنے ہی ایک ساتھی کو بچانے میں ہار چکے تھے۔ اس دن پورے کیمپ میں ایک گھٹن اور سوگوار سناٹا چھایا رہا۔ خیموں کے باہر گھومنے والے رضا کاروں کے چہروں پر ایک گہرا ہولناک سکوت طاری تھا۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ شام کا وقت ہوا تو پہاڑوں کے پیچھے سورج کی آخری کرنیں ڈوبنے لگیں، اور وادی میں یخ بستہ ہواؤں کا شور مزید تیز ہو گیا۔

کیمپ کے مرکزی میدان میں ایک پوٹھوہار کھڑی تھی، جس میں اس شہیدِ خدمت ڈاکٹر کی میت کو رکھا جا رہا تھا۔ تمام رضا کار،

ڈاکٹرز اور نرسنگ اسٹاف خاموشی سے قطار میں کھڑے تھے۔کسی کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے تو کوئی ہاتھ اٹھائے اس کی مغفرت کی دعا کر رہا تھا۔جب گاڑی کے دروازے بند ہوئے اور وہ اس برفانی وادی کے راستے پر شہر کی طرف روانہ ہوئی،تو پیچھے چھوٹ جانے والے ان تمام تھکے ہوئے انسانوں کے دلوں میں ایک خلاء سا چھوڑ گئی۔

☆.....☆.....☆

شبگیر ہاؤس کے لاؤنج میں اس شام ایک عجیب سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ٹیلی ویژن چل رہا تھا،سامنے رکھی میز پر چائے کے برتن سجے تھے،اور صوفے کے ایک کونے میں تارہ اپنا کیمرہ لیے بیٹھی تھی،مگر اس کی نظریں بار بار کیمرہ سے ہٹ کر سامنے رکھی خالی نشست پر جا ٹھہرتی تھیں۔وہ نشست سلال کی تھی۔گھر میں اس کے ہوتے ہوئے کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنی موجودگی سے کتنی جگہ گھیرتا تھا۔کبھی کسی کتاب پر جھکا ہوا،کبھی موبائل پر فلسطین سے متعلق کوئی خبر پڑھتا ہوا،کبھی نوفہ کے کسی عجیب وغریب سوال کا جواب دیتا ہوا اور کبھی دادی کی باتوں پر خاموشی سے مسکراتا ہوا۔وہ زیادہ بولنے والوں میں سے نہیں تھا،لیکن اس کی خاموشی بھی گھر کے معمول کا حصہ تھی۔اب ایک ہفتے سے وہ خاموشی بھی گھر سے غائب تھی۔

"دادی!" تارہ نے بالآخر کیمرہ صوفے پر رکھتے ہوئے کہا،" آپ کو نہیں لگتا کہ سلال بھائی کے بغیر یہ گھر کچھ زیادہ ہی بورنگ ہو گیا ہے؟"

دادی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے آگے سرکائے اور اسے دیکھا۔" گھر بورنگ ہو گیا ہے یا تمہیں تنگ کرنے والا کوئی نہیں رہا؟"

نوفہ کے لبوں پر فوراً مسکراہٹ پھیل گئی۔"دونوں باتیں ہیں،دادی!لیکن زیادہ پہلی والی بات ہے۔"

"تو اب گھر کی رونق کا سارا سہرا سلال کے سر باندھ دو۔باقی ہم سب تو جیسے دیواروں پر ٹنگی تصویریں ہیں۔"نامرہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔

" کچھ لوگ یاد آنے کا شور نہیں مچاتے۔ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انہیں اپنے لوگ یاد نہیں آتے۔" دادی نے سنجیدگی سے کہا تو نوفہ نے اپنے پاؤں صوفے پر سمیٹ لیے۔

"لیکن وہ فون بھی تو نہیں کرتے۔"

"وہ کسی تفریحی دورے پر نہیں گیا کہ ہر شام بیٹھ کر ہم سب کو تفصیل سے بتاتا رہے کہ آج کیا کھایا، کس سے ملا اور کہاں گھوما؟" نامرہ اپنے ازلی انداز میں بولی۔

"میں نے یہ کب کہا؟" نوفہ نے احتجاج کیا۔ "میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ کم از کم ایک بار فون کر کے بتا دیں کہ خیریت سے ہیں۔"

"دو دن پہلے بات ہوئی تھی نا تمہاری؟" تارہ نے پوچھا۔

"ہاں، ہوئی تھی۔"

"پھر؟" نوفہ نے کچھ لمحے سوچا، جیسے اسے وہ مختصر سی گفتگو لفظ بہ لفظ یاد آ رہی ہو۔

"میں نے پوچھا تھا کہ آپ کب آئیں گے۔ انہوں نے کہا تھا، جلد واپس آ جاؤں گا۔ پھر میں نے پوچھا کہ جلد کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ کل، پرسوں یا اگلے ہفتے؟"

دادی کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

"اور انہوں نے کیا کہا؟" نامرہ نے اسکے لہجے کی نقل اتاری۔

"انہوں نے کہا، نوفہ! تم ڈاکٹر بننے سے پہلے ہی مریض کا دماغ کھا جاؤ گی۔"

تارہ بے اختیار ہنس دی۔ "یہ تو بالکل سلال بھائی والا جواب ہے۔"

"میرا بچہ وہاں دن رات اتنی بڑی ذمہ داری سنبھال رہا ہے... اللہ پاک اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ بس وہ خیریت سے اس گھر کی دہلیز پر واپس آ جائے، تو اس دل کو قرار آئے۔" دادی نے اپنی عینک کو درست کرتے ہوئے، محبت اور فکر میں گندھی آواز میں کہا۔ دادی کی اس بات پر لاؤنج میں ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی مگر اس بار اس خاموشی میں اداسی کے ساتھ ساتھ سلال کی جلد واپسی کی ایک پرامید آس بھی شامل تھی۔ گھر کے ہر فرد کے دل میں بس ایک ہی التجا تھی کہ وہ خوفناک وادی

کا طوفان تھم جائے، اوران کا سلال مسکراتا ہوا واپس اپنے گھر لوٹ آئے۔

☆.....☆.....☆

رات کے گیارہ بج کر سینتالیس منٹ ہو رہے تھے۔ نیمل شبگیر کے کمرے میں کئی گھنٹوں سے جلنے والی روشنی اب بھی میز پر پھیلی ہوئی تھی۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر کھلی ہوئی فائل کے ایک کونے میں کرسر مسلسل ٹمٹمار ہا تھا، مگر نیمل کی نظریں اس پر نہیں تھیں۔ وہ کمرے کی دوسری دیوار کے سامنے کھڑی تھی، جہاں نصب کارک بورڈ اب اپنی اصل شکل کھو چکا تھا۔

کبھی اس بورڈ پر صرف دو تصویریں تصویر لگی تھیں۔ سلویٰ اور حق تصویر۔ اب اس بورڈ پر جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ تصویروں کے گرد کاغذوں کی کئی تہیں تھیں۔ کہیں اسپتال کے ریکارڈ کی نقول، کہیں پوسٹ مارٹم رپورٹ کے اہم نکات، کہیں ہاتھ سے لکھے گئے سوالات، کہیں فون کالز کے اوقات، کہیں تاریخیں اور کہیں مختلف بیانات سے اخذ کیے گئے ایسے جملے جن کے درمیان نیمل نے باریک سرخ لکیریں کھینچ رکھی تھیں۔ چند جگہوں پر نیلے دھاگے ایک کاغذ کو دوسرے سے ملاتے تھے، جبکہ بعض سرخ دھاگے ایسے راستوں پر ختم ہوتے تھے جن کے آگے اس نے بڑے حروف میں لکھ رکھا تھا۔

"تصدیق درکار ہے۔"

پچھلے کئی دنوں سے نیمل ایک ایک مفروضے کو کھول رہی تھی، اسے دستیاب حقائق کے سامنے رکھتی، پھر دیکھتی کہ وہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے یا نہیں۔ اور آج، پہلی مرتبہ، اس کے پاس اپنے سوال کا جواب تھا۔

"حق بزدار سلویٰ خان کا قاتل نہیں تھا۔"

نیمل کو کسی ایسے نتیجے کی ضرورت نہیں تھی جو اسے جذباتی طور پر مطمئن کر دے۔ اسے ایسا نتیجہ چاہیے تھا جو تمام دستیاب حقائق کے سامنے قائم رہ سکے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے حق پر ہر طرح سے شک کیا تھا۔ کئی مرتبہ اسے لگا تھا کہ وہ ایک قدم آگے

بڑھی ہے، مگر اگلے ہی لمحے کوئی نئی تفصیل اس کے بنائے ہوئے خاکے کو بدل دیتی۔ ایک رات تو اس نے بورڈ سے تین کاغذ اتار کر میز پر پھینک دیے تھے، کیونکہ ان کے درمیان قائم کیا گیا تعلق محض اتفاق پر مبنی نکلا تھا۔ وہ دیر تک ان کاغذوں کو دیکھتی رہی تھی۔ پھر اس نے انہیں دوبارہ ترتیب دیا، اپنی غلطی تسلیم کی اور نئے سرے سے کام شروع کر دیا تھا۔ نیمل کے لیے یہ مان لینا مشکل نہیں تھا کہ اس سے غلطی ہو سکتی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اپنی غلطی کو کسی دوسرے انسان کی زندگی پر فیصلہ نہیں بننے دینا چاہتی تھی۔ خاص طور پر اس معاملے میں۔ کیونکہ حق بزدار کے خلاف شک کرنے کی وجہ محض سلویٰ کی موت نہیں تھی۔ سلویٰ کے والد کے خدشات بھی تھے۔ ان خدشات کو نظر انداز کرنا بے حسی ہوتی، مگر انہیں ثبوت کا متبادل بنا دینا انصاف نہیں تھا۔

نیمل نے ان کی باتوں کو بھی اپنے نوٹس میں درج کیا تھا۔ ہر الزام کے سامنے اس کا ماخذ لکھا، ہر دعوے کے سامنے اس کی تصدیق کی کیفیت واضح کی۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ کون سی بات براہِ راست معلوم تھی، کون سی کسی دوسرے شخص کے بیان پر مبنی تھی اور کون سی محض اندیشے سے جنم لے سکتی تھی۔ اس عمل میں کئی دن گزر گئے تھے۔ اس کی میز پر ہر رات کافی کے خالی مگ جمع ہوتے رہے تھے، موبائل کی بیٹری بار بار ختم ہوتی رہی، اور رات کے آخری پہر اس کی آنکھیں جلنے لگتی تھیں۔ وہ کبھی لیپ ٹاپ پر دستاویزات کا موازنہ کرتی، کبھی کسی پرانے نوٹ کی تاریخ دیکھتی، کبھی اپنی بنائی ہوئی ترتیب کو نئے سرے سے جانچتی۔ وہ ایک نتیجے سے خوش ہو کر اگلے کاغذ کی طرف نہیں بڑھتی تھی۔ پہلے یہ دیکھتی کہ کہیں اس نتیجے کی بنیاد ہی غلط تو نہیں۔

اور پھر، آہستہ آہستہ، تصویر واضح ہونے لگی تھی۔ مختلف ریکارڈز ایک دوسرے سے مطابقت رکھنے لگے تھے۔ جن نکات کو ابتدا میں نیمل نے مشکوک سمجھا تھا، ان کی وضاحت دستیاب معلومات سے ہو گئی تھی۔ حق کے خلاف موجود شبہات میں سے کوئی بھی اسے سلویٰ کی موت کا ذمہ دار ثابت نہیں کر رہا تھا۔ نہ اس کے پاس ایسا قابلِ اعتماد ثبوت تھا جو حق کو قتل سے جوڑتا، نہ دستیاب طبی اور واقعاتی ریکارڈ اس مفروضے کی تائید کرتے تھے۔

اس نے تمام کاغذ ایک مرتبہ پھر دیکھے تھے۔ پھر دوسری مرتبہ۔ اور اس کے بعد بھی، اطمینان کرنے کے لیے، اس نے اپنے نوٹس بند کر کے ہر چیز کو ذہن میں موجود ترتیب کے مطابق دوبارہ جانچا تھا۔ اب اسے معلوم تھا کہ وہ اس نتیجے تک محض حق کے لیے نرم گوشہ رکھنے کی وجہ سے نہیں پہنچی تھی۔ وہ وہاں اس لیے پہنچی تھی کیونکہ اس نے حق کے خلاف ہر ممکن سوال اٹھایا تھا، مگر کوئی

ایسی بنیاد نہیں ملی تھی جس پر اسے سلویٰ کا قاتل قرار دیا جا سکتا۔

نیمل نے بورڈ کے وسط میں لگی سلویٰ کی تصویر کی طرف دیکھا۔تصویر میں سلویٰ کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔اس کی آنکھیں کیمرے کی طرف تھیں، جیسے تصویر کھینچنے والے شخص نے اسے اچانک پکارا ہو اور وہ جواب میں پلٹ کر مسکرا دی ہو۔ وہ صرف ایک عورت تھی جواب زندہ نہیں تھی۔نیمل نے انگلیوں کی پوروں سے تصویر کے کنارے کو چھوا۔وہ خوبصورت تھی۔وہ سلویٰ کو واپس نہیں لا سکتی تھی۔وہ اس کے لیے یہ بھی نہیں جان سکتی تھی کہ اس کی زندگی کے آخری دنوں میں اس کے دل پر کیا گزری تھی، یا وہ کون سی باتیں تھیں جو اس نے اپنے اندر چھپا کر رکھیں۔لیکن کم از کم اب وہ اس کی موت کو کسی ایسے شخص کو قاتل نہیں کہہ سکتی تھی جس کے خلاف جرم ثابت نہیں ہوتا تھا۔

اور اس احساس نے اس کے اندر جمع ہونے والی ایک طویل بے چینی کو توڑ دیا تھا۔
وہ کئی دنوں سے اپنے ساتھ ایک ایسا بوجھ اٹھائے پھر رہی تھی جس کا وزن اسے ہر نئی تفصیل کے ساتھ زیادہ محسوس ہونے لگا تھا۔حق کے بارے میں اس کا شک، سلویٰ کی موت، مسٹر خان کے خدشات، اور ان سب کے درمیان وہ سوال جس کا جواب نہ ملنے تک وہ خود کو کسی دوسرے کام پر پوری طرح مرکوز نہیں کر پا رہی تھی۔اب اس بوجھ میں دراڑ پڑ چکی تھی۔نیمل کو محسوس ہوا جیسے سینے کے اندر کوئی چیز، جو بہت عرصے سے اپنی جگہ جما کر بیٹھی تھی، آخر کار ہٹ گئی ہو۔اس نے گہری سانس لی۔سانس لینا اتنا آسان بھی ہو سکتا ہے، اسے پہلی بار احساس ہوا۔اس کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ماتھے پر پڑی شکنیں آہستہ آہستہ ہموار ہوئیں۔وہ چند لمحوں تک بس وہیں کھڑی رہی، خاموشی سے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذوں کو دیکھتی ہوئی۔اسے کسی فتح کا احساس نہیں ہو رہا تھا، نہ ہی اس کے اندر کسی کے خلاف جیت جانے کی خوشی تھی۔اسے صرف سکون محسوس ہو رہا تھا۔ایسا سکون جس میں اسے کسی کو مجرم ثابت کرنے کی جلدی نہیں تھی۔اس نے بورڈ کے دائیں نچلے کونے میں لگی ایک چھوٹی سی پرچی اتاری۔اس پر اس نے چند دن پہلے لکھا تھا۔

"حق کو شک سے نکالنے کے لیے کافی ہے کہ وہ قاتل نہ ہو۔"

وہ کچھ دیر اس جملے کو دیکھتی رہی، پھر قلم اٹھایا اور اس کے نیچے ایک اور سطر لکھ دی۔

" کسی کو بے گناہ ثابت کرنے کی خواہش، ثبوت سے زیادہ طاقتور نہیں ہونی چاہیے۔"

اس نے قلم بند کیا اور پرچی واپس اپنی جگہ لگا دی۔ پھر وہ میز کی طرف گئی، لیپ ٹاپ پر کھلی فائل محفوظ کی اور تمام دستاویزات کو الگ الگ فولڈرز میں ترتیب دینے لگی۔ اس نے کوئی کاغذ ضائع نہیں کیا۔ ہر چیز اپنی جگہ محفوظ کی، کیونکہ اس کے لیے کسی معاملے کا ایک نتیجے تک پہنچ جانا اس کے ریکارڈ کو مٹا دینے کی وجہ نہیں تھا۔
اس نے آخری بار بورڈ کا جائزہ لیا۔ اب بھی وہاں بہت سے سوال موجود تھے۔ سلویٰ کی زندگی کے تمام پہلو اس کے سامنے نہیں آئے تھے، اور اس کی موت سے جڑے ہر انسانی دکھ کا جواب کسی رپورٹ میں درج نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر اس مخصوص سوال کا جواب اس کے پاس تھا جس نے اسے کئی دنوں سے بے چین کر رکھا تھا۔

"حق بے قصور تھا۔"

نیمل نے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ رات کی ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہوئی تو اسے محسوس ہوا جیسے بند کمرے میں ٹھہری ہوئی گھٹن بھی اس کے ساتھ باہر نکل گئی ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر کے چند لمحے ہوا کو اپنے چہرے سے ٹکرانے دیا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔ یہ مسکراہٹ حق کے لیے نہیں تھی۔ یہ اس اطمینان کے لیے تھی کہ اس نے ایک انسان کو محض اپنے شک کی بنیاد پر مجرم نہیں بنایا تھا۔ اور کئی دنوں بعد، نیمل شبگیر نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ اپنے ہی ذہن کے شور سے آزاد ہو کر سو سکتی ہے۔

☆.....☆.....☆

گیارہ مارچ! رات کے بارہ بجے۔ نامرہ اور تارہ چپکے چپکے نیمل کے کمرے میں آئیں، اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی، تارہ نے مسکراتے ہوئے ایک نرم ریشمی پٹی اس کی آنکھوں پر باندھ دی۔

"بس...اب ایک لفظ نہیں! چپ چاپ ہمارے ساتھ چلیں۔"

"ارے... یہ کیا بچوں والا مذاق ہے؟" نیمل نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا، مگر اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی خوشگوار مسکراہٹ بھی تھی۔ نامرہ اور نوفہ نے دونوں طرف سے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے احتیاط سے سنبھالتے ہوئے مرکزی لاؤنج کی طرف لے آئیں۔ گھر کا پورا ماحول اس وقت خاموشی میں لپٹا ہوا تھا، جس کے پیچھے اپنوں کی محبت کی مہک چھپی تھی۔

"بس اب یہاں رک جائیں... اور اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹا لیں!" نوفہ نے خوشی سے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ نیمل نے ہاتھ بڑھا کر آنکھوں سے پٹی اتاری۔ جیسے ہی اس کی پلکیں جھپکیں اور روشنی اس کی آنکھوں میں پڑی، سامنے بڑی دیوار پر چلتا ہوا پروجیکٹر کا منظر دیکھ کر اس کے قدم وہیں جم گئے۔ سامنے دیوار پر بنی بڑی اسکرین پر سلال موجود تھا۔ یہ وہ ویڈیو تھی جو سلال نے وادیِ لیڈی روانہ ہونے سے ٹھیک پہلے، تارہ، نوفہ اور نامرہ کے ساتھ مل کر محبت سے ریکارڈ کی تھی، تاکہ نیمل کی سالگرہ کے دن اس کی غیر موجودگی کا احساس ذرا بھی کم ہو سکے۔ اسکرین پر سلال کے چہرے پر ایک نہایت نرم اور دل کو چھو لینے والی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

"ہیلو نیمل آپی!" سلال کی آواز لاؤنج کے خاموش ماحول میں گونجی، "مُجھے پختہ یقین ہے کہ جب آپ یہ ویڈیو دیکھ رہی ہوں گی، تو میں اس وقت یہاں سے بہت دور وادیِ لیڈی کے کسی یخ بستہ کیمپ میں بیٹھا ہوں گا۔ لیکن آپ کی سالگرہ کا یہ دن بغیر کسی سرپرائز کے گزر جائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

اسکرین کے دوسری طرف کھڑی تارہ اور نوفہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے فریم میں آئیں اور ہاتھ ہلایا، جبکہ نامرہ کی آنکھوں میں بھی ایک چمک تھی۔ سلال نے ذرا آگے ہو کر سنجیدہ مگر انتہائی مخلص لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"ہم سب جانتے ہیں کہ آپ نے اس گھر کے لیے، ہم سب کی خاطر اپنی ذاتی زندگی، اپنے خوابوں اور اپنے شاندار کیریئر کو کتنی خاموشی سے پسِ پشت ڈالا ہے۔ جب بھی اس گھر پر کوئی مشکل وقت آیا، آپ ہمیشہ ڈھال بن کر سب سے آگے کھڑی رہیں۔ آپ نے ہمیشہ دوسروں کی خوشیوں کو اپنی ذات پر مقدم رکھا... لیکن آج، میں آپ سے ایک التجا کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے لمحے بھر کو توقف کیا۔

"میں دل سے چاہتا ہوں کہ اب آپ اپنی اس زندگی کی طرف واپس لوٹ آئیں جو کہیں پیچھے چھوٹ گئی ہے۔اپنے پیشے، اپنے خوابوں اور اپنے ان تمام ادھورے شوقوں کو دوبارہ سے گلے لگائیں کیونکہ اب ہمیں سنبھالنے کے لیے آپ کو خود کو قربان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اب اپنے لیے جینے کا وقت ہے۔"

وہ مزید کچھ کہہ رہا تھا۔لاؤنج میں کھڑے تمام افراد دم سادھے اسے سن رہے تھے۔

"سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، نیمل آپی! اللہ پاک آپ کو زندگی کی تمام تر خوشیاں، روح کا سکون اور وہ تمام بلندیاں عطا کرے جن کی آپ حقدار ہیں۔آپ ہمیشہ یوں ہی مسکراتی رہیں...ہم سب آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

ویڈیو ختم ہوگئی، اور پروجیکٹر کی ہلکی نیلی روشنی اب مدہم پڑ چکی تھی۔لاؤنج میں پرسکون سکوت چھایا ہوا تھا۔نیمل اپنی جگہ پر بت بنی کھڑی تھی۔اس کی پلکیں اٹھیں تو اسکی آنکھیں نم تھیں۔زہرہ بیگم بہت شدت سے یاد آئیں۔سب نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔ماں کے بغیر سب اچھا ہو کر بھی ادھورا رہتا ہے۔لیکن وہ خوش تھی کہ باقی سب خوش تھے۔شاید خوشی اسی کو کہتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

عصر کے بعد کی دھوپ بادلوں کے پیچھے کہیں دب گئی تھی۔چند گھنٹے پہلے ہونے والی بارش نے شبگیر ہاؤس کے لان میں بچھی گھاس کو دھو دیا تھا۔پتوں پر ٹھہرا پانی ہوا کے ہلکے جھونکوں سے لرزتا تو کہیں کوئی قطرہ ٹوٹ کر نیچے گرتا۔گھر کے اندر، البتہ، شام ابھی کچھ دیر پہلے تک روشن تھی۔کیک کٹ چکا تھا، سالگرہ کی مبارک بادیں دی جا چکی تھیں اور تحائف کے رنگین لفافے لاؤنج کی میز پر بکھرے پڑے تھے۔نیمل آج معمول سے مختلف دکھائی دے رہی تھی۔ہلکے گلابی رنگ کے لباس نے اس کے چہرے کی سنجیدگی میں ایک نرم سا رنگ بھر دیا تھا۔بال نفاست سے بنے ہوئے تھے، چند لٹیں کانوں کے قریب ڈھلک رہی تھیں اور کانوں میں پہنی چھوٹی سی بالیاں اس کے حلیے کو مکمل کر رہی تھیں۔ بعض دن ایسے ہوتے ہیں جب انسان اپنے لیے کچھ نہ بھی کرے، تب بھی دل چاہتا ہے کہ خود کو ذرا بہتر محسوس کرے۔وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو ہاتھ میں تحائف کے

ڈبے تھے۔انہیں میز پر رکھتے ہوئے اس نے ایک ایک کر کے تمام تحائف اپنی جگہ رکھنے شروع کیے۔دادی کی طرف سے ملنے والا خوب صورت سا شال، تارہ کا دیا ہوا کتابوں کا مجموعہ، نامرہ کی پسند سے منتخب کیا گیا نفیس سا پرفیوم اور سرمد صاحب، سقراط اور نجف کا تحفہ۔ اس نے آخری ڈبہ الماری کے اوپری خانے میں رکھا ہی تھا کہ موبائل پر بپ کی ہلکی سی آواز ابھری۔ نیمل نے پلٹ کر فون اٹھایا۔اسکرین پر صرف چند الفاظ تھے۔

Happy Birthday, Bella!

بھیجنے والے کا نام نہیں لکھا تھا مگر وہ جانتی تھی۔کمرے میں سب کچھ اپنی جگہ موجود تھا۔کھڑکی کے پردے ہلکی ہوا سے سرک رہے تھے دیوار پر گھڑی کی سوئیاں اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھیں۔مگر نیمل کے لیے جیسے ایک لمحہ وہیں رک گیا تھا۔اس نے پیغام دوبارہ پڑھا۔پھر بار بار پڑھا۔نیمل کے ہونٹ بھنچ گئے۔آج گیارہ مارچ تھا۔اس کے لیے یہ تاریخ سالگرہ، تحائف اور کیک کے ساتھ جڑی ہوئی تھی،لیکن حق بزدار کے لیے؟ یہ وہی دن تھا جس نے اس کی زندگی سے اپنوں کو چھین لیا تھا۔ایک ہی تاریخ،ایک ہی دن،اور دو بالکل مختلف دنیائیں۔ایک طرف نیمل کے لیے محبت اور اپنائیت کے اظہار کا موقع تھا،دوسری طرف حق کے لیے ایک ایسا زخم جو برسوں گزرنے کے باوجود شاید کبھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا۔اور اس کے باوجود اس نے نیمل کو یاد رکھا تھا۔نیمل کی نگاہ اسکرین پر ٹھہری رہی۔اسے یاد آیا،حق کبھی اس کی سالگرہ بھولتا نہیں تھا۔دس سال میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ان دونوں کے درمیان ایسے فاصلے پیدا ہو چکے تھے جنہیں محض ایک پیغام سے طے نہیں کیا جا سکتا تھا۔کچھ باتیں کہی گئی تھیں، کچھ کبھی کہی ہی نہیں گئیں،اور کچھ فیصلے ایسے تھے جن کے نتائج ان کی زندگیوں سے کہیں آگے تک پھیل گئے تھے۔مگر ہر تعلق کو ختم کرنے کے لیے نفرت کافی نہیں ہوتی۔بعض اوقات رنجشیں بھی اتنی پرانی ہو جاتی ہیں کہ انسان انہیں اپنے ساتھ اٹھائے اٹھائے تھک جاتا ہے۔نیمل نے موبائل کی اسکرین بند کر دی۔وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اسے خیال آیا کہ شاید یہی موقع تھا۔اس نے فون ہاتھ میں مضبوطی سے تھاما اور کمرے سے باہر نکل آئی۔اسکا رخ سرمد صاحب کے کمرے کی طرف تھا۔ آج وہ معمول سے جلدی گھر آ گئے تھے۔

دروازہ نیم وا تھا۔نیمل نے اندر جھانکے بغیر قدم بڑھائے۔سرمد صاحب اپنی میز کے قریب کھڑے کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے۔نیمل نے دروازے پر دستک دینے کی زحمت بھی نہیں کی۔وہ تیزی سے اندر گئی،میز کے کنارے سے چابی اٹھائی اور

پلٹ گئی۔سرمد صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔
"مجھے ذرا کام ہے۔ابھی آتی ہوں۔"

"اس لڑکی کو بھی نہ جانے کیا سوجھتی رہتی ہے۔"انہوں نے زیرِ لب کہا۔لیکن نیمل اس وقت تک گھر کے مرکزی دروازے سے نکل چکی تھی۔بارش کے بعد سڑکوں پر پانی کی باریک تہہ بچی ہوئی تھی۔گاڑی کے ٹائروں کے نیچے سے گزرتا پانی کناروں کی طرف چھلکتا تو سڑک پر بنے زرد بتیوں کے عکس لمحہ بھر کے لیے ٹوٹ جاتے۔آسمان پر سرمئی بادلوں کی تہہ تھی۔نہ بارش ہو رہی تھی، نہ موسم پوری طرح کھلا تھا۔ہوا میں نمی اور سردی گھلی ہوئی تھی۔نیمل نے گاڑی کی رفتار معمول سے کچھ زیادہ رکھی، پھر خود ہی رفتار کم کر دی۔اس کے ذہن میں بار بار وہی پیغام ابھر رہا تھا۔

Happy Birthday, Bella!

کتنی عجیب بات تھی کہ ایک مختصر سا پیغام اسے اس شخص کی طرف لے جا رہا تھا جس سے بات کرنے کا خیال بھی کبھی اسے ناگوار گزرتا تھا۔دس سال پہلے کے مناظر ایک ایک کر کے ذہن میں روشن ہونے لگے۔حق کے ساتھ اس کا تعلق صرف تلخیوں سے نہیں بنا تھا۔ان تلخیوں سے پہلے بھی ایک زمانہ تھا، جب اس کے نام کے ساتھ اتنی رنجشیں وابستہ نہیں تھیں۔شاید اسی لیے آج اس کے پیغام کو نظر انداز کرنا اسے آسان نہیں لگا تھا۔اس نے اگلے موڑ پر گاڑی موڑی۔اب اسے معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔سرمئی رنگ کی اونچی چار دیواری کے پیچھے پھیلا ہوا بری سوسائٹی کا قبرستان خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔گیٹ کے قریب سڑک کنارے درخت کھڑے تھے۔ان کے پتوں پر بارش کے قطرے اب بھی موجود تھے، اور گیٹ کے اندر جاتی راہ کے دونوں طرف گیلی مٹی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔آسمان کی مدھم روشنی میں قبروں کے کتبے دور سے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔باہر ایک گاڑی کھڑی تھی۔نیمل وہ گاڑی پہچان گئی تھی۔نیمل نے اپنی گاڑی کچھ فاصلے پر روک دی۔انجن بند کرنے کے بعد بھی وہ چند لمحے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔سامنے قبرستان کا گیٹ تھا، لیکن اس کے ذہن میں سوالوں کا ایک دروازہ کھل گیا تھا۔

وہ یہاں کیوں آئی تھی؟ کیا کہنے آئی تھی؟ کیا حق اس سے بات کرنا چاہتا بھی تھا؟

اور اگر وہ اس کے سامنے جا کر سب کچھ کہہ دیتی تو کیا دس برس کے فاصلے چند جملوں سے کم ہو سکتے تھے؟ اس نے پیشانی

اسٹیئرنگ پر ٹکا دینے کا سوچا، پھر خود ہی جھنجھلا کر سیدھی ہو بیٹھی۔

"کیا مصیبت ہے، نیمل!" اس نے دھیمی آواز میں خود کو کوسا۔ "تمہیں آنا ہی کیوں تھا؟"

مگر اب وہ واپس بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی تو اس نے اپنے دوپٹے کو کندھے پر درست کیا۔ گیلی سڑک پر قدم رکھتے ہوئے وہ چند لمحے اپنی گاڑی کے ساتھ کھڑی رہی۔ اس نے گہری سانس لی۔ اسکا رخ دوسری جانب تھا۔ جانے وہ کتنی دیر کھڑی رہی کہ عقب سے ایک مانوس آواز ابھری۔

"ہیلو، بیلا!"

وہ ساکت رہ گئی۔ آواز بہت قریب سے آئی تھی۔ نیمل نے پلٹنے میں چند لمحے لگا دیے۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر تیز محسوس ہو رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ سے مڑی۔ حق بزدار اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید پھول تھا۔ سرمئی موسم کی مدھم روشنی میں اس کی نیلی آنکھیں سمندر کی طرح گہری دے رہی تھیں۔ چہرے پر معمول کی سنجیدگی تھی، مگر آج اس سنجیدگی میں ایک تھکن بھی شامل تھی۔ نیمل کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"ہیلو۔" اسے اپنے ہی لہجے کی اجنبیت محسوس ہوئی۔ حق نے پھول اس کی طرف بڑھا دیا۔

"بیپی برتھ ڈے!" نیمل نے جھجکتے ہوئے سفید پھول تھام لیا۔

"تھینک یو۔" بس دو لفظ۔ اور ان دو لفظوں کے درمیان دس برس کی خاموشی کھڑی تھی۔ حق نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی، پھر اس کی گاڑی کی طرف دیکھا۔

نیمل کو یکا یک احساس ہوا کہ اسے اپنی آمد کی کوئی وجہ بتانی چاہیے۔ شاید اس لیے کہ وہ خود بھی اپنے سامنے کھڑی حقیقت سے گھبرا رہی تھی، یا شاید اس لیے کہ حق کے سامنے اپنی موجودگی کو اتفاق کا نام دینا اسے آسان محسوس ہو رہا تھا۔

"میں... میں یہاں سے گزر رہی تھی۔"

حق نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا۔ اس نے صرف سر ہلا دیا۔ نیمل کو اور زیادہ جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ چاہتی تھی کہ حق کچھ پوچھے۔ اسے یقین نہ آئے۔ وہ کہے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے، یا کم از کم یہ

پوچھ لے کہ وہ واقعی یہاں سے گزر رہی تھی تو اس کی گاڑی قبرستان کے سامنے کیوں رکی ہے؟ لیکن حق نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ نیمل نے نظروں کا رخ پھیر لیا۔ دس برس بعد معمول کے انداز میں بات کرنا واقعی مشکل تھا۔ اس کے ذہن میں بہت سے جملے تھے، مگر کوئی بھی زبان تک آتے آتے اپنی شکل کھو دیتا۔ وہ حق سے ڈھیر سارے شکوے شکایتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ حق سے اس کے دکھ کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی، مگر اسے خوف تھا کہ کہیں اس کا سوال کسی ایسے زخم کو نہ چھیڑ دے جسے حق نے بڑی مشکل سے اپنے اندر سمیٹ رکھا ہو۔ بالآخر اس نے وہی پوچھا جو اس وقت سب سے آسان محسوس ہوا۔

"کا...کامل کیسا ہے؟" حق کی نگاہ اس کے چہرے پر واپس آ گئی۔

"پہلے سے بہتر ہے۔" نیمل نے ہلکے سے سر ہلایا۔

پھر خاموشی۔ حق نے اسکے ہاتھ میں سفید گلاب دیکھا اور پھر اسکی گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ جیب میں ڈال لیا، دوسرا اپنے پہلو میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ نیمل اس سے چند قدم دور کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سفید پھول تھا، اور اسے پہلی مرتبہ احساس ہو رہا تھا کہ اس پھول کو تھامے رکھنا بھی ایک طرح کی ذمہ داری ہے۔ حق نے اس کی طرف دیکھا پھر ایک گہری سانس لی۔

"مُجھے یقین تھا تم آؤ گی۔"

نیمل نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تمہیں کیسے یقین تھا؟"

"پتا نہیں۔ بس لگا تھا۔ دل نے کہا تھا۔" حق کے ہونٹوں پر ہلکی سی جنبش ہوئی، مگر وہ پوری مسکراہٹ نہیں تھی۔ نیمل اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے چہرے پر ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ اس کی آمد پر خوش ہے یا نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ اپنے اندر کی بات کو چہرے پر آنے سے روک لینے میں ماہر۔ مگر نیمل اب جانتی تھی کہ کسی کے چہرے سے جذبات کا اندازہ نہ لگا پانا، اس بات کا ثبوت نہیں کہ اس کے اندر کچھ محسوس ہی نہیں ہو رہا۔ نیمل نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پھول کی طرف دیکھا۔

"حق، میں..." الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی اور اسے معلوم نہیں تھا کہ آغاز کہاں سے کرے۔ "مُجھے سلوی کا بہت افسوس ہوا۔"

حق کی آنکھوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، مگر اس کا ہاتھ جیب کے اندر قدرے سخت ہو گیا۔
"مُجھے معلوم نہیں تھا کہ تم دونوں کی طلاق ہو چکی تھی۔" نیمل نے بات جاری رکھی۔ "میں نہیں جانتی تھی کہ تمہارے حالات اتنے خراب ہو گئے تھے۔ مُجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا کسی اور کے ساتھ تعلق تھا۔"

آخری جملہ کہتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس نے ایک ایسی بات چھیڑ دی ہے جسے کہنے سے پہلے اسے حق کے چہرے کی طرف دیکھ لینا چاہیے تھا۔ مگر اب الفاظ واپس نہیں لیے جا سکتے تھے۔ حق نے نگاہ اس سے ہٹا لی۔ اس کے سامنے قبرستان کے اندر درختوں کی قطاریں تھیں۔ بارش کے بعد ان کے گہرے سبز پتے سرمئی آسمان کے نیچے اور بھی گہرے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھتا رہا، جیسے ان کے درمیان کوئی ایسی چیز تلاش کر رہا ہو جسے دیکھنے سے اس کے اندر اٹھنے والی تکلیف کو نام دینا آسان ہو جائے۔ اس کے جبڑے کی ہڈی ابھر آئی۔ چہرے پر پہلی مرتبہ ایک ایسا تاثر نمودار ہوا جسے نیمل نے حق پر بہت کم دیکھا تھا۔ نہ غصہ، نہ تلخی، نہ کسی کو نیچا دکھانے کی خواہش۔ محض ایک گہری، دبی ہوئی اذیت، جسے وہ شاید اتنے عرصے سے اپنے اندر رکھے ہوئے تھا کہ اب اس کے اظہار کا طریقہ بھی بھول چکا تھا۔ نیمل اسے دیکھتی رہی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ حق کے چہرے پر ایسا تاثر دیکھنا اسے اس قدر بے بس کر دے گا۔ حق کی گردن کی گلٹی ابھر کر واپس اپنی جگہ چلی گئی۔ وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر اس نے جیسے اپنے اندر سے الفاظ کھینچ کر باہر نکالے۔

"میں..." اس کی آواز معمول سے دھیمی تھی۔ "میں نے اپنے رشتے کو ایک نیا موقع دیا تھا۔"
نیمل کی انگلیاں پھول کے تنے پر سخت ہو گئیں۔ حق نے درختوں سے نظریں نہیں ہٹائیں۔

"میں اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہمارے درمیان بہت کچھ ٹھیک نہیں رہا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اعتماد پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ لیکن میں نے سوچا تھا کہ شاید... شاید اگر ہم دونوں کوشش کریں تو کچھ بچایا جا سکتا ہے۔" اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔
"میں نے اسے ایک موقع دیا تھا، بیلا۔ صرف اسے نہیں، خود کو بھی۔"
"میں سمجھتی رہی کہ تمہاری فیملی ایک مکمل فیملی ہے۔ تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ تم خوش ہو!" وہ تلخی سے مسکرائی۔ وہ سمجھتی رہی سارے نقصان صرف ان کے ہوئے تھے۔

"میری فیملی اُدھوری تھی۔" وہ فوراً بولا تو نیمل نے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"میں چاہتا تھا کہ جب کامل پانچ سال کا ہو جائے تو..." وہ رکا، جیسے اگلے الفاظ زبان پر لانے سے پہلے خود کو ان کے لیے تیار کر رہا ہو۔ "تو میری ایک بیٹی ہو گی۔"

نیمل کے چہرے پر حیرانی کا تاثر نمایاں تھا۔ حق کی آنکھیں اب بھی درختوں کی قطاروں پر جمی ہوئی تھیں۔ "میں مزید ایک بیٹا نہیں چاہتا تھا۔"

اس نے یہ جملہ اتنی سادگی سے کہا کہ نیمل کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے کئی سوال اٹھے۔ مگر حق نے خود ہی اس کی وضاحت کر دی۔

"میں کوئی دوسرا حق پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔" اس بار اس کی آواز میں تلخی تھی، مگر وہ تلخی کسی دوسرے شخص کے لیے نہیں تھی۔ وہ خود اپنے نام کے ساتھ جڑی ہوئی ایسی حقیقت سے لڑ رہا تھا جسے بدلنے کا اختیار شاید کبھی اس کے پاس تھا ہی نہیں۔

"میں جانتا ہوں کہ میں کیسا ہوں۔ یا کم از کم... لوگوں کو میرے بارے میں جو معلوم ہے، اس کے بعد انہیں یہ سمجھانا فضول ہے کہ میں کیسا ہوں۔"

نیمل کی نگاہ اس کے چہرے پر ٹھہری رہی۔ حق نے ایک گہری سانس لی۔

"لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا بیٹا بھی میری طرح بڑا ہو۔ وہ صرف ضرورت کے تحت پیدا کیا گیا ہو۔ صرف اپنے بڑے بھائی کی حفاظت کے لیے..."

اس نے نیمل کی طرف دیکھا۔ "میں چاہتا تھا کہ کامل کو مجھ سے بہتر زندگی ملے۔"

نیمل کے حلق میں کچھ اٹک گیا۔ حق نے نگاہ واپس پھیر لی۔

"اور مُجھے ایک بیٹی چاہیے تھی۔" اس کے لہجے میں ایک عجیب سی نرمی اتر آئی تھی۔ جیسے اس نے یہ بات اپنے دل میں اتنی مرتبہ دہرائی ہو کہ اب اسے کہتے ہوئے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

"ایک چھوٹی سی بیٹی، جو میرے پاس بھاگتی ہوئی آئے۔" اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، مگر آنکھوں میں اداسی کم نہیں ہوئی۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔

"میری بیٹی مجھ سے وفادار رہتی۔ میری بیٹی مجھ پر اعتبار کرتی۔"

نیمل کے دل میں کچھ چبھا۔ حق نے اس کی طرف دیکھے بغیر بات جاری رکھی۔

"وہ میری دوست ہوتی۔ میں اسے ہر بات بتانے پر مجبور نہ کرتا، لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ جانتی ہو کہ اگر کبھی دنیا میں کوئی بھی اس کی بات سننے کو تیار نہ ہو تو اس کا باپ موجود ہے۔ وہ میرے پاس آسکتی ہے، مجھ سے لڑ سکتی ہے، مجھ پر غصہ کر سکتی ہے۔ مُجھے غلط کہہ سکتی ہے۔"

نیمل کو اپنے چہرے سے تپش نکلتی محسوس ہوئی۔ وہ باتیں جن پر بیلا پوری نہیں اتری تھی حق چاہتا تھا اسکی بیٹی وہ سب سچ کرے۔ وہ ایک خواب تھا۔ وہ اس خواب کی تعبیر چاہتا تھا۔

"اور میں اس کی بات سنتا۔ میں اس کی حفاظت کرتا، لیکن اسے قید نہیں کرتا۔ میں اسے سکھاتا کہ دنیا اچھی بھی ہے اور بری بھی، مگر ہر برائی کا جواب خود برائی بن جانا نہیں ہوتا۔ میں اسے اپنی غلطیوں کے بارے میں بتاتا تاکہ اسے انہیں دہرانا نہ پڑے۔"

اس نے ایک طویل سانس لی۔

"میں چاہتا تھا کہ میرا بیٹا اور میری بیٹی دونوں کو ایک جتنی محبت ملے۔ کامل کو کبھی یہ محسوس نہ ہو کہ اس کی بہن اس کی جگہ لینے آئی ہے، اور میری بیٹی کو کبھی یہ نہ لگے کہ اسے محبت حاصل کرنے کے لیے کامل سے بہتر ہونا ضروری ہے۔ مُجھے ایک آئیڈیل فیملی بنانی تھی۔" اس کی آواز دھیرے دھیرے بھاری ہوتی جا رہی تھی۔

"میری ایک چھوٹی سی دنیا ہوتی، بیلا۔" وہ خاموش ہو گیا۔ پھر بہت دھیمی آواز میں بولا۔

"میری بیٹی کے آنے کے بعد میری دنیا مکمل ہو جاتی..."

نیمل اسے دیکھتی رہی۔ اس کے سامنے وہی حق بزدار کھڑا تھا جس کے بارے میں اس نے برسوں اپنے فیصلے قائم رکھے تھے۔ وہی شخص جس کے رویے نے اسے کبھی خوف زدہ کیا تھا، جس کی باتوں پر اسے یقین نہیں آیا تھا، جس کے اندر موجود تاریکی کو دیکھ کر اس نے کئی بار اس کے اندر کی ہر روشنی سے انکار کر دیا تھا۔

اور آج وہ شخص اس کے سامنے ایک ایسی بیٹی کا خواب بیان کر رہا تھا جو اس پر اعتبار کرتی کیونکہ کسی نے بھی اسکا اعتبار نہیں کیا تھا۔ جو اس سے وفادار رہتی کیونکہ کوئی بھی اس سے وفادار نہیں رہا تھا۔

نیمل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ حق کے اس اعتراف کو کس نام سے یاد رکھے؟ یہ کسی بے گناہ شخص کی صفائی تھی؟ ایک ایسے باپ کی خواہش جو اپنے بیٹے کو اپنی زندگی کی تلخیوں سے بچانا چاہتا تھا؟ یا ایک ایسے آدمی کی خاموش التجا جو جانتا تھا کہ اس کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں پر سوال اٹھانا بجا ہے، مگر وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ لوگ اس کے اندر موجود ہر اچھی خواہش کو جھوٹ نہ سمجھ لیں۔ ہاں شاید یہ سب کچھ تھا۔ سچ تو یہ کہ شاید انسان اتنا سادہ ہوتا ہی نہیں کہ اسے صرف ایک نام دے کر سمجھ لیا جائے۔

"مُجھے واقعی افسوس ہے۔"

حق نے اس کی طرف دیکھا، مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ نیمل نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

"مُجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ میں نے تمہیں کبھی یہ موقع ہی نہیں دیا کہ تم اپنی بات مکمل کر سکو۔ تم اپنی صفائی دے سکو۔"

حق کے چہرے پر کوئی واضح تبدیلی نہیں آئی، لیکن اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے کچھ ابھرا تھا۔ نیمل نے خود کو سنبھالا۔

"میں نے تمہیں پھر غلط سمجھا۔ مُجھے لگا تم نے سلویٰ کو..."

اس کی آواز درمیان میں ٹوٹ گئی۔ وہ لفظ ادا نہیں کر سکی۔ شاید اس لیے کہ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس الزام کی گونج حق کے لیے کتنی دور تک جاتی ہوگی۔ یہ اسکے لیے کتنا کرب زدہ ہوتا ہوگا۔

"تم نے وہ شیر اور لڑکے والی کہانی سنی ہے؟"

نیمل خاموش رہی۔ اس نے سنی تھی مگر وہ حق سے سننا چاہتی تھی۔

"ایک لڑکا تھا۔ وہ جنگل میں جا کر شور مچاتا تھا کہ شیر آ گیا ہے۔ گاؤں والے اسے بچانے کے لیے دوڑتے ہوئے آتے، لیکن وہاں کوئی شیر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان سب کو بے وقوف بنا کر ہنستا تھا۔ اس نے یہ حرکت ایک بار نہیں کی تھی۔ بار بار کی۔ آخر کار انہوں نے اس کی بات پر یقین کرنا چھوڑ دیا۔ پھر ایک دن واقعی شیر آ گیا۔ لڑکا چیختا رہا، مدد کے لیے پکارتا رہا، لیکن اس بار کوئی اسے بچانے نہیں آیا۔"

وہ خاموش ہوگیا۔نیمل کی آنکھوں میں ایک انجانی سی نمی اتر آئی۔

حق نے دھیرے سے کہا،" کوئی اس لڑکے کا بھروسہ کیوں کرے گا جس کی ماں قاتلہ ہو؟"

اس نے نیمل کی طرف دیکھا۔" قاتلہ کا بیٹا قاتل ہی کہلایا جائے گا نا؟"

اور یہی بات نیمل کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

"میں نے تمہیں اپنے بارے میں کوئی اچھی کہانی سنانے کی کوشش نہیں کی، بیلا۔"

"دس سالوں میں تم نے کبھی اپنی صفائی بھی تو پیش نہیں کی۔"نیمل نے دھیرے سے شکوہ کیا۔حق نے اسے دیکھا۔

" کیا تم سن لیتیں؟نہیں۔کیونکہ تم پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھیں۔میرے ہر جواب کو جھوٹ سمجھا جاتا۔" اس نے اپنی نگاہیں نیمل سے ہٹالیں۔

" کبھی کبھی انسان کو اپنے جرم کی سزا نہیں ملتی۔اسے اپنے بارے میں لوگوں کے بنائے ہوئے تصور کی سزا ملتی ہے۔"

نیمل کے اندر ایک ساتھ کئی احساسات اٹھے۔شرمندگی، دکھ، بے بسی اور اپنے آپ پر غصہ۔وہ حق کے سامنے کھڑی تھی، مگر اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دس سال پہلے کے اس شخص کے سامنے کھڑی ہے جس کی بات اس نے کبھی پوری نہیں سنی تھی۔

"افف..."اس نے ضبط سے آنکھیں میچیں۔حق خاموش رہا۔نیمل نے گہری سانس لی، پھر اسے دیکھا۔

"میں نے تمہارے خلاف جو سوچا، وہ صرف سلویٰ کی موت کی وجہ سے نہیں تھا۔میں نے تمہارے ماضی کو بھی دیکھا، تمہارے خاندان کو بھی، اور تم نے جو دس سال پہلے ہمارے ساتھ کیا تھا وہ بھی۔میں نے ہر چیز کو ایک ہی تصویر میں فٹ کرنے کی کوشش کی۔"وہ رکی، پھر اس کی طرف دیکھ کر بولی،"لیکن میں نے یہ نہیں سوچا کہ میری تصویر ہی غلط ہو۔"

حق کی نگاہ اس کے چہرے پر ٹھہر گئی۔

"تمہیں معلوم ہے، نیمل!"اس نے پہلی مرتبہ اسے اس کے نام سے پکارا،"سب سے زیادہ تکلیف کب ہوتی ہے؟"نیمل خاموش رہی۔

"جب کوئی اجنبی تمہیں غلط سمجھتا ہے تو تم اس سے بحث کر سکتے ہو۔اسے اپنی زندگی کے بارے میں بتا سکتے ہو۔اسے کہہ سکتے ہو کہ تمہیں جانتا ہی نہیں۔لیکن جب کوئی ایسا شخص تمہیں غلط سمجھتا ہے جس کے سامنے تم کبھی خود کو سمجھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے..."اس کی آواز دھیمی پڑ گئی،"تو پھر سمجھ نہیں آتا کہ اسے کیا کہو۔"

نیمل کی آنکھوں میں نمی گہری ہوگئی۔ "تم تو میری روح کی کھڑکیوں سے واقف تھیں۔تم نے میرے اندھیرے دیکھے تھے۔ پھر بھی تم نے ہینری کا یقین نہیں کیا۔"

حق نے نگاہ ہٹالی۔نیمل نے اپنے ہاتھ میں پکڑے سفید پھول کی طرف دیکھا۔اسکے گلے میں کچھ اٹک گیا تھا۔وہ بمشکل بولی۔
"تم نے مُجھے آج بھی وش کیا۔"اس نے آہستہ سے کہا۔"جبکہ تم جانتے تھے کہ آج کا دن تمہارے لیے کتنا مشکل ہے۔"
حق نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔"تمہاری سالگرہ ہے۔"

"لیکن تمہارے لیے..."
"میرے لیے بھی گیارہ مارچ ہے۔"اس نے بات مکمل کی۔"اس تاریخ کو میں بدل نہیں سکتا۔نہ اس دن کو بھول سکتا ہوں، نہ جو کچھ ہوا اسے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا میں باقی سب لوگوں کی خوشیاں بھی اسی دن ختم ہو جائیں۔"پھر اس نے نیمل کی طرف دیکھا۔

"تمہاری سالگرہ ہے، بیلا۔تمہیں مبارک باد دینا میرے لیے کوئی احسان نہیں تھا۔"

نیمل نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ کسی شخص کے لیے اپنے غم کو سنبھال کر دوسروں کے لیے جگہ بنانا کتنا مشکل ہوسکتا ہے۔حق نے اسے کوئی بڑا تحفہ نہیں بھیجا تھا، نہ لمبا پیغام لکھا تھا، نہ اپنی تکلیف کا ذکر کیا تھا۔اس نے صرف اسے یاد رکھا تھا۔اور اسی چیز نے نیمل کے اندر کچھ بدل دیا تھا۔حق نے آسمان کی طرف دیکھا۔بادلوں کے پیچھے روشنی مزید مدھم ہوگئی تھی۔ درختوں کی لمبی قطاروں کے نیچے سایے گہرے ہونے لگے تھے۔

" کچھ باتیں دیر سے سمجھ آتی ہیں، بیلا!"نیمل اس کی طرف دیکھتی رہی۔اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ حق بزدار کو سمجھنے کے لیے اسے اس کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔اسے صرف یہ تسلیم کرنا تھا کہ اس کے اندر ایسی خواہشیں بھی تھیں جنہیں وہ خود بھی پوری نہیں کرسکا تھا، ایسے زخم بھی تھے جنہیں وہ کسی کو دکھانا نہیں چاہتا تھا، اور ایسی غلطیاں بھی جن کی

ذمہ داری سے وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔مگران سب کے باوجود اس کا ہر سچ جھوٹ نہیں ہو جاتا تھا۔ ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا ان دونوں کے درمیان سے گزرا۔حق نے بونٹ سے ٹیک ہٹائی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں گھر جانا چاہیے۔موسم پھر خراب ہونے والا ہے۔"

نیمل نے اس کی طرف دیکھا۔وہ اسے روکنا چاہتی تھی، کچھ اور کہنا چاہتی تھی، شاید یہ بھی کہ وہ آج یہاں سے پہلے جیسی نہیں لوٹ رہی تھی۔مگر اس نے صرف اتنا کہا۔"اور تم؟"

"میں تھوڑی دیر تک چلا جاؤں گا۔"

نیمل سمجھ گئی کہ وہ ابھی جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔اس نے سر ہلایا، مگر قدم فوراً نہیں اٹھائے۔حق نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھ میں موجود پھول کی طرف۔

"سالگرہ مبارک ہو!"

اس بار نیمل کے لبوں پر مسکراہٹ پہلے سے کچھ مختلف تھی۔وہ مسکراہٹ خوشی کی نہیں تھی، نہ ہی اس میں ماضی کے لوٹ آنے کا کوئی فریب تھا۔اس میں صرف ایک اعتراف تھا کہ کچھ رشتے ٹوٹنے کے بعد بھی اپنے اندر ایک ایسا حصہ محفوظ رکھتے ہیں جسے نفرت پوری طرح ختم نہیں کر سکتی۔

"شکریہ ہینری!"اس نے یہ کہتے ہوئے پہلی بار حق کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھا۔اس بار وہ مسکرا دیا۔

"یہ ہینری سننے کے لیے دس سال انتظار کیا ہے۔"نیمل بھی ہنس دی۔

دس برس بعد، وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔نہ دوست، نہ دشمن، نہ ماضی میں واپس لوٹنے کے قابل اجنبی۔ماضی کے ہینری اور بیلا، حال کے حق اور نیمل...اور مستقل کے؟

☆.....☆.....☆

وادی لیڈی میں شام اترنے سے پہلے ہی موسم کا رنگ بدل گیا تھا۔پہاڑوں کے پیچھے جمع ہوتے بادلوں نے آسمان کو دھندلا سرمئی کر دیا تھا، اور ہوا میں ایسی خنکی گھل گئی تھی جو خیموں کی موٹی دیواروں سے گزر کر بھی جسم تک پہنچ جاتی تھی۔دور پہاڑی

ڈھلوانوں پر دھند کی باریک تہہ پھیل رہی تھی۔ کہیں کسی مریض کے کھانسنے کی آواز سنائی دیتی، کہیں طبی عملے کے قدموں کی جلدی، اور کہیں جنریٹر کی مسلسل گونج خاموشی کو چیرتی ہوئی کانوں تک پہنچتی۔ وبا کی شدت میں کمی ضرور آئی تھی، لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ چند مریضوں کی حالت بہتر ہوئی تھی، کچھ اب بھی نگرانی میں تھے، اور بیماری کی اصل وجہ جاننے کے لیے نمونے جمع کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کا کام جاری تھا۔ اسی سلسلے میں ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا تھا۔

بڑے طبی خیمے کے اندر پوری ٹیم جمع تھی۔ سامنے ایک عارضی اسٹیج کے طور پر لکڑی کا بلند تختہ رکھا گیا تھا۔ اس کے پیچھے سفید چادر پر علاقے کا نقشہ، مریضوں کی تعداد اور مختلف مقامات سے جمع کیے گئے نمونوں کی ابتدائی تفصیلات درج تھیں۔ ایک طرف محققین اپنی فائلوں کے ساتھ بیٹھے تھے، دوسری طرف ڈاکٹر اور نرسنگ اسٹاف موجود تھا۔ کچھ لوگوں کے چہروں پر تھکن نمایاں تھی، کچھ مسلسل نوٹس لے رہے تھے، اور چند افراد بار بار اپنے موبائل فون کی اسکرین دیکھ رہے تھے۔ رضا کاروں کو آخری قطاروں میں جگہ ملی تھی۔ سلال انہی میں بیٹھا تھا۔ سفید کوٹ کی آستینیں کلائیوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ سامنے کھڑے شخص کی بات توجہ سے سن رہا تھا۔ سامنے موجود شخص اب نمونوں کی ترسیل کے طریقہ کار پر بات کر رہا تھا کہ اچانک کسی نے سلال کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ سلال نے معمول کے مطابق پلٹ کر دیکھا۔ وہ عالیہ تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی گھبراہٹ تھی کہ سلال کے ماتھے پر فوراً بل پڑ گئے۔ اسکی سانس بے ترتیب تھی اور آنکھیں اس طرح پھیلی ہوئی تھیں جیسے وہ کوئی ایسی چیز دیکھ آئی ہو جسے ابھی تک سمجھ نہیں پائی۔

"کیا ہوا؟" سلال نے فوراً پوچھا۔ "سب ٹھیک ہے؟"

عالیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ زونی..." اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ وہ تیزی سے کیمپ سے باہر نکلی۔ یہاں بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ سلال اپنی جگہ سے اٹھا اور اسکے پیچھے باہر آیا۔

"کیا ہوا زونیرہ کو؟"

"مُجھے نہیں پتا۔ اس کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ وہ ڈسپنسری میں ہے۔ پلیز، تم میرے ساتھ چلو۔"

سلال نے کیمپ کی طرف دیکھا۔ اجلاس ابھی جاری تھا، لیکن عالیہ کی حالت دیکھ کر اسے مزید سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

"ٹھہرو، میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

"میں ڈاکٹر سے بات کر چکی ہوں۔" اس نے اس کی بات کاٹ دی۔ "انہوں نے کہا ہے وہ پندرہ منٹ میں آ جائیں گے۔ لیکن زونی اکیلی ہے، سلال۔ مُجھے سمجھ نہیں آ رہا میں کیا کروں۔ وہ ٹھیک سے بات بھی نہیں کر رہی تھی۔"

اس کی آواز لرز گئی۔ سلال کے چہرے سے آخری تردد بھی غائب ہو گیا۔

"ٹھیک ہے چلو..."

عالیہ اس کے آگے تھی۔ دونوں خیمے کے پچھلے حصے کی طرف سے آگے بڑھے جہاں عارضی راستہ ڈسپنسری کی طرف جاتا تھا۔ سلال نے جاتے ہوئے کسی کو آواز دے کر صورتِ حال بتانے کا سوچا، مگر عالیہ اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی کہ اسے اس کے ساتھ قدم ملانے پڑے اور اس پاس کوئی نظر بھی نہیں آیا۔ وہ دونوں کیچڑ سے بچتے ہوئے پتھریلے راستے پر تیزی سے چلنے لگے۔

"اسے کب سے طبیعت خراب محسوس ہو رہی تھی؟" سلال نے پوچھا۔

"مُجھے ابھی پتا چلا ہے۔"

"بخار ہے؟ چکر آ رہے تھے؟ سانس میں کوئی مسئلہ؟" عالیہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"میں نے زیادہ کچھ نہیں پوچھا۔ وہ بہت عجیب حالت میں تھی۔ بس تمہیں بلانے کا خیال آیا۔"

سلال نے قدم اور تیز کر دیے۔ "اگلی بار ایسی صورتِ حال ہو تو پہلے ڈیوٹی ڈاکٹر کو اطلاع دینا، چاہے وہ دور ہی کیوں نہ ہو۔"

"مُجھے معلوم ہے اور میں انہیں اطلاع کر چکی ہوں۔" اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ سلال نے مزید کچھ نہیں کہا۔ چند منٹ بعد ڈسپنسری کی عمارت سامنے آ گئی۔ داخلی دروازے کے اوپر لگا بلب مدھم روشنی میں بھی جل رہا تھا۔ عالیہ سیدھا اندرونی راہداری کی طرف بڑھی۔

"وہ اس کمرے میں ہے۔"

سلال اس کے پیچھے چل پڑا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ عالیہ نے دستک دیے بغیر اسے کھولا اور ایک طرف ہوگئی۔ سلال اندر داخل ہوا۔ کمرے میں بلب کی مٹیالی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی میز تھی، جس پر استعمال شدہ دستانوں کا ڈبہ، چند پٹیاں اور پانی کی بوتل رکھی تھی۔ ایک طرف دھاتی اسٹینڈ پر ڈرپ کی خالی بوتل لٹک رہی تھی۔ کمرے میں جراثیم کش محلول کی تیز بو تھی۔ بستر پر زونیرہ نیم دراز تھی۔ اس کے جسم پر ہلکی سی چادر تھی اور چہرہ غیر معمولی طور پر زرد دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بال پیشانی سے چپکے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں، مگر دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے پلکیں اٹھائیں۔

"زونیرہ؟" سلال تیزی سے اس کے قریب پہنچا۔ "کیا ہوا ہے تمہیں؟ کیسا محسوس ہو رہا ہے؟"
زونیرہ نے جواب دینے کی کوشش کی، لیکن اس کے لبوں سے صرف ایک کمزور سی آواز نکلی۔ سلال نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے رکھتے ہوئے کہا۔
"گھبراؤ نہیں۔ میں دیکھتا ہوں۔"
اس نے احتیاط سے اس کی کلائی پکڑی اور نبض محسوس کرنے لگا۔ اس کی انگلیاں کلائی کی شریان پر ٹھہری رہیں۔ چند لمحے گزرے تو اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، پھر دوبارہ نبض پر توجہ دی۔

"دل کی دھڑکن کچھ تیز ہے۔ لیکن صرف اس سے کچھ طے نہیں کیا جا سکتا۔ بخار بھی چیک کرنا ہوگا۔"
اس نے کمرے میں موجود تھرمامیٹر تلاش کرنے کے لیے میز کی طرف دیکھا۔

"عالیہ، تم ذرا..." وہ پلٹا اور اور ٹھہر گیا۔ عالیہ دروازے کے عین درمیان کھڑی تھی۔
اس کا ایک ہاتھ دروازے کے کنارے پر تھا۔ چہرے پر اب گھبراہٹ کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک ایسی سرد کیفیت نے لے لی تھی جسے دیکھ کر سلال کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہوئی۔

"عالیہ؟" سلال نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ عالیہ کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔
وہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر آہستہ آہستہ پھیلی، جیسے وہ کسی ایسے لمحے کا انتظار کر رہی تھی جس کے آنے کا یقین اسے پہلے سے تھا۔ سلال کی نگاہ اس کے چہرے سے ہٹ کر دروازے پر گئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور عالیہ نے دروازہ بند کر دیا۔ ٹھک!

دروازے کی آواز کمرے میں غیر معمولی طور پر بلند محسوس ہوئی۔ اگلے ہی لمحے باہر سے کنڈی چڑھنے کی آواز سنائی دی۔

"عالیہ!" وہ لپک کر دروازے تک پہنچا۔ اس نے دستہ گھمایا، مگر دروازہ نہ کھلا۔ اس نے زور سے دھکا دیا۔ دروازہ اپنی جگہ جما رہا۔

"عالیہ، دروازہ کھولو!" باہر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ دستہ کھینچا، پھر مٹھی سے دروازہ بجایا۔

"عالیہ! یہ کیا کر رہی ہو تم؟" اس کی آواز میں اب حیرت سے زیادہ بے چینی تھی۔ اس نے ایک بار پھر دروازے کو دھکا دیا، لیکن باہر سے لگی کنڈی نے اسے بند کر رکھا تھا۔

"عالیہ!" وہ ابھی دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا کہ پیچھے سے ایک دبی ہوئی سسکی سنائی دی۔ سلال کی گردن آہستہ سے مڑی۔ زونیرہ اب بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کی چادر سرک کر نیچے گر چکی تھی۔ اور اس کے کپڑے... سلال کی نگاہ جم گئی۔

زونیرہ کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کا دوپٹہ فرش پر پڑا تھا، قمیص کے کئی حصے ادھڑے ہوئے تھے اور اس کے بال بکھر کر چہرے پر آ گئے تھے۔ وہ اپنے لباس کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن اس کے چہرے پر اب وہ بے بسی نہیں تھی جو سلال نے کمرے میں داخل ہوتے وقت دیکھی تھی۔

سلال کے حلق سے آواز تک نہیں نکلی۔ اس نے ایک قدم پیچھے لیا۔

"یہ..." اس کی زبان لڑکھڑائی۔ "یہ کیا ہے؟"

زونیرہ نے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"مُجھے معاف کر دینا، سلال۔"

اس ایک جملے نے سلال کے اندر اٹھتے سوالوں کو اور بے ترتیب کر دیا۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟ زونیرہ، تمہارے کپڑے..."

"ہیلپ..." زونیرہ اچانک چلائی۔

"پلیز! کوئی ہے؟ مُجھے بچاؤ!"

سلال کے جسم میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ "زونیرہ، خاموش ہو جاؤ۔"

وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا، لیکن اس کا مقصد اسے روکنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ کے

سامنے رکھنے کی کوشش کی تا کہ وہ ایک لمحہ رک کر اسے سن لے۔زونیرہ نے فوراً اس کی کلائی پکڑ لی۔

"چھوڑو مُجھے !" وہ چیخی۔"مُجھے ہاتھ مت لگاؤ!" سلال نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

"میں نے تمہیں کچھ نہیں کیا۔"

مگر زونیرہ نے اس کی بات نہیں سنی۔وہ اس کے قریب آ گئی اور اس کا ہاتھ دوبارہ پکڑ کر اپنے جسم کی طرف کھینچنے لگی۔سلال جیسے پتھر کا ہو گیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم ؟"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔زونیرہ کی گرفت غیر متوقع طور پر مضبوط تھی۔وہ اس کے ہاتھ کو اپنے لباس کے قریب لے جانے پر اصرار کر رہی تھی،اور سلال پوری قوت سے خود کو پیچھے کھینچ رہا تھا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ..."اس کی آواز بلند ہو گئی۔زونیرہ نے جواب میں ایک بار پھر زور سے چلائی۔

"بچاؤ! کوئی مُجھے بچاؤ!"

"خدا کے لیے،زونیرہ!" سلال نے اپنا ہاتھ پوری قوت سے چھڑایا اور پیچھے ہٹ گیا۔اسکا وجود لرز اٹھا۔اس کے قدم میز کے کونے سے ٹکرائے تو چند چیزیں فرش پر گر پڑیں۔تھرمامیٹر لڑھکتا ہوا دیوار کے ساتھ جا لگا۔اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔

"عالیہ!" وہ پوری قوت سے چلایا۔"دروازہ کھولو! یہ کیا کر رہی ہو تم ؟"

باہر سے خاموشی تھی۔پیچھے سے زونیرہ کے رونے کی آواز آئی۔سلال پلٹا تو وہ اسکے قریب آنے کی کوشش کر رہی تھی۔اس کے کپڑے پہلے سے زیادہ بکھرے ہوئے تھے۔اس نے ہاتھ بڑھا کر سلال کے سفید کوٹ کا دامن پکڑ لیا۔

"مُجھے چھوڑ دو!" سلال نے اسے خود سے دور کرنے کی کوشش کی۔"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

زونیرہ نے اس کا کوٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔وہ اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے پیچھے ہٹا۔کوٹ کا ایک بٹن ٹوٹ کر فرش پر جا گرا۔زونیرہ نے کپڑا مزید زور سے کھینچا تو سلال نے کوٹ اتار دیا۔آخر کار کوٹ اس کے ہاتھ میں رہ گیا اور سلال اس

سے الگ ہو گیا۔ وہ کوٹ فرش پر پھینک کر دروازے کی طرف بھاگا۔

" کھولو یہ دروازہ...کوئی ہے؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ بجایا۔ لکڑی کے پٹوں سے اٹھنے والی آواز چھوٹے کمرے میں گونجنے لگی۔

" کوئی ہے؟ دروازہ کھولو!"

پیچھے قدموں کی آواز آئی۔ سلال نے پلٹ کر دیکھا۔ زونیرہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آنسو تھے، مگر اس کی آنکھوں میں ایک ایسی ضد تھی جسے سلال سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکنے کی کوشش کی تو زونیرہ نے اس کی شرٹ پکڑ لی۔ سلال فوراً پیچھے ہٹا۔

"مُجھے ہاتھ مت لگاؤ!"

اس نے زنیرہ کی گرفت کھولنے کی کوشش کی، لیکن زونیرہ کے ناخن اس کے کپڑے میں اٹک گئے تھے۔ وہ جتنا خود کو پیچھے کھینچتا، کپڑا اتنا ہی تن جاتا۔ اگلے ہی لمحے اسے اپنی پشت پر کپڑے کے ادھڑنے کی آواز سنائی دی۔ شرٹ پیچھے سے پھٹ گئی۔ سلال کا سانس رک گیا۔ اس نے بے یقینی سے اپنے کندھے کے پیچھے ہاتھ لے جانا چاہا، مگر زونیرہ نے اب بھی کپڑا پکڑ رکھا تھا۔ اس کے لمبے ناخن سلال کی گردن کے قریب جلد میں چبھ گئے تھے۔ اس کی گردن پر ناخنوں کی جلن تھی اور پشت پر شرٹ پھٹی ہوئی تھی۔

"پلیز، زونیرہ..." اس کی آواز بھرا گئی۔ "ایسا مت کرو۔ خدا کے لیے، ایسا مت کرو۔"

اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔ وہ اسے سمجھانا چاہتا تھا۔ پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہے، اسے کس نے ایسا کرنے کے لیے کہا ہے، وہ کیوں اس کے ساتھ یہ سب کر رہی ہے۔ مگر ہر سوال کے جواب میں زونیرہ کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔

"بچاؤ...." وہ دوبارہ چلائی۔

سلال کے کانوں میں جیسے شور بھر گیا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا، پھر زونیرہ کی طرف، پھر اپنے ہاتھوں کو۔ اس کے ذہن میں کوئی بات ترتیب نہیں پا رہی تھی۔ وہ ایک ایسی صورتِ حال میں پھنسا ہوا تھا جس کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

"میں نے تمہیں کچھ نہیں کیا۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ "تم جانتی ہو میں نے تمہیں کچھ نہیں کیا۔"
زونیرہ نے جواب میں اس کی شرٹ کا باقی حصہ پکڑنے کی کوشش کی۔ سلال نے خود کو ایک طرف کر لیا۔ اس بار وہ اس سے دور بھاگا، مگر کمرہ اتنا چھوٹا تھا کہ چند قدموں میں ہی دیوار آ جاتی۔ اس نے دروازے تک پہنچ کر ایک بار پھر دستہ کھینچا لیکن دروازہ بند تھا۔ وہ مڑ کر زونیرہ کو دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ سانس سینے میں اٹک رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے کمرے کی ہوا کم پڑ گئی ہو۔ بلب کی مٹیالی روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی۔ اس نے پلکیں جھپکیں، مگر سامنے کا منظر دھندلا رہا تھا۔

"پلیز..." اس کے حلق سے بمشکل آواز نکلی۔ "زونیرہ، ایسا مت کرو۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ سلال جو چند لمحے پہلے اسے نبض چیک کر کے تسلی دے رہا تھا، اب خود اپنے وجود کو بچانے کے لیے دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ اس کے لیے ہر گزرتا لمحہ ایک نئی مصیبت بن رہا تھا۔ زونیرہ اچانک پھر اس کی طرف لپکی۔
اس کے ہاتھ میں سلال کی شرٹ کا پھٹا ہوا حصہ تھا۔ اس نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو سلال نے ایک زوردار تھپڑ اسکے منہ پر جڑ دیا۔ چٹاخ کی آواز گونجی اور زنیرہ پل بھر کو ساکت ہوئی۔ پھر جیسے اسکا دماغ گھوم گیا۔ وہ غرائی۔

"ہوش میں آؤ زنیرہ!"

اس کی آواز اس بار اتنی بلند تھی کہ وہ خود بھی چونک گیا۔ اس کے گلے میں کچھ اٹک گیا۔ اس نے نگلنے کی کوشش کی، مگر حلق خشک تھا۔ وہ اپنی سانسوں کو قابو میں لانے کی کوشش کر رہا تھا جب دروازے کے باہر اچانک قدموں کی آواز سنائی دی۔ کئی لوگوں کی آوازیں۔

"دروازہ بند کیوں ہے؟" پھر کسی نے کنڈی کو جھنجھوڑا۔ سلال کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے امید چمکی۔
"یہاں! میں اندر ہوں!" وہ دروازے کی جانب لپکا۔ باہر سے عالیہ کی آواز ابھری۔
"سر، میں نے سلال کو زونیرہ کے ساتھ بدتمیزی کرتے دیکھا تھا۔ میں نے اسے روکنے کے لیے دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ وہ

بھاگ نہ سکے۔"

سلال کے اندر جیسے کسی نے برف انڈیل دی۔اس نے دروازے کی طرف دیکھا نہیں۔یہ نہیں ہوسکتا تھا۔اس نے عالیہ کو ابھی کچھ دیر پہلے اجلاس میں اپنے کندھے پر ہاتھ رکھتے دیکھا تھا۔اس کی گھبراہٹ،اس کی لرزتی آواز،اس کی درخواست۔وہ اسے یہاں لائی تھی۔وہ اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔اور اب وہ باہر کھڑی اسے مجرم قرار دے رہی تھی۔باہر سے کسی مرد کی آواز آئی۔

"کنڈی کھولو...جلدی۔"

اگلے ہی لمحے دھاتی کنڈی کھلنے کی آواز گونجی۔ل دروازہ کھلا تو باہر کی روشنی کمرے میں داخل ہوئی۔سامنے دو پروفیسر کھڑے تھے۔ان کے ساتھ دو ڈاکٹر بھی تھے،جن میں سے ایک کے گلے میں اسٹیتھو سکوپ لٹک رہا تھا۔عالیہ ان کے پیچھے کھڑی تھی۔اس کے چہرے پر اب بھی وہی سردی تھی۔سلال دروازے کے قریب کھڑا تھا۔اس کی شرٹ پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی،گردن پر سرخ خراشیں تھیں اور سفید کوٹ فرش پر پڑا تھا۔اس کے بال بکھر گئے تھے۔آنکھیں نم تھیں،سانس بے ترتیب تھی اور ہاتھ اب بھی اپنے سامنے اٹھے ہوئے تھے،جیسے وہ کسی کو اپنے قریب آنے سے روک رہا ہو۔زونیرہ بستر کے قریب فرش پر گری ہوئی تھی۔اس کے کپڑے بکھرے ہوئے تھے،دوپٹہ ایک طرف پڑا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا لباس سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے رو رہی تھی۔ایک ڈاکٹر فوراً اس کی طرف بڑھا۔

"زونیرہ؟ کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو؟"

دوسرے نے سلال کی طرف دیکھا۔"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

سلال نے منہ کھولا لیکن آواز نہ نکلی۔اس نے ایک بار عالیہ کو دیکھا،پھر دونوں پروفیسروں کو۔

"سر...میں..."اس کے لب خشک تھے۔اس نے زبان پھیر کر انہیں تر کیا،مگر حلق میں اٹکی ہوئی گھبراہٹ نے الفاظ کو باہر آنے سے روک دیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔"اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا،سر۔عالیہ مُجھے یہاں لے کر آئی تھی۔اس نے کہا تھا زونیرہ کی طبیعت خراب ہے۔میں اسے دیکھنے آیا

تھا۔ میں نے صرف اس کی نبض چیک کی تھی۔ پھر..." اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ "پھر مجھے سمجھ نہیں آیا یہ کیا ہو رہا ہے۔"

عالیہ نے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی، ایسی مسکراہٹ جسے وہ اپنے سپاٹ چہرے کے پیچھے چھپائے ہوئے تھی۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ زونیرہ کے ساتھ بدتمیزی کر رہا تھا۔ اسی لیے میں نے دروازہ بند کیا۔"

سلال نے اسے ایسے دیکھا جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ "تم جھوٹ بول رہی ہو۔" اس کے منہ سے یہ الفاظ بہت دھیمی آواز میں نکلے۔ عالیہ کی بھنویں اٹھیں۔ سلال نے ایک قدم اس کی طرف بڑھنا چاہا، لیکن سامنے کھڑے پروفیسر نے آگے بڑھ کر ایک زوردار طمانچہ سلال نے منہ پر رسید کیا۔

"شیم آن یو سلال!"

سلال وہیں جم گیا۔ اس نے پروفیسر کو دیکھا۔ پھر عالیہ کو۔ اس کے چہرے پر صدمہ ابھرا۔

"سر، خدا کے لیے، میری بات سنیں۔ میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ خود..." اس کی نظر زونیرہ کی طرف گئی، جو ڈاکٹر کے سوالوں کے جواب میں سسکیاں لے رہی تھی۔ عالیہ نے آگے بڑھ کر اسکے جسم پر اپنا کوٹ ڈالا۔ سلال کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے بارے میں کیا کہے، کس طرح بتائے کہ ابھی چند منٹ پہلے یہی لڑکی اس کا ہاتھ زبردستی اپنی طرف کھینچ رہی تھی، اس کی شرٹ پھاڑ رہی تھی، اور وہ خود کو اس سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ عالیہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شاید اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ شاید اسے یاد دلانا چاہتا تھا کہ اس نے کبھی اس کے ساتھ کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے وہ اس کی عزت کو نقصان پہنچانے کا سوچتی۔ شاید وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر کس لمحے عالیہ نے اسے اپنا دشمن سمجھ لیا تھا؟ لیکن اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ عالیہ نے اس کی نگاہ کا جواب ایک بے تاثر چہرے سے دیا۔ اس کے اندر کیا تھا، سلال نہیں جان سکتا تھا۔ وہ صرف اتنا دیکھ سکتا تھا کہ وہ اس کے خلاف کھڑی تھی۔

اس رات، سلال کو پہلی بار احساس ہوا کہ بعض الزامات کے لیے کسی واقعے کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایک بند دروازہ، چند پھٹے ہوئے کپڑے، کسی کی چیخیں اور ایک ایسا چہرہ جو اپنے دکھ کو سچ کی طرح پیش کر سکے۔ یہ سب مل کر اس شخص کے خلاف

ایک ایسی کہانی بنا دیتے ہیں جسے رد کرنے کے لیے اس کے پاس صرف اپنی زبان رہ جاتی ہے۔اور جب سننے والوں کے ذہن میں فیصلہ پہلے ہی لکھا جا چکا ہو تو سچ بولنے والا بھی اپنی ہی آواز سے اجنبی ہونے لگتا ہے۔اسکے آنکھوں کے سامنے سقراط چہرہ لہرایا اور اسکی پوری زندگی اور پھر اسے اپنی زندگی اندھیر ہوتی محسوس ہوئی۔اسکا سر چکرا گیا۔اسے اپنی جان ٹانگوں سے نکلتی محسوس ہوئی۔پروفیسر اب اسے گریبان سے گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔سلال کی کرب زدہ آنکھیں، عالیہ پر جمی تھیں۔ان آنکھوں میں بہت کچھ تھا مگر عالیہ کی آنکھوں میں صرف فتح کی چمک تھی۔

اسے میرے خلاف ایک ثبوت چاہیے تھا،
مگر میرے پاس ایسا کوئی عمل نہ تھا جسے وہ جرم کہہ سکتا۔
پھر اس نے میرے کردار کو تخت پر رکھا۔

☆.....☆.....☆

جاری ھے۔

